اقبالِ پُراسرار
زید حامد

اقبالِ پُراسرار

زید حامد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نام کتاب : اقبال پراسرار

مصنف : سید زید زمان حامد

ناشر : براس ٹیکس، راولپنڈی

تقلیبِ حروف : براس ٹیکس ٹیم

مجلس ادارت : سمیع اللہ بخاری، سیدہ قدسیہ مشہدی، فاطمہ حسین، سفیان مسعود

کتابت و آرائش : وقار احمد صدیقی

تاریخ اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۴ء

قیمت : ایک ہزار روپے

راولپنڈی، پاکستان

فون: +92-51-5598046-7

ویب سائٹ: www.zaidhamid.pk

ای میل: syedzaidzamanhamid@gmail.com

سیدی و مرشدی رسول اللہ ﷺ

کی خدمت اقدس میں

ہدیۂ عشق و ادب

علامہ اقبالؒ کے بارے میں دیگر شخصیات کے تاثرات

''اقبالؒ نے آپکے سامنے ایک واضح اور صحیح راستہ رکھ دیا ہے جس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ وہ دورِ حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر حاصل ہے کہ آپ کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع مل چکا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔''

(ہفت روزہ حمایتِ اسلام، لاہور، ۶ مارچ، ۱۹۴۱ء)

''یہ اپنے دور کا آدمی ہے۔ اپنے دور سے آگے کا آدمی ہے۔ اور یہ وہ آدمی ہے جو اپنے دور سے حالت جنگ میں ہے۔''

(سر تھامس آرنلڈ، برطانیہ)

''ڈاکٹر اقبالؒ اپنی وفات سے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر گئے ہیں، جس کا گھاؤ مدت مدید میں مندمل نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کا رتبہ آج دنیا میں اتنا کم پایہ ہے کہ ہم کسی حالت میں ایسے شاعر کی کمی برداشت نہیں کر سکتے، جن کے کلام نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہو۔''

(رابندر ناتھ ٹیگور، بھارت)

''عصر حاضر خاصہء اقبال گشت''

(ہمارا دور اقبال کے نام ہی منسوب ہے)

محمد تقی بہار (ملک الشعراء ایران)

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں اک غزل خواں گزر گیا
(فیض احمد فیض)

اگر جلال الدین رومی اس زمانے میں جی اٹھیں تو وہ محمد اقبال ہی ہوں گے۔ ساتویں صدی کے جلال اور چودھویں صدی کے اقبال کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔
(ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، مصر)

شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مرحوم ایک خوش اوقات صوفی تھے اور ان کے ہاں آنے والے دوستوں کا مذاق بھی یہی تھا اور اسی ماحول میں اقبال کی پرورش ہوئی۔
(سید سلیمان ندوی)

علامہ اقبال کا شمار بیسویں صدی کے عظیم ترین شعراء اور مفکرین میں کیا جاتا ہے۔ ان کی حیات ہی میں انہیں شاعر مشرق کہا جانے لگا۔
(نکولائی گلیبوف، روس)

در دیدۂ معنی نگہباں حضرت اقبال
پیمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

(جو صاحب نگاہ ہیں ان کے نزدیک اقبال پیغمبر تو نہیں تھے، مگر کام انہوں نے پیغمبروں والا ہی کیا)

(غلام قادر گرامی، ہندوستانی شاعر)

فہرست

پیش لفظ

محترم زید حامد کی زیرِنظر تصنیف پاکستانی ذرائع ابلاغ پر پیش کیے جانیوالے پروگرام ''اقبال پر اسرار'' کی تحریری شکل ہے۔ جناب زید حامد ایک ممتاز دفاعی تجزیہ نگار اور مبصر ہیں۔ وہ دفاعی حکمت عملی سے متعلق معاملات میں وسیع تر تجربہ رکھتے ہیں۔ ریاستی اور غیر ریاستی دہشت گردی، قومی سلامتی، دہشت گردی کے خلاف قابل عمل اقدامات، غیر روایتی جنگ، بغاوتیں اور ان کا سدباب نفسیاتی اور معلوماتی جنگ، مذہبی اور فرقہ وارانہ تشدد سے نمٹنے سے متعلق امور میں بھی انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

اس کتاب کی ترتیب وتبویب کچھ یوں کی گئی ہے۔ پہلے تین ابواب میں اقبالؒ جس دور میں آئے، اس کے سیاسی، سماجی، اقتصادی وجغرافیائی حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پھر امت مسلمہ کے تین ادوار (عروج، استحکام اور زوال) کے حوالے سے اقبالؒ کے دور کی شناخت کی گئی ہے۔ اقبالؒ کے اتحاد بین المسلمین کے خواب اور اسکے لیے ان کی پیش کی گئی حکمت عملی بیان کی گئی ہے۔ اس خواب کے لیے امت کو بیدار اور متحرک کرنے والے اقبالؒ کی تربیت کے حوالے سے، فطرت کی طرف سے، ہر طرح کی مدد اور موافقت کے ذریعے بتایا گیا ہے'' کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی''۔

چوتھا باب اقبالؒ کے ذاتی کردار کے حوالے سے مختص کیا گیا ہے کہ جس میں ان کی ذاتی زندگی کے حوالہ جات سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وہ امت کے افراد میں جو کردار دیکھنا چاہتے تھے، اس کا وہ خود ایک مثالی نمونہ تھے۔ پانچویں باب میں نظمِ حکومت پر بحث کی گئی ہے اور ''روحانی جمہوریت'' اور ''رحمانی آمریت'' کے تصورات متعارف کروائے گئے ہیں۔

چھٹے باب کا موضوع جدید جغرافیائی سیاست ہے جبکہ ساتواں باب امت کے مسائل کی تشخیص اور انکا جو علاج علامہؒ نے تجویز کیا ہے، پر مشتمل ہے۔ آٹھواں باب تہذیب مغرب اور اسکے مسلم دنیا پر اثرات سے متعلق ہے۔

نواں باب امت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے طریق کار واضح کرتا ہے۔ جبکہ دسویں باب میں مرد مومن کا کردار زیر بحث ہے کہ جس کو حاصل کرنے کے بعد ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ بن سکتا ہے۔

گیارہویں باب میں اس روحانی قوت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ جس کے نتیجہ میں خودی کی زد میں ساری خدائی آجاتی ہے، یعنی ''عشق رسول ﷺ''۔ بارہواں باب فقر کے اسرار و رموز پر مشتمل ہے۔ تیرھویں باب میں پھر مومن کے کردار کو نسبتاً زیادہ تفصیل کیساتھ موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ جبکہ چودھواں باب اقبالؒ کے فلسفہء خودی کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

ابواب پندرہ اور سولہ اقبالؒ کی امت کیلئے دی گئی بشارتوں اور آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر پر مشتمل ہیں۔

گو کہ اقبالؒ ایسی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ایک کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ بہ ایں ہمہ جناب زید حامد نے اقبالؒ کے پیغام کے دریا کو اپنے زور دار الفاظ کے جامے میں، اس مختصر سی کتاب کے کوزے میں، نہایت کامیابی سے بند کیا ہے۔

اس کتاب کے مخاطبین اول قوم کے نوجوان ہیں کہ اب انہیں ہی اس قوم کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ انہیں ہی صداقت، شجاعت اور عدالت کا وہ سبق کہ جو ہم بھول چکے ہیں، دوبارہ پڑھ کر آنے والے وقت میں دنیا کی امامت کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

امید ہے کہ اپنی قومی و ملی تاریخ کے اس مشکل ترین دور میں، کہ جب امت مسلمہ کے اس قلعے (پاکستان) پر جغرافیائی، اقتصادی، سیاسی و نظریاتی، ہر چہار جہت سے طاغوتی قوتیں حملہ آور ہیں، اقبالؒ کا پیغام اس منتشر و مضطرب قوم میں دوبارہ نظریاتی وحدت پیدا کرے گا اور اس میں اس قوت عمل کو دوبارہ بیدار کرے گا کہ جو مسلمان قوم کے قرون اولیٰ کے مجاہدین کے ساتھ مخصوص تھی اور یہی نظریاتی وحدت اور قوت عمل مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کو یقینی بنائیں گے۔ ان شاءاللہ۔

سمیع اللہ بخاری
مدیر شعبہ اردو
براس ٹیکس

پس از من خوانند و دریا بند و می گویند
جہانے را دگرگوں کردیک فرد خود آگاہے
”میرے جانے کے بعد یہ میرے کلام کو پڑھیں گے، سمجھیں گے، اور پھر کہیں گے،
ایک مرد خود آگاہ نے پورے زمانے کو ہلا کر رکھ دیا ہے!“

ا

مردخودآگاہ و خدامست

اس کتاب میں ہم ایک غیر معمولی وجود کے بارے میں بات کریں گے۔ وہ وجود کہ جونشاۃ ثانیہ کا تصور رکھتا تھا، کہ جس نے امت مسلمہ کی تاریخ کا دھارا موڑ دیا، تقدیر بدل دی، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل دے کر شبستان وجود کو لرزا کر رکھ دیا۔ یہ وجود پراسرار، درویش وقت، علامہ محمد اقبالؒ ہیں۔

یہ قوم بہت بدنصیب ہوگی کہ اگر اقبالؒ کو نہ جان سکی۔ اقبالؒ محض ایک شاعر نہ تھے۔ اگر حقیقت پوچھیئے تو اقبالؒ مجد دِوقت تھے۔ انہوں نے بار باراس بات پر زور دیا ہے کہ میری لغت پہ، میری زبان پہ، میری اردو پہ اعتراض نہ کرو۔ اس زمانے میں بھی لوگوں نے ان کو صرف شاعر سمجھ کر ان کی زبان اور لغت پر اعتراضات اٹھا دیئے تھے۔ اقبالؒ اس پر بہت بے چین ہوتے تھے کہ لوگ ان کے پیغام کے جوہر کو، اسکی روح کو نہیں سمجھنا چاہتے۔ انہوں نے یہ تک کہا کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے اگر اسکا عشر عشیر بھی لوگوں کو معلوم ہو جائے، تو وہ ان پر اعتراض کرنا بند کر دیں۔

ایران کے ملک الشعراء بہار نے علامہ کے بارے میں فرمایا کہ ہمارا دور اقبالؒ کا دور کہلائے گا۔ تاریخ اس دور کو اقبالؒ کے دور سے یاد کرے گی۔ پروفیسر آرنلڈ جو کہ علامہ اقبالؒ کے استاد تھے، اور جن کو اقبالؒ آخری وقت تک انتہائی ادب اور احترام سے یاد کیا کرتے تھے، اقبالؒ کے بارے میں کہتے ہیں:

"Iqbal is a man of his age. He is a man ahead of his age and he is a man at war with his age."

''اقبال اپنے عہد کے انسان ہیں، اپنے عہد سے آگے کے انسان ہیں اور عصر حاضر کے خلاف حالت جنگ میں ہیں۔''

علامہ اقبالؒ ایک غیر معمولی وجود ہیں۔ وہ صرف مفکر پاکستان ہی نہیں بلکہ امت مسلمہ کے حکیم، دانشور اور ایک ایسی صاحب بصیرت ہستی ہیں کہ جن کا دور آج بھی ہے اور آنے والی کئی صدیوں تک بھی رہے گا۔ اسی لیے ہم نے اس کتاب کو یہ غیر معمولی نام دیا ہے: ''اقبال پراسرار''۔

اس کتاب میں اقبالؒ کے وجود کے ان پہلوؤں پر، کہ جو آج تک قوم کی نگاہوں سے چھپے رہے ہیں، ہم بات کریں گے۔ تاکہ اس مرد پراسرار کا حقیقی تعارف پہلی مرتبہ ملت کے سامنے لایا جاسکے۔ اس اعتبار سے یہ اقبالؒ کا ایک ایسا غیر معمولی تعارف ہے کہ جس سے ہماری قوم پہلے واقف نہیں تھی۔

اقبالؒ نے شاعری کا سہارا تو لیا مگر حقیقتاً وہ بیک وقت ایک مفکر، فلسفی، نظریاتی رہنما، صاحب بصیرت درویش، سیاسی دانشور اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ولی اللہ تھے۔ جہاں وہ جغرافیائی سیاست کے ایک ماہر تجزیہ کار تھے وہیں وہ تحریک پاکستان کے ایک سیاسی کارکن بھی تھے۔ یہ تمام کمالات اس ایک شخصیت میں کچھ اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اس غیر معمولی وجود کی کسی ایک جہت کو سمجھنے کیلئے بھی طویل عرصہ درکار رہے۔

ان تمام کمالات کے باوجود وہ ایک بشر ہی تھے۔ ان میں بشری کمزوریاں بھی ہونگی۔ ان سے غلطیاں اور کوتاہیاں بھی سرزد ہوئی ہونگی۔ مثالی نمونہ تو صرف اللہ کے رسول ﷺ کی ذات مبارکہ ہی ہے۔ لیکن اقبالؒ سے ہمیں ایک بہت بڑا پیغام یہ ملتا ہے کہ اگر انسان کی نیت صاف ہو، اس کے دل میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی شدید محبت ہو، مسلمانوں کی فلاح کا جذبہ اس کے دل میں جنون کی حد تک موجزن ہو اور اسکا دل مسلمانوں کی حالت زار پر خون کے آنسو روتا ہو، تو پھر قدرت ایسے وجودوں کو اپنے عظیم مقاصد کی تکمیل کیلئے چن لیتی ہے، اور ان کے ذریعے قوموں کی تقدیریں تبدیل کی جاتی ہیں۔

انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ آئے ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے ادوار کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ ہمارے دور میں یہ فرد بلاشبہ اقبالؒ ہیں۔

چودہ سو سال کی مسلم تاریخ کو اگر آپ مختلف ادوار میں تقسیم کرتے چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں واقعات کی ایک غیر معمولی ترتیب پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ جس عہد میں پیدا ہوتے ہیں، اس دور میں پورے عالم اسلام میں مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شکست ہو چکی تھی۔ اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی مسلم تہذیب ''سلطنت مغلیہ'' کا خاتمہ ہوا اور پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں خلافت عثمانیہ ٹوٹنے کے قریب تھی اور جنگ عظیم اول کے بعد امت مسلمہ کا کوئی ملک ایسا نہیں رہ گیا تھا کہ جسے مغربی طاقتوں نے اپنی نو آبادی نہ بنالیا ہو۔ پوری مسلمان دنیا مغربی استعمار کے قبضے میں جا چکی تھی، سوائے مکہ، مدینہ اور افغانستان کے کچھ علاقوں کے، کہ وہاں بھی استعماری طاقتیں شورش اور فساد برپا کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔

پوری امت مسلمہ پر مایوسی کی وہ کیفیت طاری تھی کہ جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ تین سو سال سے امت مسلمہ کا انحطاط جاری تھا۔ ایک طرف خلافت عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ انیسویں صدی میں اسے ''یورپ کا مرد بیمار'' کہا جاتا تھا، کیونکہ یہ خلافت اب آہستہ آہستہ ٹوٹتی ہوئی اپنی موت کی طرف جا رہی تھی۔ بالآخر بیسویں صدی کے آغاز میں ہی، پہلی جنگ عظیم کے بعد، خلافت عثمانیہ مکمل طور پر تباہ ہو جاتی ہے۔ اس سے چند دہائیاں قبل مغلوں کی حکومت کا بھی تختہ الٹا جا چکا تھا۔ ایسے تاریک دور میں اقبالؒ کا آنا اور ایک ایسی روحانی انقلابی سوچ دینا کہ جو اپنے وقت سے صدیوں آگے ہو، مسلمانوں بلکہ ساری انسانیت کیلئے تاریخ اور تقدیر کا بہت بڑا تحفہ تھا۔

اگر ہم فکر اقبالؒ کا ادراک نہ کر سکے تو یہ اس قوم کی بہت بڑی بدنصیبی ہوگی۔ ہماری تمام جغرافیائی سیاست، تاریخ، تہذیب اور نظریہء

پاکستان کی بنیاد فکر اقبالؒ پر ہے۔ صرف ہندوستان پر ہی نہیں بلکہ علامہ اقبالؒ کا جو اثر امت مسلمہ، خصوصاً فارسی اور اردو بولنے والی دنیا پر ہے، وہ اتنا غیر معمولی ہے کہ نا قابل یقین لگتا ہے۔ اس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

....

اقبالؒ نے آج کے جدید دور کو جس طرح بے نقاب کیا ہے، اس سے پہلے، مغرب یا مشرق میں، کسی فلسفی، مفکر یا صاحب بصیرت شخص نے مغربی تہذیب، سیاست، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کو، اس طرح بے نقاب نہیں کیا۔ اقبالؒ نے نظریاتی طور پر جدید مغربی تہذیب کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔ اقبالؒ نے جدید سیاسی عمل ''جمہوریت'' کہ جو آج کل دنیا پر غالب ہے، کا پول بھی کھول کر رکھ دیا ہے۔ اقبالؒ نے جدید بینکاری نظام، جدید سرمایہ دارانہ نظام، کہ جن کی بنیاد سود اور رباء پر ہے، پر بھی کاری ضرب لگائی۔ اپنی شاعری میں صیہونیوں اور فتنہ گر ملاؤں کو بھی بے نقاب کیا۔ اقبالؒ نے اشتراکی نظام کی بھی جڑ کاٹ دی۔ اشتراکی نظام حکومت کس طریقے سے انسانوں کو غلام بناتا ہے، اور یہ کس قدر خلاف فطرت ہے، اسے اقبالؒ نے واضح کیا۔ اس کے مقابل انہوں نے یہ ثابت کیا کہ انسانیت کی فلاح صرف نظام شریعت میں ہے۔ انہوں نے اپنی تمام تر سوچ اور فکر کی بنیاد قرآن پاک پر رکھی، حضورﷺ سے تعلق اور محبت پہ رکھی۔ اقبالؒ جیسے مفکر اور فلسفی کو دنیا کیلئے رد کرنا بھی آسان نہیں کیونکہ اس مرد درویش کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بجتا ہے۔

اس زمانے میں اقبالؒ پوری دنیا میں جانے جاتے تھے۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں ان کے بارے میں خبریں چھپا کرتی تھیں۔ لوگوں کو پتہ ہوتا تھا کہ اقبالؒ اس وقت دنیا میں کہاں سفر کر رہے ہیں۔ ان کی کتابیں بادشاہان وقت پڑھا کرتے تھے۔ بڑے بڑے حکمران اقبالؒ کی کتاب ''اسرار خودی'' کو پڑھنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ ''اقبال ڈے'' پوری دنیا میں ایک ہزار جگھوں پر منایا گیا۔

لہذا اقبالؒ کو ردتو نہیں کیا جاسکتا، البتہ آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبالؒ کو نظرانداز کردیا جائے۔ خاموشی سے اپنی نصابی کتب سے، ذرائع ابلاغ سے، اپنے دانشوروں کے نظریات اور گفتگو سے اقبالؒ کو غائب کردیا جائے تاکہ ان کی وہ فکر اور سوچ کہ جو وہ آنے والی نسلوں کیلئے چھوڑ کر گئے ہیں، اس پر پردہ ڈال کر احیائے امت کے مشن کو روکا جاسکے۔

عالمی استعماری صیہونیوں کی ایک سوچ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کروڑوں کی آبادی اور لاکھوں کی فوج سے کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن ہمیں خطرہ ہے تو ایک ایسے مفکر اور دانشور سے کہ جو مردہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دے، لوگوں کو آزادی کی نئی سوچ وفکر دے اور ہمارے پورے نظام کو بے نقاب کردے۔ ہم ایسے کسی شخص کو باقی نہیں رہنے دیں گے۔

علامہؒ بھی ایسی ہی ایک شخصیت ہیں کہ جو کفر کے پورے نظام کیلئے خطرہ ہوتی ہیں۔ آج کلام اقبالؒ کو اور ان پر کام کرنے والے دانشوروں کو قصداً نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ہم آپ کو مثال دیتے ہیں ڈاکٹر این میری شمل کی۔ ایک جرمن سکالر، کہ جن کا ابھی چند سال پہلے تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا ہے، ہر سال پاکستان آتی تھیں۔ ان کی آمد کے موسم کو پیار سے ''شمل سیزن'' کہا جاتا تھا۔ ہماری بہت عزیز دوست تھیں، ماشاء اللہ۔ علامہ اقبالؒ پر، رومیؒ پر، روحانیت پر، مسلمانوں کے مستقبل اور اسلامی تصوف وفلسفے پر ان سے طویل گفتگو ہوا کرتی۔ دنیا میں، اس دور میں، ان سے بڑا مستشرق کوئی نہیں تھا۔ اب جبکہ ان کے انتقال کو کئی برس بیت چکے ہیں، این میری شمل کا ذکر نہ تو ہم پاکستان میں سنتے ہیں اور نہ ہی یورپ اور امریکہ میں۔ ان کی کتابوں کو بھی تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اقبالؒ کے مقابلے میں دوسرے شعراء کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مانا کہ فیض کی شاعری بہت کمال کی ہے، انقلابی شاعری ہے، لیکن اقبالؒ اور

فیض کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔فیض کے زیادہ تر نظریات اشتراکیت یا مارکسی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ انقلابی ضرور تھے، لیکن ان کے انقلاب کی بنیاد سیکولر تھی، نہ کہ دین، قرآن وسنت اور شریعت پر۔ علامہ اقبالؒ کی سوچ اور فکر اصلاً انقلابی ہے کہ جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ وہ انقلاب کہ جس کی بنیاد قرآن وسنت پر نہ ہو، وہ صرف انارکی ہوگا۔ آج کے نظام کو تباہ کر دو لیکن کل کیا ہوگا؟ کل جس نظام سے وہ اسے تبدیل کریں گے، وہ بھی تو انسانوں کا ہی بنایا ہوا ہی ہوگا۔ یہی ہوا مارکسزم کے ساتھ بھی، ۷۰، ۸۰ سال چلنے کے بعد اس کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔

THE
RECONSTRUCTION OF
RELIGIOUS THOUGHT
IN ISLAM

BY
SIR MOHAMMAD IQBAL

OXFORD UNIVERSITY PRESS
LONDON : HUMPHREY MILFORD
1934

اسلام کے بارے میں واضح طور پر اقبالؒ خود اپنی شاعری میں کہتے ہیں کہ مغرب کے نظام کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ آنے والے وقت میں ان کے سامنے جو نظام اور نظریہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہوگا، وہ اسلام ہے۔ چونکہ اقبالؒ نے اپنے تمام نظریات کی بنیاد قرآن اور اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق پر رکھی ہے، لہٰذا اقبالؒ کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ فکر اقبالؒ کو کسی جگہ پروان نہیں چڑھنے دیا جاتا۔ ان کی صرف وہ نظمیں کہ جو بے ضرر سی لگتی ہیں، مثلاً ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری''، یا ''پہاڑ اور گلہری'' اور ''جگنو اور بلبل'' وغیرہ تو بچوں کو پڑھائی جاتی ہیں، لیکن ان کی وہ شاعری، ان کے وہ پیغامات، ان کی کتاب "Reconstruction of Religious Thought in Islam" ان کا وہ فلسفہ کہ جو دنیا میں انقلاب برپا کرتا ہے، اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے، جو مسلمانوں کو حوصلہ اور امید دیتا ہے، ان کو شاہین بناتا ہے، اپنے پیروں پر کھڑا کرتا ہے، انہیں خودی، خودداری، عزت اور وقار کا درس دیتا ہے، کو یوں غائب کر دیا گیا ہے کہ جیسے وہ تھا ہی نہیں۔
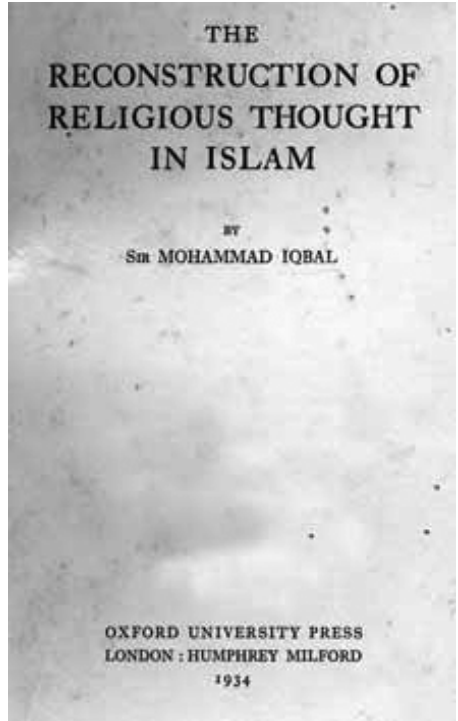
مسلمان قوم کو یا ہمیں بحیثیت ایک ملک کے اگر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے، عزت وخودداری کا کوئی سبق سیکھنا ہے، تو اس کیلئے ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم علامہ اقبالؒ کی طرف رجوع کریں۔ یہ اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہم قرآن وسنت کی طرف کیوں نہ رجوع کریں؟ تو یہ جان لیجیئے کہ جو کچھ انہوں نے اپنی شاعری میں، اپنے کلام میں بیان کیا ہے، وہ قرآن وسنت کی اصل روح، اصل حکمت، اصل تصور، اصل جوہر ہے۔ وہ قرآن وسنت کی ایسی حکمت ہے کہ جو مسلمان کلام اقبال کے ذریعے اردو اور فارسی میں سمجھ سکتے ہیں، کہ جس کے باعث نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز قوم پیدا ہوتی ہے، کہ جس کا ہر فرد بندۂ مولا صفات ہوتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یہ شعر قرآن کی اس آیت کا ترجمہ ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ مومن آپس میں رحیم اور کفار پر شدید ہیں۔

اقبالؒ کا کلام درحقیقت قرآن کا ہی ترجمہ ہے۔ چاہے قرآن سے رجوع کیجیئے یا حضورﷺ کی سنت مبارکہ سے فیض لیجیئے یا علامہ اقبالؒ کے کلام کو پڑھیے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے سارا فیض قرآن و سنت سے لیا ہے۔ اب پاکستان کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اقبالؒ سے فیض لیں!

....

اگر آپ چودہ سو سال کی مسلم تاریخ کو اٹھا کر دیکھیں تو آپکو اس میں تین بڑے واضح ادوار نظر آتے ہیں۔ پہلا دور قرونِ اولیٰ کا ہے کہ جب حضورﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلافت راشدہ قائم ہوتی ہے کہ جس میں مسلمان تہذیب پوری دنیا میں پھیلتی ہے۔ پچاس ساٹھ سال کے اندر حال یہ تھا کہ چین سے لیکر مغربی افریقہ اور سپین کے اندر تک مسلمان تہذیب تین براعظموں میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ اسکے بعد کی صدیوں میں بھی جو اسلامی سلطنت قائم ہوتی ہے، چاہے بنو امیہ کے دور میں ہو، یا بنو عباس میں، اندلس میں ہو یا ایشیا

وسطی میں، خلافت عثمانیہ میں ہو یا ہندوستان میں، اسلام ایک مضبوط تہذیب اور نظریے کے طور پر دنیا میں پھیلتا ہی رہا۔ عسکری قوت کی بات کی جائے یا نظریاتی پختگی کی، ہر سطح پر مسلمانوں کا غلبہ واضح نظر آتا ہے۔ معیشت ہو، سائنس ہو، انجینئرنگ ہو، ریاضی ہو، تعمیرات ہو، غرضیکہ جس مرضی شعبے میں آپ دیکھ لیجیئے، اس وقت اسلامی تہذیب ہی دنیا کا مرکز تھی۔

پوری دنیا سے لوگ مسلمان علاقوں میں آتے تھے۔ قرطبہ، غرناطہ، بغداد، دمشق جیسے شہر تہذیب کے مراکز ہوا کرتے تھے۔ مسلمان تہذیب وسط ایشیاء میں بخارا سے لیکر روس اور چین تک پھیل چکی تھی۔ یہ مسلمانوں کے عروج کا دور تھا۔

اس کے کئی سو سال کے بعد دوسرا دور وہ تھا کہ جب مسلم تہذیب پھیلنا بند ہو چکی تھی مگر اپنی جگہ مستحکم تھی اور مغرب خود کو منظّم کر کے مسلمانوں پر حملے کر رہا تھا۔ وہ صلیبی جنگوں کا دور تھا۔ صلیبی جنگیں بھی کئی سو سال چلیں کہ جن میں کبھی نورالدین زنگیؒ اور کبھی سلطان صلاح الدین ایوبیؒ جیسے مجاہدین پیدا ہوتے رہے کہ جن کی تلواریں امت مسلمہ کی آبرو کی حفاظت کرتی رہیں۔

اگر آپ نوٹ کریں تو یہ وہ دور تھا کہ جب مسلمان اپنی سرحدوں سے نکل کر دوسرے ممالک پر حملے نہیں کر رہے تھے، بلکہ دشمن ممالک کی جانب سے مسلمانوں پر حملے ہو رہے تھے اور مسلمان صرف اپنے علاقوں میں دفاعی جنگیں لڑ رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ہم اپنی عزت و آبرو کا دفاع اپنے گھروں میں رہتے ہوئے کر رہے تھے اور جو تہذیب ہم نے پہلے اپنے عروج کے دور میں قائم کی تھی، اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس وقت مسلمانوں کو بہت نقصانات بھی ہوئے، مثلاً چنگیز خان اور اس کی اولاد کہ جو منگولیا سے اٹھی، وہ پوری مسلم دنیا کو روندتے چلے گئے۔ بغداد کا نقصان اتنا شدید تھا کہ امت مسلمہ کی تاریخ میں کبھی اتنا شدید صدمہ مسلمانوں نے اس سے پہلے نہیں اٹھایا تھا۔ خلافت کا مرکز، بغداد روند دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کی خلافت کا دارالخلافہ، تاخت و تاراج ہوا، خلیفہ کو قالین میں لپیٹ کر گھوڑوں کے نیچے دے دیا گیا، لاکھوں مسلمانوں کو قتل عام کے بعد دجلہ میں پھینک دیا گیا اور مسلمانوں کی کتابیں، لائبریریاں اور تہذیب جلا کر راکھ کر دی گئی۔ اس کے باوجود مسلمان نظریاتی طور پر اتنے مضبوط تھے کہ جلد ہی اپنے پیروں پر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے بعد خلافت عثمانیہ قائم کی اور پھر اپنے عروج پر جا پہنچے۔

ٹیپو سلطانؒ

تیسرا دور تقریباً آج سے اڑھائی سو سال پہلے، خاص طور پر ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد، شروع ہوتا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی بنگال پر قبضہ کرتی ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا زوال شروع ہوتا ہے۔ ۱۷۵۷ء میں نواب سراج الدولہ کی شہادت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطانؒ شہید ہوتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہم جنگ آزادی ہارتے ہیں۔ یہی
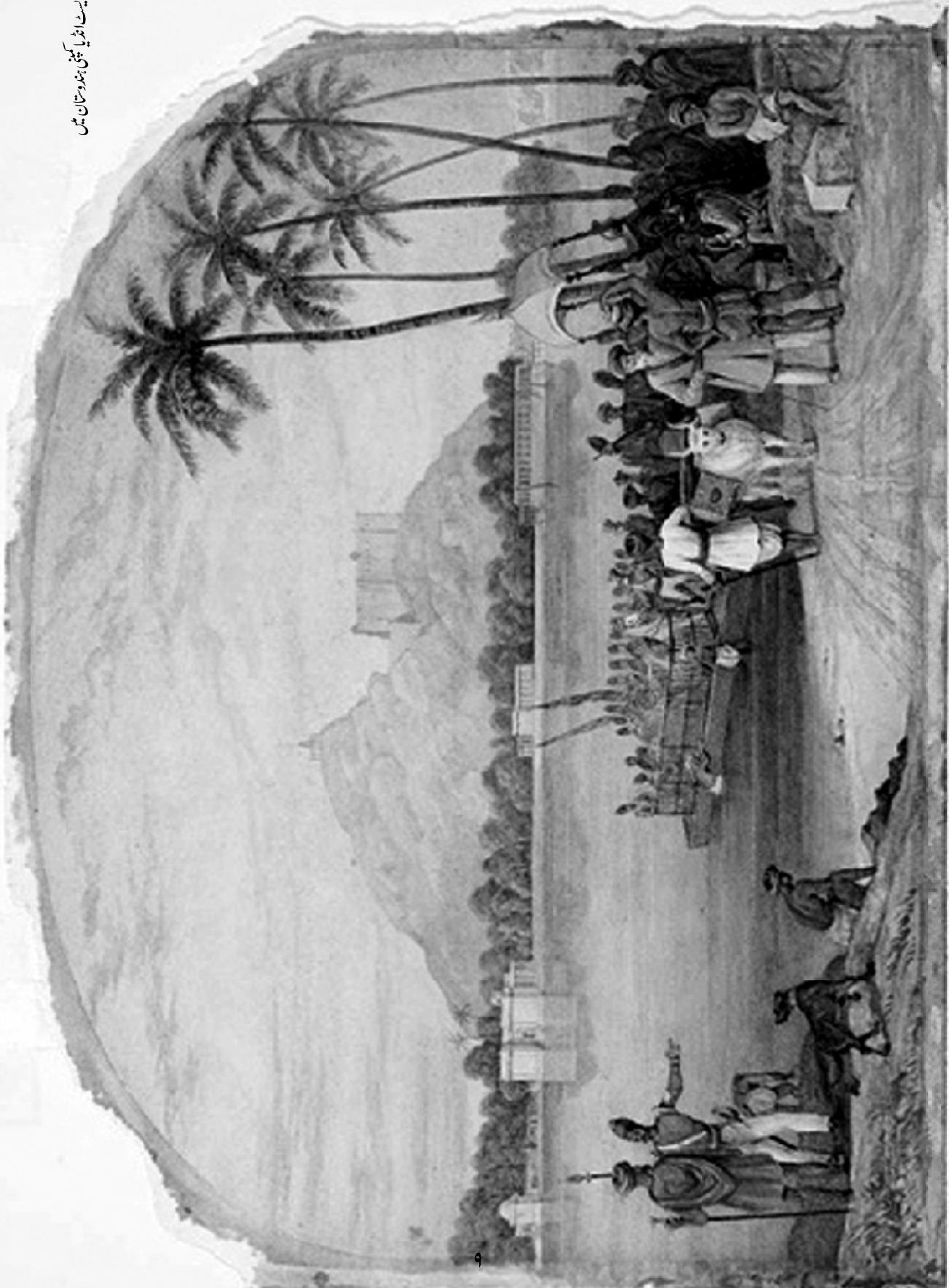
وہ دور ہے کہ جب خلافت عثمانیہ بھی اپنی جگہ پر کمزور ہورہی ہوتی ہے۔ یہ تیسرا دور زوال کا دور ہے۔ یہ زوال کا دور ۱۹۲۴ء تک چلتا ہے کہ جب خلافت عثمانیہ مکمل طور پر تباہ کر دی جاتی ہے۔ اسی دور میں اقبالؒ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ان کے تینوں ادوار میں عہد حاضر سے زیادہ تاریک دور مسلمانوں پر کبھی نہیں آیا۔ پوری مسلم دنیا مغربی طاقتوں کی نوآبادیات میں تبدیل ہوگئی تھی اور پہلی مرتبہ مسلمان سیاسی خلافت کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیئے گئے۔

اقبالؒ کے آنے کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے کہ جو دوبارہ عروج اور نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ اس کو ہم آگے بیان کریں گے۔

....

مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور اقبالؒ تینوں بزرگ تاریخ ساز شخصیات ہیں۔ یہ تینوں وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں مسلمانوں کی تقدیر تبدیل کر دی۔ مجدد الف ثانیؒ کا تو نام ہی ''مجدد الف ثانی'' ہے کہ جس کا مطلب ہے کہ دوسرے ہزار سال کے مجدد۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہؒ اور پھر علامہ اقبالؒ، یہ تین بڑے معاشرتی مفکر، فلسفی، صوفی، ماہر عمرانیات، صاحب بصیرت اور ایسے روحانی وجود ہیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں امت مسلمہ، خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کو سنبھالا دیا۔ لیکن نوٹ کیجیئے گا کہ تینوں کے ادوار مختلف ہیں۔ یہ مسلم تہذیب کے وہی تین ادوار ہیں کہ جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

بادشاہ اکبر

مجدد الف ثانیؒ اکبر بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب مغل حکومت اپنے عروج کی طرف جا رہی تھی اور اکبر گمراہ ہونے لگا تھا۔ اس نے ''دین الٰہی'' کے نام سے ایک نئے مذہب کا اعلان کر دیا اور اسلام کے نام پر خرافات شروع کر دی تھیں۔ وہ اسلام کو ہندو مذہب کے ساتھ جوڑ کر ایک نیا دین ایجاد کرنے کی کوشش میں تھا۔ اکبر سے پہلے آٹھ سو سال سے مسلمان ہند پر حکومت کر رہے تھے۔ اکبر اور اس کے بعد مغلیہ دور کو عروج حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت حضرت مجدد کی حکمت عملی مختلف تھی، چونکہ حکمران وقت مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی حکومت تھی کہ جو کئی سو سال سے چلی آرہی تھی۔ حکمران گمراہ ہوگیا تو مجدد الف ثانیؒ نے ریاست کے خلاف بغاوت برپا کرنے کے بجائے آس پاس کے مسلمان حکمرانوں، جرنیلوں، وزراء، دانشوروں اور علماء وغیرہ پر کام کیا تا کہ بادشاہ کی گمراہی کے فتنوں کو روکا جا سکے۔

جب اکبر کا انتقال ہوتا ہے تو اس کے بیٹے جہانگیر پر انہوں نے اتنا زیادہ کام کیا ہوا تھا کہ وہ تمام فتنے کہ جو اکبر نے شروع کرائے تھے،

جہانگیر نے خود اپنے ہاتھ سے ان کو ختم کیا۔ مجدد الف ثانیؒ نے ریاست سے بغاوت نہیں کی حالانکہ ان کو جیل میں بھی بند کیا گیا، سختیاں بھی کی گئیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعے مسلمان حکمران کے وزراء اور مشیروں پر جس طرح کام کیا وہ تاریخ کا ایک غیر معمولی باب ہے۔

اس زمانے کا تقاضا یہ تھا کہ ریاست کے خلاف بغاوت نہ کی جائے۔ اگر ریاست کے خلاف بغاوت کی جاتی تو پھر ہندوؤں کو سر اٹھانے کا موقع مل جاتا۔ مسلمان چونکہ ہندوستان میں اقلیت میں تھے تو ہندوؤں، مرہٹوں یا سکھوں کو موقع ملتا کہ مسلمان ریاست کی جڑ کاٹ دیں، لہذا حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے، حکمرانوں اور نظام کی اصلاح کی۔ اُس وقت کی حکمت عملی مختلف تھی، کیونکہ وقت کا تقاضا یہی تھا۔

اس کے مقابلے میں شاہ ولی اللہؒ کا دور دیکھیں، کہ جو اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد، اورنگ زیب عالمگیر کے بعد آتا ہے، تو وہ فتنوں کا دور تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب مغلیہ حکومت تقریباً ختم ہونے کے قریب تھی۔ حال یہ تھا کہ دہلی کا مرکز مضبوط نہیں رہا تھا۔ مرہٹوں نے سر اٹھالیا تھا اور وہ قتل وغارت کرتے ہوئے دہلی کے قریب آپہنچے تھے۔ مرہٹہ ریاست جنوب میں تھی، لیکن شمالی ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی جان، مال، عزت وآبرو اور سیاسی طاقت، کچھ بھی محفوظ نہ رہ گیا تھا۔ اس دور میں شاہ ولی اللہؒ نے ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت کا آغاز کیا تو دوسری طرف ایک سیاسی صاحب بصیرت ہونے کے ناطے انہوں نے مسلمانوں کی ریاست کو بچانے اور مستحکم کرنے کی کوشش بھی کی۔

لیکن اقبالؒ کا دور ان دونوں بزرگوں کے ادوار کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے تاریک تر، دشوار گزار اور کٹھن تھا......

علامہ اقبالؒ گول میز کانفرنس کے دوران، بکنگھم پیلس سے نکلتے ہوئے

۲

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے

ہم نے پچھلے باب میں امت کے تین مختلف ادوار میں اٹھنے والے مجدّ دین کا ذکر کیا۔ ان میں پہلا نام مجدد الف ثانیؒ کا ہے، کہ جنہوں نے اکبر کی اسلام میں تحریفات کی کوششوں کا سد باب کیا۔ دوسرا نام شاہ ولی اللہؒ کا ہے، کہ جنہوں نے عوام الناس کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیا، قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا، کئی کتابیں لکھیں، کئی مقالے لکھے، دعوت وتبلیغ کے ذریعے دوبارہ سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور سیاسی سطح پر احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے خلاف جنگ کی دعوت دے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی ڈوبتی ہوئی طاقت کو سہارا دینے کی کوشش کی۔

شاہ ولی اللہؒ کے بعد، جو تیسرا وجود مسلمانوں کو بیدار کرنے کے حوالے سے ہمیں نظر آتا ہے، وہ علامہ اقبالؒ ہیں۔ اگر آپ تینوں ادوار کا موازنہ کریں تو مجدد الف ثانیؒ اُس دور میں تشریف لاتے ہیں کہ جب مسلمان عروج پر تھے۔ شاہ ولی اللہؒ اس دور میں تشریف لاتے ہیں کہ جب مسلمانوں میں زوال کا آغاز ہو چکا تھا اور وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ علامہ اقبالؒ ایسے دور میں تشریف لاتے ہیں کہ جب مسلمانوں پر زوال اور غلامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔

ان تینوں کا کام ایک ہی تھا، حالات، واقعات اور تاریخ کے ادوار البتہ مختلف تھے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی جب اپنے دور میں کام کا آغاز کیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایک دعا کی:

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ کیونکہ تین سو سال سے ہند میں روشنی کی کوئی کرن نہیں، کوئی امید نظر نہیں آتی، مکمل اندھیرا چھا چکا ہے، لہذا اب وقت ہے کہ آپ اس امت پر اپنا کرم فرما دیں۔ اسی لیے اقبالؒ نے اپنے کلام کے بارے میں کہا کہ میری شاعری کو تم محض شاعری سمجھ کر نظر انداز نہ کر دینا۔ میں محرم راز ہوں، یعنی اندر کے راز جانتا ہوں۔ تاریخ اور تقدیر کے جو فیصلے اللہ نے اس امت، اس ملت کے بارے میں کیے ہوئے ہیں، میں ان رازوں سے آگاہ ہوں، اور جو کچھ میں اپنی شاعری کے ذریعے تمہیں پیغامات دینا چاہتا ہوں، وہ آنیوالے کل کی خوشخبریاں اور بشارتیں بھی ہیں۔

....

اگر آپ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار کو اٹھا کر دیکھیں تو آغاز میں قیادت عربوں کے پاس تھی۔ اس کے بعد قیادت ترکوں کو منتقل ہو گئی کہ جس کا ظہور خلافت عثمانیہ کی شکل میں ہوا۔ اقبالؒ کا اس دور میں آنا ایک بہت بڑی نوید اور بشارت ہے کہ اب قدرت کی طرف سے قیادت فطری اور تاریخی طور پر اس خطے کے مسلمانوں یعنی مسلمانانِ ہند اور خراسان، یعنی وہ تمام علاقے کہ جو ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کے علاقے بنتے ہیں، کو دی جائے گی۔ اقبالؒ جیسے مفکر، دانشور اور مجدد کا امت مسلمہ کے دورِ زوال میں آنا ہی بذاتِ خود ایک بہت بڑی روحانی بشارت ہے۔ اقبالؒ کی آمد سے وہ بہت بڑا خلاء پر ہو گیا کہ جو حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔

اگر آپ اس بات کو نوٹ کریں تو خاص طور پر برصغیر، کہ جس میں پاکستان بھی شامل ہے نیز ایران، افغانستان اور ایشیاء وسطی کے علاقوں میں اقبالؒ کے کلام نے جو اثر ڈالا ہے وہ انتہائی غیر معمولی ہے۔ اقبالؒ نے اس پورے خطے کے بارے میں، جو کچھ آگے ہونے والا ہے، سے متعلق انتہائی حیرت انگیز پیش گوئیاں کی ہیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایران کے بارے میں کہا کہ:

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا

شاید کہ کرہ ارض کی تقدیر بدل جائے

یعنی اگر طہران ایک مشرقی جنیوا بن جائے، یعنی امت مسلمہ کیلئے اقوام متحدہ کی طرز کا ایک مرکز بن جائے تو پوری انسانیت کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

افغانستان کے بارے میں انہوں نے کہا کہ:

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں در آں پیکر دل است
از فساد او فساد آسیا
در کشاد او کشاد آسیا

ایشیا ایک جغرافیائی اکائی ہے اوراس میں افغانستان کو دل کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر افغانستان میں فساد ہوگا تو پورے ایشیاء میں فساد ہوگا۔ اگر افغانستان میں امن ہوگا تو پورا ایشیاء پرامن رہے گا۔ اوراب حقیقت بھی یہ ہے کہ ۱۹۷۹ء کے بعد سے افغانستان میں فساد ہے اوراس کی وجہ سے پاکستان اور پورے خطے میں مختلف نوعیت کی جنگیں اورشورشیں برپا ہیں۔ اقبالؒ کی دور اندیشی دیکھیئے کہ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں ہی ان فتنوں کا اندازہ کرلیا تھا کہ جوصدی کے آخر اور اکیسویں صدی میں برپا ہونے والے تھے۔

۱۹۹۲ء میں، ہمیں یاد ہے کہ، جب ہم افغانستان پار کر کے تاجکستان کی سرحد تک پہنچ چکے تھے اور ہمارے اور تاجکستان کے بیچ صرف دریائے آمو ہی رہ گیا تھا، تو یہ وہ دور تھا کہ جب اُس طرف تاجکستان میں انقلاب برپا ہورہا تھا کہ جس کی بازگشت ہمیں افغانستان میں سنائی دیتی تھی۔ وہاں لاکھوں کا مجمع حکومت وقت کے خلاف سڑکوں پر تھا، اور علامہ اقبالؒ کا یہ شعر انقلابی نغمے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا:

مصنف افغان جہاد کے دوران

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز

اے وہ کہ جس نے حرم کی تعمیر کی تھی، اٹھو! اور دوبارہ زمانے کی تعمیر کرو، اور جس گہرے خواب میں تم ڈوبے ہوئے ہو، اس سے بیدار ہو جاؤ!

اقبالؒ کا یہ غیر معمولی کلام ۱۹۹۲ء میں وسطی ایشیاء میں انقلاب برپا کر رہا تھا۔ اس سے قبل ۱۹۷۹ء میں ایران میں بھی آنے والے انقلاب کی نظریاتی اور روحانی اساس کلام اقبال پر ہی تھی۔

ہم اقبالؒ کے اس خطے میں بھیجے جانے کی حکمت سے متعلق بات کر رہے تھے۔ آج اگر آپ پاکستان کا کردار دیکھیں تو پاکستان امت مسلمہ کی آخری چٹان نظر آتا ہے۔ ہم مسلم دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہیں۔ امت کا مرکز ثقل پاکستان ہے۔ خدانخواستہ، اگر پاکستان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس کے بعد امت مسلمہ کے دفاع کیلئے کوئی طاقت باقی نہیں بچے گی۔

آج افغانستان میں فساد ہے۔ ایران بھی ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں بھی مسلمان ممالک کو تقسیم کیا جا رہا ہے اور وسط ایشیا میں بھی تبدیلی کی لہر اٹھ رہی ہے۔ پوری دنیا کی نگاہیں اسی خطے پر ہیں۔ پاکستان اس وقت پوری مسلم دنیا کے دشمنوں کا ہدف ہے، اور امت مسلمہ کی امیدیں بھی اسی سے وابستہ ہیں۔ آنے والے دور میں کیا ہونے والا ہے؟ اس میں کیا تبدیلیاں واقع ہونگی؟ اس میں امت کو کیسا شاندار عروج ملے گا؟ اور مسلم امت کا مرکز اس خطے کو کیونکر بننا ہے؟ اس سے متعلق بشارتیں اقبالؒ ہمیں دے کر جا چکے ہیں۔

اقبالؒ اس آنے والے وقت کو دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ ناقابل یقین محسوس ہونے والی بشارتیں انہوں نے اس خطے کے مسلمانوں ہی کیلئے دی ہیں۔

آنکھ جو دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

محو حیرت ہوں دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

کھول کر آنکھ مرے آئینہ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اقبالؒ خود کہتے ہیں کہ میں جو باتیں کر رہا ہوں، یہ آنے والے دور کی خوشخبریاں ہیں۔ قائداعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کیلیئے "Seer" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ "Seer" ایسے صاحب بصیرت اور صاحب نگاہ وجود کو کہتے ہیں کہ جو آنے والے دور کو دیکھ سکتا ہو۔ یہی بات ان کے استاد آرنلڈ نے بھی کم بیش ان الفاظ میں کہی تھی کہ یہ صاحب زماں ہیں، صاحب استقبال ہیں اور اپنے دور کے خلاف نبرد آزما۔

اس غیر معمولی وجود کا اس سرزمین میں آنا، برصغیر پاک و ہند اور فارسی بولنے والے خطے یعنی ایشیاء وسطی، افغانستان اور ایران کے مسلمانوں کیلیئے ایک بہت بڑی بشارت ہے۔ یہ تاریخی طور پر اس بات کی نشانی ہے کہ آنے والے دور کی قیادت اس خطے کے مسلمانوں کے پاس ہوگی اور اس میں ایک بہت بڑا کردار پاکستانی مسلمانوں کا ہوگا۔

....

علامہ اقبالؒ بنیادی طور پر اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔ ان کی نگاہ عالمی بلکہ آفاقی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں اقبالؒ جب ایک طالبعلم کی حیثیت سے برطانیہ گئے تو وہاں انہوں نے کیمبرج یا آکسفورڈ میں پہلے سے موجود اسلامک سوسائٹی کا نام تبدیل کر کے ''پین اسلامک سوسائٹی'' رکھ دیا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اقبالؒ میں اتحاد بین المسلمین کے لیے تڑپ اور جذبات اوائل سے ہی بھڑک رہے تھے۔ وہ قوم پرست نہیں بلکہ اتحاد امت مسلمہ کے داعی تھے۔ گو کہ انہوں نے شروع میں ہندی قومیت سے متعلق سطحی سی شاعری بھی کی کہ جس کا پس منظر ہم آگے بیان کریں گے، لیکن اتحاد بین المسلمین ہی ہمیشہ اقبالؒ کے پیش نظر رہا۔ وہ امت مسلمہ کے زوال سے کبیدۂ خاطر تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ لارنس آف عریبیہ کس طرح مقامی عرب قبائل کے ساتھ مل کر خلافت عثمانیہ کی جڑیں کاٹ رہا ہے۔ خلافت کے ٹوٹنے کا اقبالؒ کو گہرا صدمہ تھا۔

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

جس وقت یہ عرب انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کے ساتھ غداری کر رہے تھے، اس وقت اقبالؒ نے وہ شعر کہا کہ جس نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں آگ سی لگا دی۔ کہتے ہیں:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ ﷺ

خاک وخون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

اقبالؒ جب یورپ گئے تو خاص طور پر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو دیکھنے کیلئے سپین گئے۔ مسجد قرطبہ میں جب انہوں نے وہاں کے مقامی گائیڈ سے سوال کیا کہ کیا میں یہاں دو رکعت نماز ادا کرسکتا ہوں؟ تو عیسائی گائیڈ نے ان سے کہا کہ آپ یہاں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اس پر اقبالؒ جلال میں آ گئے اور کہا کہ تم ہمارے ساتھ یہ سلوک کیسے کر سکتے ہو کہ جب ہم نے یہاں آٹھ سو سال حکومت کی تو ہم نے تو کبھی تمہیں عبادت کرنے سے نہیں روکا! یہ جواب سن کر وہ گائیڈ سناٹے میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ ٹھہریے، میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔ وہ بڑے پادری سے اجازت لینے گیا تو پیچھے اقبالؒ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں اذان بھی دی اور نماز بھی پڑھ ڈالی۔ اس موقع کی ایک یادگار تصویر بھی ہے۔ انہوں نے قرطبہ اور سپین پر بہت ہی دل گداز شاعری کی۔

....

بنیادی طور پر اقبالؒ کا دائرہ نگاہ پوری امت مسلمہ پر محیط تھا۔ آپ کا میدان عمل اس لحاظ سے تو محدود ہوسکتا ہے کہ آپ نے فارسی اور اردو زبان میں شاعری کی اور ہندوستان کی سیاسی تحریک میں شریک رہے، لیکن آپ کا تصور اور نگاہ آفاقی تھی۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

اقبالؒ دوبارہ اس خلافت کے احیاء کی بات کرتے ہیں کہ جس کو بچانے کیلئے ہندوستان کے مسلمانوں نے تحریک خلافت شروع کی تھی۔ طرابلس کی جنگ میں ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کے نام سے انہوں نے ایک انتہائی جذباتی نظم لکھی۔ یہ ان کی ۱۹۱۲ء کی شاعری ہے، کہ جب اٹلی نے خلافت عثمانیہ پر حملہ کیا تھا اور ترک مسلمان بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ اس وقت اقبالؒ ہند کے مسلمانوں میں حریت کی آگ بھڑکاتے رہے اور ترکوں کے ساتھ ہند کے مسلمانوں کی یکجہتی کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کرتے رہے۔

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

طرابلس کی جنگ میں ایک بارہ سال کی ترک بچی غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی۔ اس واقعے پر اقبالؒ کی شاعری نے پورے ہندوستان کو رلا دیا تھا۔

اسی طرح ۱۹۱۲ء میں بادشاہی مسجد میں ایک جلسہ ہوتا ہے۔ ۱۹۱۲ء کی بات کر رہے ہیں کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی عمل ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا اور اقبالؒ کی نگاہ دیکھیئے کہ اتحاد بین المسلمین کے حوالے سے ان کی سرگرمیاں اسی دور میں شروع ہو چکی تھیں۔ جنگ طرابلس کے حوالے سے بادشاہی مسجد لاہور میں انہوں نے ایک نظم پڑھی کہ جس کا ایک شعر ہے:

سپین، علامہ اقبالؒ مسجد قرطبہ میں
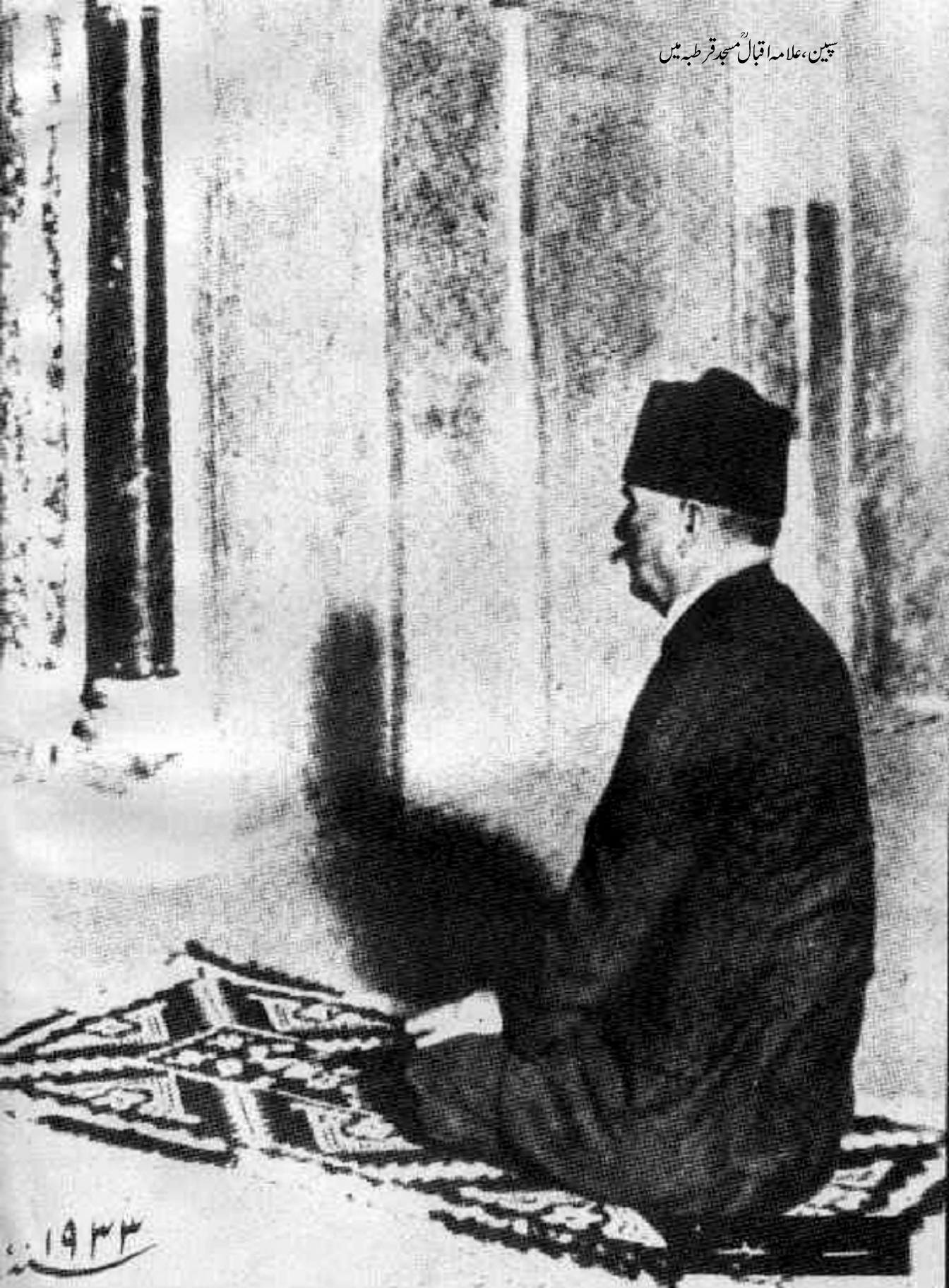
جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

یعنی اس نظم میں اقبالؒ حضورﷺ کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کر رہے تھے اور جب انہوں نے یہ شعر پڑھا تو اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ پوری بادشاہی مسجد میں لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، شہر میں ہنگامہ برپا ہونے کا اندیشہ ہو گیا، لوگوں کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے وفد امداد لیکر ترکی جانا شروع ہوئے۔ عورتوں نے اپنے زیور بیچ دیئے۔ مسلمانوں نے اپنی جان، مال، عزت سب کچھ ترکوں کی مدد کیلئے داؤ پر لگا دیا۔ آج بھی ترکی کے مسلمان اس قربانی کو یاد رکھ کر پاکستان کے مسلمانوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں خلافت سے محبت کی یہ آگ لگانے والے علامہ اقبالؒ تھے۔ اقبالؒ خود فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو پوری امت میں آگ لگا سکتا ہوں لیکن میری قوم ابھی اس بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ابھی وہ منظّم نہیں، فساد پھیلنے کا اندیشہ ہے لہذا میں احتیاط سے کام لیتا ہوں۔

....

بادشاہ امان اللہ خان

علامہ اقبالؒ نے جب پیام مشرق لکھی تو اسے افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کے نام معنون کیا۔ لوگوں نے اس پر بھی یہی سوال کیا کہ آپ نے اسے امان اللہ خان کے نام کیوں معنون کیا؟ انہوں نے کہا کہ اس لیے کہ وہی اس وقت ایک واحد آزاد مسلمان ریاست کا سربراہ ہے۔ باقی پوری مسلمان دنیا تو غلام ہو چکی تھی حتیٰ کہ مکہ اور مدینہ میں بھی خلافت کے خلاف عرب قبائل کی بغاوت برپا تھی۔ اقبالؒ کو مسلمان حکمرانوں سے بہت امیدیں تھیں۔ انہوں نے خاص طور پر افغانستان کے بادشاہوں پر بہت زیادہ کام کیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء کے دور میں آپکو یاد ہوگا کہ ہندوستان میں ہجرت کے فتوے جاری ہو گئے تھے۔ تحریک ہجرت جاری تھی اور مسلمان بڑی تعداد میں

افغانستان جارہے تھے۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے اپنے گھر بار، اپنے کاروبار ختم کر کے ہجرت کا آغاز کر دیا۔ یہ تحریک یوں برپا ہوئی تھی کہ چونکہ انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں کے ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا کہ جو مسلمانوں کیلئے متبرک تھے۔ قبلہء اول بھی انگریزوں کے پاس چلا گیا تھا اور خلافت عثمانیہ کو بھی توڑ دیا گیا تھا، چنانچہ انگریزوں کے خلاف اتنا غصہ تھا کہ کچھ مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ انگریزوں کی غلامی میں زندگی نہیں گزاریں گے، لہذا بڑی تعداد میں مسلمان افغانستان ہجرت کر گئے۔

۱۹۲۸ء میں جب بچہ سقہ نے امان اللہ خان کا تختہ الٹ دیا اور جنرل نادر شاہ یورپ سے افغانستان اپنی حکومت واپس لینے کیلئے جارہے تھے، تو علامہ اقبالؒ لاہور ریلوے سٹیشن پر ان سے ملاقات کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی جمع پونجی، دس ہزار روپیہ نقد، نادر خان کو دیتے ہیں تاکہ وہ اس عسکری مہم کا خرچ اٹھا سکے۔ گو کہ نادر خان نے ان سے یہ رقم تو نہیں لی مگر اقبالؒ کا جذبہ دیکھیئے کہ وہ افغانستان کے معاملات کو اس قدر سنجیدگی سے لیتے تھے۔ وہ آنے والے وقتوں میں امت مسلمہ کے حوالے سے افغانستان کے کردار کو دیکھ رہے تھے۔ آج اقبالؒ کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے وہ بھی جنرل نادر شاہ غازی کی طرف سے تحفے کے طور پر بھیجا گیا تھا۔

....

اقبالؒ ایک طویل فکری ارتقاء سے گزرنے کے بعد ''اقبال'' بنے اور ''حکیم الامت'' کے خطاب کے مستحق ٹھہرے۔ انہوں نے امت کے تمام امراض کی تشخیص کی۔ اسے زوال کیوں آیا؟ معاشرتی، فلسفیانہ، تکنیکی غرضیکہ ہر پہلو سے انہوں نے دیکھا کہ مسئلہ کہاں کہاں ہے؟ امت کی روحانیت کیوں گم ہوگئی؟ کہاں ان کا قرآن سے تعلق ٹوٹا اور کہاں سے ان کا اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی زوال شروع ہوا؟ ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے، کہ جہاں انگریز بھی موجود ہیں، ہندو بھی موجود ہیں، جہاں مسلمان بھی مختلف قسم کی جماعتوں اور فرقوں میں منقسم ہیں، حکیم الامت نے ملت کے زوال کے سدباب کا یہ حل تجویز کیا کہ جب تک ہند میں ایک علیحدہ اسلامی ریاست نہ بنائی جائے، اس وقت تک وہ مرکز نہ بن پائے گا کہ جس کی بنیاد پر خلافت اسلامی کا احیاء اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ ممکن ہوسکے گی۔ پاکستان ان کی نظر میں اس عظیم مقصد کے حصول کا ایک کلیدی نقطہء آغاز تھا، ایک ایسا مرکز کہ جس پر متحد ہو کر امت مسلمہ دوبارہ دنیا کی قیادت سنبھال سکتی تھی۔

۱۹۱۴ء میں اقبالؒ نے اپنی کتاب ''اسرار خودی''، لکھی۔ اسرار خودی ان کا ایک فارسی زبان کا شاہکار ہے۔ اس وقت تک تو ہندوستان کے مسلمان علامہ اقبالؒ کی اس سیاسی فکر سے ٹھیک طرح سے واقف بھی نہ تھے۔ اس وقت اقبالؒ کی توجہ کا مرکز فارسی بولنے والی دنیا تھی۔ ان کے والد نے خاص طور پر ان سے کہہ کر یہ کتاب لکھوائی تھی۔ اس دور میں جب یہ کتاب نکلی تو پوری دنیا میں اس نے تہلکہ مچا دیا۔ پروفیسر نکلسن نے برطانیہ سے علامہ اقبالؒ سے اجازت طلب کی کہ ہم اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اس خط کو پڑھ کر رو دیئے اور کہنے لگے کہ یہ کتاب میں نے مسلمانوں کیلئے لکھی ہے اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اسے پڑھنا بھی نہیں چاہتے اور انگریز اس کا ترجمہ کر کے اس سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پورے یورپ میں اس دور میں اس کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے شائع ہوئے اور یورپ کے حکمران بڑے شوق سے ان کو پڑھتے تھے۔

....

اقبالؒ کی شاعری کو ان کے دور کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ خاص طور پر وہ شاعری کہ جو انہوں نے ہندوستان اور برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کو مکمل طور پر کچل دیا گیا تھا۔ یعنی یہ وہ کیفیت تھی کہ جب

بہادر شاہ ظفر کی اسیری کے ایام کی ایک نایاب تصویر

لاکھوں کی تعداد میں مسلمان علماء، دانشوروں، اشرافیہ اور پڑھے لکھے تعلیم یافتہ طبقے کو انگریزوں نے سولی پر چڑھا دیا۔ ہند کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا۔ مسلمانوں کا بنایا ہوا تمام تر انتظامی ڈھانچہ کہ جس کی مدد سے مسلمان ایک ہزار سال سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے، کو یکسر تبدیل کر دیا گیا۔ انگریزوں نے تعلیم کی تعریف ہی بدل ڈالی۔ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسا نو آبادیاتی تعلیمی نظام مسلط کیا گیا کہ جس میں انگریزوں کو حاکم تسلیم کیا گیا تھا۔ ہر وہ چیز کہ جو انگریزی تہذیب سے آتی تھی، حرف آخر کے طور پر پیش کی جاتی۔ ہندوستان کے رہنے والوں کو اس مغربی تہذیب سے بہت مرعوب کر دیا گیا تھا۔ مایوسی کا ایسا عالم تھا کہ جس کی کوئی مثال تاریخ ہندوستان کے مسلم دور میں نہیں ملتی۔ اس سے پہلے ہندوستان کے مسلمان کبھی اپنے آپکو اتنا ذلیل اور رسوا محسوس نہ کرتے تھے کہ جتنا انگریزوں کے ہندوستان پر قبضے کے بعد۔

اس دور میں صرف ہندوستان کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی مسلمان بری طرح مار کھا رہے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ ہی ٹوٹ گئی تو مایوسی در مایوسی تھی، لہذا حالت یہ تھی کہ مسلم امت میں ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی۔ کوئی امید، کوئی مستقبل مسلمانوں کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی سیاسی، معاشی اور معاشرتی طاقت مسلمانوں کے پاس نہ بچی تھی اور ساتھ ہی اخلاقی و روحانی زوال بھی آ چکا تھا۔ مسلمان مغرب سے مرعوب تو تھے ہی، تو اس عالم میں کہ جب کوئی سیاسی، مذہبی اور روحانی قیادت بھی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اقبالؒ یعنی حکیم الامت کو اس قوم کی نبض شناسی کر کے بہت دھیمے دھیمے کام کرنا تھا، کہ جو خاصا وقت طلب تھا۔ مثلاً مسلمانوں میں جو فرقہ وارانہ مسائل تھے، ان سے متعلق کہتے ہیں:

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' جو کہ اقبالؒ کی شاہکار نظمیں ہیں، میں امت کے جتنے مسائل تھے، انکی تشخیص علامہ نے کی۔ ان جیسی نظموں میں پہلی دفعہ مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ تمہاری شان، تمہارا عروج کیا تھا۔ تمہاری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے، مگر اب ''کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ''۔ تم ایک زمانے میں ایسے قلندر تھے، ایسے درویش تھے کہ پوری دنیا تمہاری ٹھوکر پر تھی۔ اب تم حکمرانوں کی چاکری اور دنیاداری میں پڑ کر رسوا ہو رہے ہو۔ تم تو شاہین شہہ لولاک ﷺ تھے!

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

دوبارہ سے اس سوئی ہوئی قوم کو دلیری، جرأت اور شجاعت کا پیغام دیا گیا۔

RADIO

اگر اس وقت کا سیاسی ماحول دیکھیں تو اس زمانے میں مسلمانوں کی قیادت تھوڑی دیر کیلئے اٹھتی اور پھر منتشر ہو جاتی تھی۔ ایک خلافت کی تحریک چلی کہ جس میں، ماشاءاللہ علی برادران نے شاندار کردار ادا کیا، لیکن یہ تحریک بھی جلد ہی دم توڑ گئی۔ مسلمانوں میں کوئی دیرپا سیاسی قیادت اٹھ ہی نہ پا رہی تھی۔ اس وقت محمد علی جناح، قائداعظمؒ نہیں بنے تھے اور کانگریس کے ایک رکن تھے۔ بہت عرصے تک وہ ہندو مسلم اتحاد کیلئے کام کرتے رہے۔ علامہ اقبالؒ پورے ہندوستان میں تلاش کرتے رہے کہ کوئی ایسا وجود مل جائے کہ جس کو مسلمانوں کی قیادت کیلئے تیار کیا جا سکے۔

....

۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے اجلاس میں، بالآخر آپ تمام غور و فکر کے بعد روحانی طور پر اس مقام پر پہنچے کہ اب ایک نیا ملک بنانا ناگزیر ہے۔ اقبالؒ نے اپنے شعر میں صاف صاف یہ بشارت دی کہ:

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ وبغداد

یعنی میں کوفہ و بغداد کی طرف نہیں دیکھ رہا، نئی بستیاں آباد کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ ان کو اشارہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں اہل نظر اب ایک نئی بستی آباد کریں گے۔ ان کی نگاہ اتنا آگے تک دیکھ رہی تھی۔

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

جو کچھ ہونے والا تھا، وہ سب اقبالؒ نے بتا دیا لیکن اس مشن کی تکمیل کیلئے ان کو ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ مفکر اور فلسفی تو یہ خود تھے ہی، اب ان کو ایک ایسا سیاسی لیڈر چاہیے تھا کہ جو مسلمانوں کی قیادت سنبھال سکے۔ اس کام کیلئے ان کی نگاہ قائداعظمؒ پر پڑی۔ قائداعظمؒ تب تک مایوس ہو کر ولایت جا چکے تھے۔ علامہ اقبالؒ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس پر لندن گئے اور قائداعظمؒ سے ملاقات کی۔ اپنے تمام تر فلسفے اور نظریات کے ساتھ قائداعظمؒ سے گھنٹوں بات چیت کی اور بالآخر قائداعظمؒ کو قائل کر کے ہندوستان واپس لے آئے، اور مسلمانوں کی قیادت ان کے حوالے کی۔ علامہ نے اپنے پورے علمی اور روحانی مقام کی طاقت قائداعظمؒ کی پشت پر کھڑی کر دی تا کہ اس عظیم مقصد کی تکمیل کیلئے قائداعظمؒ کی حفاظت و حمایت کی جا سکے۔

کانگریس اور ہندوؤں کے وفود آ کر علامہ اقبالؒ کو ورغلانے کی کوششیں کرتے کہ آپ مسلمانوں کے اتنے بڑے مفکر اور فلسفی ہیں، آپ خود کیوں نہیں لیڈر بنتے۔ اس پر علامہ اقبالؒ بھڑک کر کہتے تھے کہ مسلمانوں کے لیڈر جناح ہی ہیں اور میں ان کا ایک ادنیٰ سپاہی۔ ۱۹۳۷ء میں کہ جب پوری دنیا کے مسلمانوں نے علامہؒ کی بیماری کی خبر پھیلنے پر انہیں خطوط لکھے کہ جن میں سے اکثر میں یہ لکھا تھا کہ ہم آپ کی صحت

انقلاب

ضمیمہ

قیمت ایک پیسہ

THE DAILY INQILAB

ادارۂ تحریر
غلام رسول مہر بی اے
عبدالمجید سالک بی اے

شرح چندہ

لاہور - یوم ۔۔۔ سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق سنہ ۱۹۳۸ء

حضرت علامہ اقبال کا انتقال - ملک پر رنج و اندوہ کی گھٹائیں ۔ عالم اسلام کا آفتاب علم غروب ہو گیا

مرض الموت کی کیفیت - نماز جنازہ میں ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں کا اجتماع

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(اقبال)

اور لمبی عمر کیلئے دعا گو ہیں، تو علامہ نے جواباً تمام دنیا کے مسلمانوں کو خطوط لکھوائے کہ اب میرے لیے نہیں، جناح کیلئے دعا کریں کہ اب وہ مسلمانوں کے لیڈر رہیں۔

علامہ اقبالؒ کے انتقال کی خبر جب قائداعظمؒ کے پاس پہنچی تو اس وقت وہ کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کررہے تھے، کہ جو فلسطین کے مسئلے پر بلایا گیا تھا۔ اس جلسے کو اسی وقت ایک تعزیتی جلسے میں تبدیل کردیا گیا اور قائداعظمؒ نے پہلی مرتبہ اپنے اس تعلق کا انکشاف کیا کہ جوان کا علامہ اقبالؒ کے ساتھ تھا۔ وہاں پر انہوں نے علامہ اقبالؒ کی شان میں جو کلمات کہے وہ یہ تھے کہ اقبالؒ ایک مفکر، ایک فلسفی، ایک نظریاتی رہنما اور ایک "Seer" (پیش بیں) تھے، اور پھر آخر میں یہ بھی بتایا کہ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں، اس مقصد کیلئے میرے پیچھے جو چٹان تھی، جو روحانی وجود تھا کہ جو مجھ سے یہ کام کروا رہا تھا، کہ جس نے مجھے یہ بنادیا کہ جو میں آج ہوں، کہ جس نے مجھے محمد علی جناح سے قائداعظمؒ بنایا، وہ علامہ اقبالؒ ہی تھے۔

اقبالؒ اپنے ایک عزیز کے ساتھ

۳

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

اقبالؒ جس دور میں پیدا ہوئے، وہ مسلمانوں کی غلامی کا آخری دور تھا کہ جس کے بعد انہیں دوبارہ عروج حاصل ہونا تھا۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیئے کہ جب کبھی بھی مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا، یا ان کو سہارے کی ضرورت ہو، یا ان کا ظلمتوں سے نکل کر دوبارہ روشنی کی طرف سفر شروع ہوا ہو، تو اللہ نے کسی نہ کسی عظیم ہستی کو غیبی تائید کے طور پر ضرور بھیجا۔ یہ اللہ کی سنت رہی ہے۔ ہر مشکل دور میں ایسے بابرکت وجود آتے رہے ہیں۔ کہیں صلاح الدین ایوبیؒ کی شکل میں، کہیں مجدد الف ثانیؒ کے لباس میں، کہیں نورالدین زنگیؒ کے روپ میں تو کہیں ٹیپو سلطانؒ کی صورت میں۔ اللہ تعالیٰ نے تاریخ اسلام میں کوئی دور ایسا نہیں چھوڑا کہ جب مسلمانوں کے احیاء کیلئے اور ان کو دوبارہ زندہ کرنے کیلئے خاص بندے نہ بھیجے ہوں۔ ان کے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں وہ جرنیل کے روپ میں ہوتے ہیں، کہیں مفکر و دانشور کے شکل میں تو کہیں عالم و مجدد کی صورت میں۔ ان کی ظاہری ڈیوٹی تو مختلف ہوسکتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ سب اللہ کی روحانی تائید کا مظہر ہوتے ہیں۔

جب علامہ اقبالؒ کو دنیا میں بھیجنے کا وقت آیا تو اب اللہ تعالیٰ کو بھی فیصلہ کرنا تھا کہ اقبالؒ کی پیدائش کیلئے کس بابرکت گھرانے کا انتخاب کیا جائے، کیونکہ ایک ظاہری وجود کی بھی اس دنیا میں تربیت تو کی جاتی ہے، اس کو دی جانے والی عظیم الشان ڈیوٹی کیلئے تیار تو کیا جانا ہوتا ہے۔

کہ فطرت خودبخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

یعنی فطرت اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے حالات و واقعات کو خود ترتیب دیتی ہے، ساز باز کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اپنا کوئی مجدد، فقیر، درویش، جرنیل یا اپنا کوئی مجاہد امت کو بیدار کرنے کیلئے بھیجنا ہے، تو اسے کسی عام گھرانے میں پیدا نہیں کرتا۔ اگر آپ اس گھرانے کا پس منظر دیکھیں اور پھر اس ماحول کو مدنظر رکھیں کہ جس میں اقبالؒ کی پیدائش اور تربیت ہوئی، تو آپ پر اللہ کی یہ حکمت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

....

اقبالؒ کے والد شیخ نور محمدؒ کشمیری تھے۔ اقبالؒ اپنے والد کا تعارف کرواتے ہیں کہ وہ ایک صاحب کشف، اللہ کے ولی، درویش اور فقیر تھے۔ یعنی اقبالؒ جیسے مفکر، دانشور اور فلسفی کہ جو یورپ کو دیکھ چکے تھے اور پوری دنیا پر ان کی نگاہ تھی، کے یہ خیالات ہیں اپنے والد سے متعلق۔ اقبالؒ کو اقبال بنانے میں اس فیض کا بہت دخل ہے کہ جو انہوں نے اوائل زندگی میں اپنے والد سے حاصل کیا۔

ان کے والد خود بیان کرتے ہیں کہ اقبالؒ کی پیدائش سے پہلے انہیں اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے، کہ ان کے گھر میں کوئی غیر معمولی وجود پیدا ہونے والا ہے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ ایک بہت خوبصورت پرندہ اڑتا پھر رہا ہے اور اس پرندے کو پکڑنے کیلئے کئی ہاتھ اٹھ رہے ہیں، لیکن وہ خوبصورت پرندہ بالآخر ان کی گود میں ہی آ گرتا ہے۔ یہ ایک اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے گھر میں کوئی بہت بابرکت ہستی بھیجنے والا ہے۔ یہ واقعات اقبالؒ نے خود اپنی کتابوں میں لکھے اور اپنے دوستوں سے بیان کیے ہیں۔ جن لوگوں نے اقبالؒ کی زندگی پر کام کیا ہے، انہوں نے بھی یہ واقعات تحریر کیے ہیں۔

اقبالؒ کے گھرانے میں فقراء اور اولیاء کی محفلیں ہوا کرتی تھیں، کہ جن میں علم و حکمت، فقر اور قرآن کے اسرار و رموز کی گہرائیوں میں اترا جاتا تھا۔ اقبالؒ کی تربیت بچپن سے ہی انہی محفلوں میں ہوئی۔ اقبالؒ خود ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب وہ چھوٹے تھے، تو ایک مرتبہ رات کے وقت ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے والد کے گرد روشنی کا ایک ہالہ بنا ہوا ہے۔ ان کی والدہ چونکہ والد کی رازدار تھیں، لہٰذا وہ خاموشی سے اقبالؒ کو ایک طرف لے گئیں اور انہیں پیار سے سونے کیلئے بھیج دیا۔ صبح جب اقبالؒ اٹھے تو اس مشاہدے سے متعلق پوچھا کہ جس سے ان کے والد گزشتہ شب گزرے تھے۔ ان کے والد نے انکا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ شہر کے باہر ایک قافلہ آیا ہوا ہے اور مجھے روحانی طور پر مشاہدہ کروایا گیا ہے کہ وہاں ایک شخص بہت بیمار ہے، چنانچہ میں اسکا علاج کرنے کیلئے جانا چاہتا ہوں۔

اقبالؒ اپنے والد کے ساتھ شہر سے تیس میل دور گئے اور وہاں جا کر اس مریض کو دیکھا کہ جو لاعلاج ہو چکا تھا اور مرنے کے قریب تھا۔ شیخ نور محمدؒ نے اسکا علاج کیا، کچھ دوائیاں دیں اور گھر واپس آ گئے۔ نہ قافلے والے ان کو جانتے تھے اور نہ ہی اس سے پہلے یہ قافلے والوں سے واقف تھے۔ یہ قافلہ کابل سے آ رہا تھا۔ چند دنوں کے بعد جب وہ قافلہ شہر پہنچا تو وہ مریض صحت یاب ہو چکا تھا۔ اس کے صلے میں

اقبالؒ کے والدین

قافلے والے شیخ نور محمدؒ کو تحائف اور انعام دینا چاہتے تھے، لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔

یہ انتہائی غیر معمولی واقعہ اقبالؒ نے خود عطیہ فیضی کو سنایا تھا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر علامہ اقبالؒ قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ ان کے والد ان کے پاس سے گزرے تو پوچھا کہ بیٹا! تم قرآن میں کیا پڑھتے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ جیسے ہمارے ہاں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، میں بھی ویسے ہی کرتا ہوں۔ اس پر انہوں نے اقبالؒ کے پاس بیٹھ کر انہیں بتایا کہ بیٹا! قرآن اس طرح پڑھو کہ جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اقبالؒ نے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے جو وضاحت کی وہ انتہائی غیر معمولی تھی۔ فرمایا کہ دیکھو! یہ قرآن حضور ﷺ پر نازل ہوا۔ جب مسلمان حضور ﷺ کی محبت میں خود کو گم کرتا چلا جاتا ہے اور حضور ﷺ سے اسکا تعلق بڑھنے لگتا ہے، تو پھر یہ قرآن بھی اس شخص پر اپنے راز اسی طرح کھولنا شروع کر دیتا ہے کہ جیسے یہ اس پر نازل ہو رہا ہو۔ قرآن ہر دور میں اپنے راز کھولتا ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ قرآن میں ڈوب جاؤ، تمہارا کام یہ ہے کہ حضور ﷺ کی محبت میں گم ہو جاؤ۔ جتنا تمہارا حضور ﷺ سے تعلق بڑھے گا، اتنا ہی یہ قرآن تم پر اپنے راز کھولنے لگے گا۔

....

تین نکات تھے کہ جن کے فہم اور ان پر عمل نے اقبالؒ کو بدل کر رکھ دیا۔ پہلا حضور ﷺ سے نسبت، تعلق اور عشق، دوسرا قرآن سے تعلق، اور تیسرا دین کی خدمت۔ حکمت کے یہ تینوں راز اقبالؒ نے اپنے والد سے سیکھے۔

ایک مرتبہ، ان دنوں جب اقبالؒ اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے، اقبالؒ کے والد نے ان سے کہا کہ بیٹا! میں نے تمہاری تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ پیسہ خرچ کیا ہے اور محنت کی ہے، لیکن ایک قرض ہے کہ جو تم پر واجب ہے، وہ تم ادا کر دینا۔ اقبالؒ ذرا حیران ہوئے کہ وہ کونسا قرض ہے کہ جو انہیں ادا کرنا ہے۔ ان کے والد فرمانے لگے کہ جو قرض تمہارے اوپر ہے، وہ یہ ہے کہ تمہیں اب دین کی خدمت کرنی ہے، اپنی ساری زندگی اللہ کے دین کیلئے وقف کرنی ہے۔

یہ بنیادی اصول یعنی حضور ﷺ سے عشق، نسبت اور تعلق، قرآن سے تعلق، اور دین کی خدمت، یہ تینوں باتیں ہی اقبالؒ کے والد نے کم عمری میں ہی ان کے ذہن میں جاگزیں کر دیں تھیں۔ اقبالؒ کے والد کے حضور ﷺ سے عشق اور نسبت کے کچھ انتہائی غیر معمولی واقعات ہیں کہ جو اقبالؒ کے بچپن سے متعلق ہیں۔

ایک دفعہ گھر میں کوئی سائل آیا کہ جسے اقبالؒ نے سختی سے جھڑک دیا۔ اس پر ان کے والد بے چین ہو گئے اور تقریباً روتے ہوئے اقبالؒ کو ایک طرف لے گئے اور بولے کہ بیٹا! مجھے اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے آگے رسوا نہ کرنا۔ قیامت کے دن جب انبیاءؑ، شہداء، صدیقین، صالحین اور ان کے علاوہ فاسق و فاجر بھی جمع ہوں گے، تو اس دن اللہ کے رسول ﷺ مجھ سے یہ سوال کریں گے کہ یہ بچہ اللہ نے تمہیں دیا تھا تا کہ تم اس کی تربیت کرو اور اسے اللہ کے دین کی خدمت کیلئے تیار کرو۔ اگر تم اسی طرح سے معاملات کرو گے تو مجھے اللہ کے

رسول ﷺ کے سامنے رسوا ہونا پڑے گا۔ اپنے والد کی اس بات پر اقبالؒ ہل کر رہ گئے۔ ایک چھوٹے سے بچے کو پہلی دفعہ یہ سبق ملا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے سرخرو ہونا یا رسوا ہونا کیا معنی رکھتا ہے! پھر اس کے بعد ساری زندگی کیلئے ہی اقبالؒ کی سوچ اور فکر کا محور و مرکز ہی تبدیل ہو گیا۔

....

اقبالؒ نے جو معرکتہ آلاراء شاعری کی ہے، اس میں آپکو یہ پہلو بار بار نظر آتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ حضور ﷺ کے آگے ان کو شرمندہ ہونا پڑے۔ ان کے وہ خوبصورت ترین اشعار کہ جن میں وہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ ﷺ پنہاں بگیر

یا اللہ! تو دو عالم سے غنی ہے۔ میں ایک فقیر، مسکین اور عاجز بندہ ہوں۔ اگر تو روز محشر یہ دیکھے کہ میرا حساب لینا لازم ہی ہے، تو کم از کم نگاہ مصطفیٰ ﷺ سے چھپا کر میرا حساب لینا۔

اقبالؒ کے والد نے اس واقعے کے ذریعے ان کے ذہن میں حضور ﷺ کے آگے سرخروئی کا تصور بہت شدت سے داخل کر دیا تھا اور پھر ساری زندگی اقبالؒ پر اسی احساس کا غلبہ رہا۔ جب لوگوں نے اقبالؒ کی ذات اور ان کے کام پر شدید قسم کے اعتراضات کیے کہ آپ اسلام کے علاوہ کسی اور مقصد کی خدمت کر رہے ہیں تو اس وقت بھی اقبالؒ نے جواباً ایک ایسا چیلنج دیا کہ جو امت مسلمہ کی تاریخ میں کسی اور مفکر، عالم یا دانشور کی طرف سے نہیں دیا گیا۔ اتنا بڑا چیلنج کہ جس نے ان کے مخالفین کو لاجواب کر کے رکھ دیا۔ براہ راست حضور ﷺ کو مخاطب کر کے اقبالؒ نے اپنے حق میں دعا (یا بددعا) کی اور فرمایا کہ:

پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیابان را ز خادم پاک کن

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہء پا کن مرا

اگر میں نے اس پورے مشن میں آپ ﷺ کے دین اور قرآن پاک کے علاوہ کسی اور چیز کی نمائندگی کی ہو تو آپ میری فکر کا پردہ چاک کر دیجیئے۔ اپنے چمن سے مجھ جیسے کانٹے کو نکال کر باہر پھینک دیجیئے اور قیامت کے روز مجھے ذلیل و رسوا کر کے اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیئے گا۔

مخالفین کو اتنا بڑا چیلنج! اس بات پر اتنا یقین کہ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، میری زندگی کا جو بھی مشن ہے، اور میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے دین کی سرفرازی کے لیے ہے۔ یہ چیلنج کائنات میں آج تک کوئی مسلمان عالم، دانشور یا مفکر اپنے مشن کے حوالے سے نہیں دے سکا۔ لیکن علامہ اقبالؒ کو اللہ کے رسول ﷺ پر جو اعتماد اور یقین تھا، اس کی بنیاد اسی وقت پڑ چکی تھی کہ جب ان کے والد نے ان سے کہا تھا کہ بیٹا روزِ محشر رسول اللہ ﷺ کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا۔

اس کے بعد سے اقبالؒ کی فکر کا مرکز ہی حضور ﷺ کی ذات مبارکہ بن گئی تھی۔

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

....

مسلمان نوجوانوں کو آپ نے شاہین شہہ لولاک ﷺ کہا ہے۔ شہہ لولاک حضور ﷺ کا خطاب ہے۔

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس اپنے چیلوں اور مریدوں کو جو آخری نصیحت کرتا ہے وہ یہ ہے:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

یعنی اپنی قوم کو اقبالؒ یہ نصیحت کرتے ہیں کہ ابلیس کی آخری چال یہی ہوگی کہ ایک مسلمان کا حضور ﷺ سے تعلق توڑ دیا جائے۔

اقبالؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:

بمصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

حضور ﷺ کا قرب حاصل کرو کہ تمہارا اصل دین وہی ہیں۔ اگر تم اپنے اعمال کے نتیجے میں حضور ﷺ کا قرب اور زیارت حاصل نہ کرسکو تو باقی جو کچھ بھی تم کر رہے ہو، وہ ''بولہبی'' ہے۔

اس بات میں ایک خاص روحانی جہت ہے۔ یہاں وہ انسان کے مقصد حیات اور اسکی ذمہ داری میں کہ جو اسے اس دنیا میں دی جاتی ہے، فرق کرتے ہیں۔ ہر مسلمان کا مقصد حیات تو ایک ہی ہے کہ وہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے ایک ایسا تعلق رکھے کہ اس کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کوئی حجاب باقی نہ رہے۔ لیکن دنیا میں ذمہ داری ہر ایک کی مختلف ہوسکتی ہے، کسی کی دانشور کی ڈیوٹی ہوتی ہے، کسی کی جرنیل کی اور کسی کی بادشاہ وقت کی۔ علامہ اقبالؒ کے ان تصورات کی بنیاد وہیں سے پڑتی ہے کہ جب ان کے والد شیخ نور محمدؒ

حضور ﷺ ،قرآن پاک اور اسلام کی روح ان کے وجود میں کوٹ کوٹ کر بھرتے ہیں۔

....

جیسا کہ پہلے بھی ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ''اسرار خودی'' اقبالؒ سے ان کے والد نے لکھوائی تھی۔ اقبالؒ کے والد ایک درویش، ایک فقیر تھے اور اقبالؒ کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے سامنے کچھ کہہ سکیں۔ جب اقبالؒ کے دوستوں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کے والد نے اس کتاب کو پسند فرمایا، تو اقبالؒ نے کہا کہ میرے والد اس کاوش پر صرف مسکرا دیئے، یہ مسکرانا ہی میرے لیے بہت بڑی سند اور دلیل تھی کہ میرے والد نے اسے قبول کر لیا ہے۔

....

اسی طرح اقبالؒ کی والدہ بھی ایک غیر معمولی درویش اور فقیر خاتون تھیں۔ انکے فقر اور درویشی کا اس بات سے اندازہ کیجیئے کہ اقبالؒ کی والدہ کو ایک مرتبہ صرف شک ہو گیا کہ اقبالؒ کے والد جہاں نوکری کر رہے ہیں، اسکی کمائی شاید حلال نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؒ کے والد حرام تو نہیں کما سکتے تھے، مگر اقبالؒ کی والدہ کو شک تھا کہ جس شخص کے ہاں وہ کپڑے سینے کا کام کرتے تھے، اس شخص کا رزق، انگریز کی ملازمت کے باعث، شاید ٹھیک نہیں ہے۔ اس وقت اقبالؒ ایک شیر خوار بچے تھے۔ ان کی والدہ نے انکو گھر سے کھلانا پلانا بند کر دیا، حتیٰ کہ اپنا دودھ پلانا بھی چھوڑ دیا۔ اپنے زیور بیچ کر ان حلال پیسوں سے ایک بکری خرید کر لائیں اور اس کے دودھ پر اقبالؒ کو پالنا شروع کر دیا تاکہ کوئی مشکوک رزق بھی اقبالؒ کے منہ میں نہ جائے۔ پھر اقبالؒ کے والد نے بڑی منت سماجت کر کے ان کو سمجھایا کہ میرا رزق حلال ہے۔ جب ان کی والدہ کو تسلی ہو گئی تو پھر دوبارہ اپنے شوہر کی کمائی سے اقبالؒ کو کھلانا پلانا شروع کر دیا۔

....

جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو غیر معمولی کام لینے ہوتے ہیں، ان کی اٹھان شروع ہی سے نظر آ جاتی ہے۔ اقبالؒ کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے والدین کو بشارتیں مل چکی تھیں۔ ان کے گھر کے ماحول میں اقبالؒ جیسا شاہین ہی پیدا ہو سکتا تھا۔

اقبالؒ کو پوری دنیا دیکھنی تھی۔ انہیں ہر معاشرے، تہذیب اور اخلاقی نظام کو پرکھنا تھا۔ لیکن انکی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ اس کے بعد کفر کا مغربی نظام، اس وقت کی جغرافیائی سیاست، معیشت، معاشرتی نظام، غرضیکہ کسی چیز نے بھی اقبالؒ کے کردار کو آلودہ نہیں کیا۔ وہ ساری زندگی نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز ہی رہے۔ فطرت نے لالے کی حنا بندی بہت پہلے ہی شروع کر دی تھی۔

اقبالؒ کا حضورﷺ کے ساتھ جو روحانی تعلق تھا، وہ اتنا غیر معمولی تھا کہ یہ ایک ولی کامل کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔ حضورﷺ کا اسم مبارک جب بھی اقبالؒ کے سامنے آتا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ نوجوانی میں جب وہ تعلیم کی غرض سے یورپ گئے، تو یمن کے پاس سے گزرتے ہوئے سرزمین عرب نظر آئی۔ اقبالؒ کے جذبات میں طلاطم برپا ہوگیا اور اس وقت انہوں نے نہایت ہی خوبصورت کلمات میں اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ کاش میرا وجود اس خاک میں مل جائے کہ جہاں حضورﷺ آرام فرما رہے ہیں اور ہوا اس وجود کے ذرے اڑاتی پھرے۔

....

اقبالؒ کو اقبال کس نے بنایا؟ یہ سوال صرف ہم لوگ ہی نہیں کر رہے۔ اس سے پہلے بھی کئی دانشور یہ سوچتے رہے ہیں۔ اکبرالہ آبادی نے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا کہ:

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کی طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی، یہ ذوق معرفت
یہ طریق دوستی، خودداری با تمکنت!
اسکی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
با خدا تھے، اہل دل تھے، صاحب اسرار تھے

علامہ اقبالؒ کی جو شخصیت اور خوبیاں ہیں، وہ اس بات پر گواہ ہیں کہ ان کے والدین کیسے غیر معمولی لوگ تھے۔ یقیناً وہ باخدا، اہل دل اور صاحب اسرار لوگ تھے۔ اقبالؒ جن پراسرار بندوں کا ذکر کرتے ہیں ان میں اقبالؒ خود بھی شامل ہیں۔

....

اسی طرح اقبالؒ نے حضورﷺ کی شان میں جو خوبصورت نعتیں اور کلمات کہے ہیں، انکے ہم چند اشعار رقم کرنا چاہیں گے۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کلﷺ جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

غازی علم دین شہیدؒ
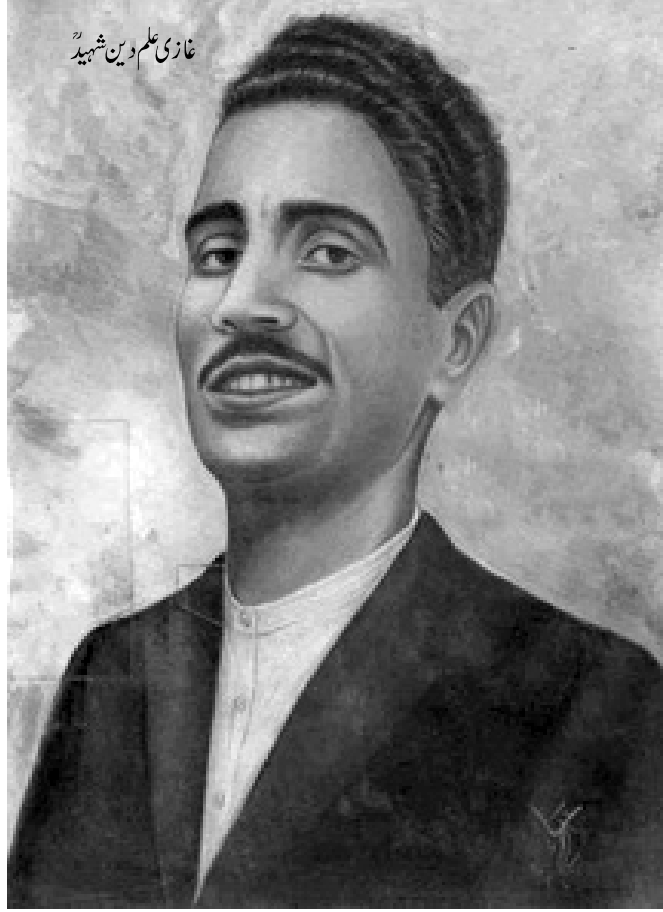
اقبالؒ کی حضور ﷺ سے ایک جذباتی وابستگی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ ایک رئیس، ایک سیٹھ نے ان کو کسی مقدمے کے سلسلے میں مشورے کیلئے بلوایا۔ علامہ اقبالؒ جب اس کے گھر پہنچے تو اس نے بہت ہی خوبصورت سجے ہوئے کمرے میں اقبالؒ کو ٹھہرایا۔ اقبالؒ جب رات سونے کیلئے بستر پر لیٹے تو بے اختیار یہ خیال آیا کہ حضور ﷺ کے صدقے تو ہمیں یہ مقام ملا ہے، مگر سیدی ﷺ نے تو اپنی تمام عمر مبارک فقر اور تنگ دستی میں گزار دی۔ یہ خیال آتے ہی اقبالؒ بے چین ہوگئے، اور اس پر تعیش کمرے میں سونا ناممکن ہوگیا۔ اپنا بستر اور تکیہ اٹھا کر غسل خانے میں چلے گئے اور زمین پر ڈال کر رات وہیں گزار دی۔ یہ تعلق تھا اقبالؒ کا حضور ﷺ سے!

دوسری طرف علامہ اقبالؒ نے اس خواہش کا ذکر بھی اپنے دوستوں سے کیا تھا کہ میں نہیں چاہتا کہ میری عمر حضور ﷺ سے زیادہ ہوجائے۔ ظاہری طور پر حضور ﷺ نے ۶۳ سال کی زندگی گزاری، اور اقبالؒ بھی لگ بھگ اسی عمر میں دنیا سے تشریف لے گئے۔

عشق رسول ﷺ اقبالؒ کے وجود میں خون کے ساتھ سرایت کر چکا تھا۔ دو مجاہد کہ جنہوں نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں کو جہنم رسید کیا، غازی عبدالقیومؒ اور غازی علم دین شہیدؒ، اقبالؒ نے انکی شان میں کئی اشعار کہے۔ لوگ جب اقبالؒ کے پاس یہ کہنے کیلئے آئے کہ کس طرح ان دونوں کو راضی کیا جائے کہ یہ اپنے جرم سے انکار کردیں تو اقبالؒ نے ان لوگوں کو منع کیا کہ وہ دونوں شہادت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو کیوں مجبور کررہے ہو کہ وہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچالیں! غازی علم دین شہیدؒ کے بارے میں تو انہوں نے پنجابی میں یہ بھی کہا کہ ''اسی گلاں ای کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا''۔ یعنی بڑھیوں کا بیٹا بازی لے گیا اور ہم باتیں ہی کرتے رہ گئے!

....

کیا اقبالؒ خود بھی صاحب کشف بزرگ تھے؟ آپکے وجود میں بھی کوئی غیر معمولی قوتیں تھیں؟ کئی دفعہ وہ خود بھی اپنے دوستوں سے حتیٰ کہ اپنے والد سے بھی ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھے اپنے وجود میں ایسی کئی غیر معمولی قوتوں کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرماتے کہ میں اپنی بشری کمزوریوں سے بھی پوری طرح واقف ہوں، فقط ایک بندہ بشر ہوں کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل و کرم کیا ہوا

ہے، مجھے اپنے بارے میں قطعاً کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کو امت مسلمہ کے حوالے سے ایک روحانی ڈیوٹی دے دی گئی تھی۔ان پر آمد ہوتی تھی، نزول ہوتا تھا۔

....

ایک مرتبہ ایک انگریز پروفیسر نے آپ سے سوال کیا کہ آپ اتنے پڑھے لکھے آدمی ہیں، کیا آپ بھی سمجھتے ہیں کہ حضورﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی؟ تو علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ہاں حضورﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی! مجھ پر بھی پورے پورے شعر نازل ہوتے ہیں۔ جب یہ کیفیت مجھ پر طاری ہوسکتی ہے، جب میں ان نزول کے تجربات سے گزرتا ہوں، تو مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ میرے آقاﷺ پر بھی الہامی طور پر قرآن پاک نازل ہوا تھا۔اقبالؒ نے اپنی اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کھڑے کھڑے جانے کتنے شعر بیان کردیئے۔ انگریز پروفیسر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

لوگوں نے جب ان سے کہا کہ آپ ایسا غیر معمولی کلام کیونکر کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا:

نکلی تو لب اقبال سے ہے ، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

....

ایک مرتبہ سکول کے کچھ بچے ان سے ملنے کیلئے آئے تو اقبالؒ دھوتی بنیان میں اپنے گھر کے آنگن میں چارپائی پر لیٹے حقہ پی رہے تھے۔ ایک طالبعلم نے ان سے کہا کہ ہم ڈاکٹر اقبالؒ سے ملنے آئے ہیں۔تو اقبالؒ اس کو بڑے پیار سے کہتے ہیں کہ اگر اقبال ملے تو اس کو میرا سلام کہنا، میں بھی اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔

اسی حوالے سے انہوں نے یہ شعر بھی کہا:

اقبال بھی ''اقبال'' سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

یہ باتیں صاحب دل اور محرم راز لوگ ہی جانتے ہیں۔ والدین، قرآن پاک، حضورﷺ سے خاص روحانی تعلق اور اپنے گھر کے ماحول کے علاوہ جن بڑے بڑے افراد، اکابرین اور اساتذہ نے اقبالؒ پر اثرات مرتب کیے، ان میں مولوی میر حسنؒ کا نام نمایاں ہے۔شروع میں تو اس زمانے کے رواج کے مطابق علامہ اقبالؒ کو مکتب میں داخل کیا گیا۔لیکن مکتب سے مولوی میر حسنؒ ان کو اپنے مدرسے لے گئے۔ایک غیر معمولی درویش، عالم دین، فقیر اور ایک ایسے صاحب نظر استاد کہ جن کے ساتھ اقبالؒ کا اتنا ادب اور محبت کا تعلق قائم ہوگیا
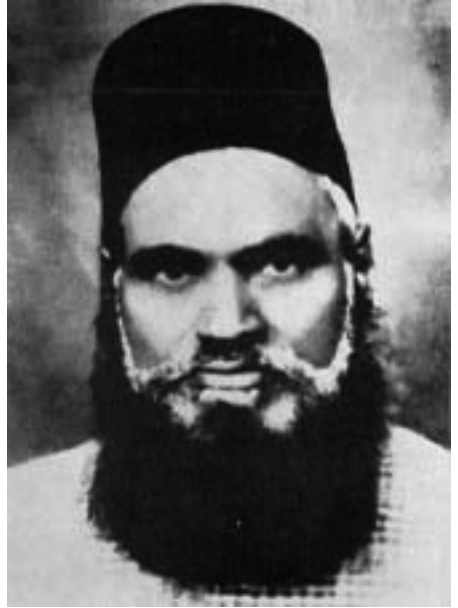
مولوی میر حسنؒ

تھا کہ جب اقبالؒ باہر سے پڑھ لکھ کر، عالم فاضل اور پروفیسر بن کر طویل عرصے بعد وطن واپس لوٹے تو ایک مرتبہ بازار میں بیٹھ کر حقہ پی رہے تھے کہ مولوی میر حسنؒ سامنے سے گزرے۔ اقبالؒ بے چینی سے اٹھ کر ان کی خدمت کیلئے بھاگے۔ اسی فکر میں ان کے ایک پاؤں سے جوتا بھی اتر گیا اور پھر دنیا نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ اقبالؒ ہاتھ باندھ کر اپنے استاد کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں، اس طرح کہ ایک پاؤں میں جوتا ہے اور ایک پاؤں میں نہیں، اور اسی طرح استاد کو باعزت طریقے سے گھر پہنچا کر واپس لوٹے۔

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

اقبالؒ کی ساری زندگی میں جو چیز آپکو واضح طور پر نظر آئے گی، وہ ہے ادب۔ حضورﷺ کا ادب، قرآن کا ادب، والدین کا ادب، اساتذہ کا ادب، اپنے دین کا ادب اور سب سے بڑھ کر اپنی خودداری اور عزت نفس کا ادب۔

....

اقبالؒ کے بچپن کے چند واقعات آپکو بتاتے ہیں، اس سے آپکو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ اقبالؒ صرف ایک خشک مزاج فلسفی ہی نہیں تھے بلکہ ان میں ظرافت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور ان کی حس مزاح بھی بہت غیر معمولی تھی۔ وہ بہت حاضر جواب بھی تھے۔

بچپن میں انہیں کبوتروں اور بٹیروں سے کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن مدرسے میں بٹیر بھی ساتھ لے آئے۔ مولوی میر حسنؒ نے بڑے پیار سے پوچھا کہ اقبال! تم کو بٹیر سے کھیلنے میں کیا مزہ آتا ہے؟ جواباً اقبالؒ نے بٹیر استاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ بھی کھیل کر دیکھ لیجیئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ اقبالؒ ذرا دیر سے مدرسے پہنچے۔ استاد نے پوچھا کہ اقبالؒ دیر سے کیوں آئے ہو؟ کہتے ہیں: ''حضرت! اقبال تو دیر سے ہی آتا ہے۔'' یہاں اقبال سے ان کی مراد بلندی اور عروج تھا۔ ان کی حاضر جوابی غیر معمولی تھی۔

ایک موقع پر انہوں نے لفظ ''غلط'' کو ''ط'' کی بجائے ''ت'' سے لکھ دیا۔ یعنی ''غلت''۔ یقیناً اس وقت ان کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوگی۔ استاد نے اقبالؒ سے کہا کہ ''غلط'' کو صحیح کرو۔ اقبالؒ استاد سے بڑے پیار سے کہتے ہیں کہ اقبالؒ کبھی غلط کو صحیح نہیں کرے گا، غلط ہمیشہ غلط ہی رہے گا۔ ان کی حاضر جوابی دیکھیئے۔ دیکھنے والوں کو نظر آ رہا تھا کہ یہ وجود آگے جا کر یقیناً کوئی غیر معمولی فرض انجام دے گا۔

اسی طرح ایک مرتبہ اقبالؒ اپنے استاد مولوی میر حسنؒ کے ساتھ باہر نکلے۔ مولوی صاحب کا ایک بھانجا یا بھتیجا تھا، جسکا نام احسان تھا۔ مولوی صاحب نے احسان کو اقبالؒ کی گود میں دے دیا۔ اقبالؒ خود بھی اس وقت چھوٹے ہی تھے۔ جلد ہی ان کو یہ بچہ بہت بھاری لگنے لگا۔ وہ تھوڑی دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ استاد نے مڑ کر پوچھا: ''اقبال! آتے کیوں نہیں؟'' تو اقبالؒ بڑے پیار سے بولے: ''استاد! آپکا یہ احسان بہت بھاری ہے''۔

اسکے علاوہ کچھ بڑے بڑے نام کہ جن کا ہم یہاں ذکر کرنا چاہیں گے، خاص طور پر مولانا جلال الدین رومیؒ۔ علامہ اقبالؒ اپنے آپکو مرید ہندی اور جلال الدین رومیؒ کو پیر رومی کہتے ہیں۔ دونوں کا آپس میں گہرا روحانی تعلق تھا، اس بات کے باوجود کہ دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اس تعلق کے اعتراف میں آج ترکی میں، مولانا جلال الدین رومیؒ کی قبر کے پاس، اقبالؒ کی ایک علامتی قبر بنائی گئی ہے۔ اس کے کتبے پر ترکوں نے یہ لکھا ہے کہ جس کا مفہوم ہے: ''شاعر ملی پاکستان'' کہ جن کا مولانا جلال الدین رومیؒ کے ساتھ روحانی تعلق تھا، ہم ان کے ادب واحترام اور انکی یاد میں ایک قبر یہاں بناتے ہیں۔

اقبالؒ نے اپنے روحانی مرشد مولانا جلال الدین رومیؒ کی شان میں جو خوبصورت اشعار کہے ہیں، ان میں سے دو شعر یہ ہیں۔

مرشد رومی حکیم پاک ذات
سر مرگ و زندگی برما کشاد
پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبار جلوہ ہا تعمیر کرد

PAKİSTAN'IN MİLLÎ ŞAİR VE DÜŞÜNÜRÜ
MUHAMMED İKBAL'E. AZİZ MÜRŞİDİ
HAZRET-İ MEVLÂNA'NIN HUZURUNDA
BU MAKAM VERİLDİ. 1965

MUHAMMED İKBAL

1873 — 1938

یعنی مرشد رومی ایک حکیم، پاک ذات ہیں کہ جن سے میں نے زندگی اور موت کے اسرار رموز کو سیکھا، یعنی زندگی کے عروج و زوال اور ابدی حقیقتوں سے آشنا ہوا۔ میری خاک کو اس پیر نے اکسیر بنادیا۔

اقبالؒ اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ان کا جلال الدین رومیؒ کے ساتھ ایک گہرا روحانی تعلق تھا۔

جن لوگوں کے ساتھ آپکا خاص قلبی تعلق ہوتا ہے، وہ اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ آپ ان جیسے ہوتے ہیں ۔ انگریزی میں کہتے ہیں، "birds of feather flock together" یعنی وہ افراد کہ جو ایک مزاج کے ہوتے ہیں، ان کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے، چاہے وہ ظاہری تعلق ہو یا علمی و روحانی۔

....

اسی طرح اقبالؒ کے وجود پر جن بڑے بڑے لوگوں نے اثر ڈالا، ان میں حضرت مجدد الف ثانیؒ بھی شامل ہیں کہ جن کا اقبالؒ نے اپنے کلام میں ذکر بھی کیا اور ان کو اسلام کا پاسبان اور دین کا محافظ قرار دیا۔ ان کے مزار پر حاضریاں بھی دیں۔ اپنے بیٹے جاوید اقبال کو بھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے ساتھ لیکر گئے۔

اسی طرح اقبالؒ کے کلام میں آپکو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی شان میں بھی کثرت سے عقیدت و پیار کا اظہار ملے گا، حتیٰ کہ جب اقبالؒ تعلیم کی غرض سے ولایت جا رہے تھے تو، جانے سے پہلے، آپ نے جن مزاروں پر حاضری دی، ان میں سے ایک حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا مزار بھی تھا۔ انہوں نے اس تعلق کا اظہار بغیر کسی تکلف کے کیا، اور انتہائی خوبصورت الفاظ میں اپنے کلام میں بھی اسکو بیان کیا۔ ان کے مزار پر حاضری کے وقت یہ دعا اقبالؒ کے لبوں سے نکلی:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

ان بزرگ ہستیوں کے علاوہ علامہ جن شمشیر بکف مسلم مجاہدین سے متاثر تھے، ان میں ایک نام ٹیپو سلطانؒ کا بھی ہے۔ یہ اشعار ٹیپو سلطانؒ سے ہی متاثر ہو کر لکھے گئے:

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

اسی طرح شرقپور شریف میں حضرت شیر محمد شرقپوریؒ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ اقبالؒ ان کے پاس حاضری دیا کرتے اور ان سے بہت فیض لیا کرتے تھے۔

اب تک کا جو پس منظر ہم نے دیا ہے، اس میں اقبالؒ کی شخصیت دیکھیئے تو روحانیت، حضورﷺ سے عشق و تعلق، قرآن سے نسبت، رزق حلال، اساتذہ کا ادب، یہ سب انہیں گھر سے ہی مل رہا تھا۔ ان کے والدین غیر معمولی وجود تھے۔ والد صاحب صاحب، کشف و کرامت فقیر اور درویش۔ والدہ ایسی ولیہ کہ ان کی مثال دینا ممکن نہ ہو۔ استاد ہیں تو مولوی میر حسنؒ جیسے۔ اور روحانی فیض لے رہے ہیں تو مولانا جلال الدین رومیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ جیسے بزرگوں سے۔ مگر ساتھ ساتھ ان کے وجود میں ایک شاہین بھی بستا تھا کہ جو اقبال کی شخصیت کی ایک اور غیر معمولی جہت تھی۔ وہی شاہین کہ جو سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمود غزنویؒ اور ٹیپو سلطانؒ کے وجودوں میں بھی بستا تھا۔ ہم اقبالؒ کے وجود میں یہ حیرت انگیز امتزاج دیکھتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کے وجود میں روحانیت کا اثر و نفوذ ہے تو دوسری طرف ان میں ایک ایسا مرد آہن مجاہد بھی بستا ہے کہ جو نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہے، جو محفل یاراں میں ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں فولاد ہوتا ہے۔ اقبالؒ کی ذات میں یہ تمام تضادات ایک توازن میں ملتے ہیں، کہ جو ایک انتہائی غیر معمولی بات ہے!

ان کی جانب سے بار بار جو پیغام ہمیں ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کسی سے اپنے دین کا کام لے گا تو وہ ظاہر میں اردشیر ہوگا، یعنی وہ ایک طاقتور بادشاہ ہوگا اور اس کے پاس سیاسی و عسکری قوت بھی ہوگی، اور باطن میں وہ جنید بغدادی ہوگا، یعنی اس کے وجود میں روحانی پہلو بھی کمال درجہ پر ملے گا۔ ''آمریت رحمانی و روحانی'' کا یہ حیرت انگیز تصور اقبالؒ نے ہی دیا ہے۔

اقبال کی زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ کئی چشمے تھے کہ جن سے اقبالؒ بیک وقت فیض حاصل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اقبالؒ کے انگریز استاد پروفیسر آرنلڈ بھی تھے کہ جنہوں نے لاہور میں بھی اقبالؒ کو تعلیم و تربیت دی اور جو بعد میں اقبالؒ کے گہرے دوست بھی بن گئے اور ایک طویل عرصے تک اقبالؒ کے ان سے گہرے مراسم رہے۔ جب اقبالؒ انگلینڈ گئے تو وہاں بھی پروفیسر آرنلڈ نے ان کو بہت عزت دی۔ وہ خود بھی ایک نیک وجود تھے اور انکو اقبالؒ سے بے پناہ عقیدت ہوگئی تھی۔

اسکے علاوہ ۱۹۰۵ء یا ۱۹۰۶ء میں اقبالؒ جب جرمنی گئے تو وہاں ان کی ملاقاتیں کئی ایسے افراد سے ہوئیں کہ جن کی مختلف معاشروں پر گہری نگاہ تھی۔ ان میں سے ایک عطیہ فیضی بھی تھیں، کہ جن سے اقبالؒ کی طویل عرصے تک بہت مودب صحبت اور خط و کتابت رہی اور آپس میں علمی و قلبی تعلق قائم رہا۔ وہ اقبالؒ کیلیئے ایک اچھے مشیر کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ عطیہ فیضی ہی تھیں کہ جنہوں نے اقبالؒ کو شاعری ترک کرنے کے ارادے سے باز رکھا، ورنہ ایک وقت میں اقبالؒ شاعری ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے۔

اقبالؒ نے مغرب کے پورے معاشرے کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ پورے یورپ کا سفر کیا۔ اس کی تہذیب و تمدن کو دیکھا، مگر اپنے آپکو اس کی نجاستوں سے بچائے رکھا۔ ایک طویل عمر اس معاشرے میں گزار کر بھی کبھی شراب نوشی نہیں کی، کبھی بدکاری میں نہیں پڑے۔ اپنے اشعار میں وہ اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ ''مانند سحر'' ان کی جوانی پاکیزہ رہی، حالانکہ اس معاشرے و تہذیب و تمدن کو

انہوں نے بہت قریب سے دیکھا، وہاں کی محفلوں میں بھی شامل ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقصد کیلئے تیار کیا تھا کہ وہ مشرق اور مغرب کے تضادات کو واضح کریں۔ مغرب کو دیکھ کر اس کی ایک ایک کمزوری کو ابھار کر مسلمانوں کو دکھائیں اور امت مسلمہ کو بیدار کریں۔ تو ایک حکیم کی حیثیت سے ان کیلئے جو مشاہدات ضروری تھے، وہ فطرت نے خود کرائے۔

ان کو پوری دنیا دکھائی گئی کہ جس میں ان کے ظاہری سفر بھی شامل ہیں اور روحانی بھی۔ اپنی عہد کی بڑی بڑی ہستیوں سے بھی ان کے ظاہری تعلقات تھے اور ماضی کے بڑے بڑے بزرگوں سے بھی انہیں روحانی فیض حاصل تھا۔

....

آج بھی کوئی شخص اگر اقبالؒ کے پیغام سے فیض لینا چاہتا ہے تو اسے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہوگا۔ ان بظاہر تضادات کے توازن کو سمجھنا ہوگا۔ ہماری تمام مسلمان تحریکیں، جماعتیں اور وہ افراد کہ جو دین کی سربلندی کیلئے کوئی کام کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ روحانی پہلو کو چھوڑ کر صرف دنیاوی حکمت عملی پر کام کریں گے تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ جیسے ہوائی جہاز کو ایک پر سے اڑانے کی کوشش کی جائے۔

اقبالؒ پر جب ہندوؤں کی حقیقت واضح ہوئی اور انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ اب ہندوؤں کے ساتھ رہنا ممکن نہیں، تو اقبالؒ نے مسلمانوں کو اپنی عزت و آبرو کے دفاع کیلئے ہتھیار اٹھانے کا بھی حکم دیا۔

اپنی زندگی کے آخری سالوں میں علامہ اقبالؒ جہاد بالسیف کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے چند دوستوں سے بھی اس خواہش کا اظہار کیا۔ اس کے علاوہ آپ کو حج کرنے کی بھی شدید آرزو تھی کہ جو پوری نہ ہو سکی۔ اقبالؒ کے دوستوں نے کئی دفعہ ان سے کہا کہ آپ یورپ جاتے ہیں اور دیگر مقامات کا سفر کرتے ہیں، لیکن مدینہ کیوں نہیں جاتے؟ یہ بات سنتے ہی اقبالؒ رونے لگتے اور کہتے کہ کیا میں اس قابل ہوں کہ حضور ﷺ کے پاس جا سکوں؟ مجھے ان کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

یہ بھی ایک عجیب روحانی کیفیت تھی۔ یہ عشق و مستی اور ادب کا ایک ایسا مقام ہے، کہ جس کو لوگ شاید عقلی سطح پر نہ سمجھ پائیں۔ حضور ﷺ کا اسم مبارک آتا تو اقبالؒ کے آنسو جاری ہو جاتے۔ ان کا خود پر قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا۔ اسی ادب کے مارے وہ کبھی بھی رسول ﷺ کے

سامنے جانے کی ہمت نہ کر پائے۔لیکن آخری عمر میں ان کی شدید خواہش ضرور تھی کہ وہ حج کر لیں۔

علامہ اقبالؒ جس غیر معمولی عمل سے گزرے ہیں،اس پر لوگوں نے اعتراضات بھی کیے۔ان میں بشری کمزوریاں بھی تھیں۔انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مجھ میں بشری کمزوریاں نہ ہوتیں تو میں خود کو ایک مافوق الفطرت مخلوق سمجھنے لگتا۔

ارسطو کہتا ہے کہ اگر تم اچھی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو شادی کر لو۔تمہیں اگر اچھی بیوی ملی تو تمہاری زندگی بہت خوبصورت گزرے گی،اگر تمہیں تمہاری پسند کی بیوی نہ ملی تو تم فلسفی تو بن ہی جاؤ گے۔اقبالؒ کے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا کہ انہوں نے بھی تین شادیاں کیں اور وہ شاید اپنی شادیوں سے اتنے راضی نہیں تھے،جبھی اتنے بڑے مفکر اور فلسفی بن پائے۔

ان کی خانگی زندگی ابتداء سے ہی بحران کا شکار رہی،کہ جو بہت بعد میں جا کر کہیں مستحکم ہوئی۔ان کی زندگی میں بہت سے طوفان بھی آئے۔اتنے بڑے فلسفی کو کہ جو آنے والے وقت کی تصویر دیکھ رہا تھا،اپنے گھر میں شدید مسائل سے گزرنا پڑا۔

ان تمام خانگی مسائل کے باوجود اقبالؒ نے اپنی عظیم روحانی فکر کی سمت متعین رکھی،وہ فکر کہ جس نے اقبالؒ کو ''اقبال پراسرار'' بنا دیا۔اقبالؒ کا پیغام اسلام کے اقبال کا پیغام بن گیا،اور اس نے آنے والی نسلوں کیلیئے عزت،غیرت اور خودداری کا وہ راستہ متعین کیا کہ جس پر چل کر امت رسول ﷺ اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرے گی،ان شاءاللہ۔

۴

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

علامہ اقبالؒ کا دور، بیسویں صدی کے آغاز کا دور ہے۔اسی دور میں علامہ اقبالؒ ایک سیاسی ،سماجی کارکن اور ایک فلسفی ومفکر کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ یہ انسانی اوراسلامی تاریخ کا بھی ایک غیر معمولی دور تھا۔ پوری دنیا میں تلاطم ،تباہی اور جنگیں برپا تھیں ۔یعنی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ءتک پہلی خونریز جنگ عظیم ہوئی ۔ پھر تیرہ سوسال سے قائم اسلامی سیاسی خلافت کا خاتمہ کیا گیا اور مسلم دنیا کو قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا، ساتھ ہی اسرائیل کے قیام کی بھی داغ بیل ڈال دی گئی۔۱۹۳۹ءمیں دوسری ہولناک جنگ عظیم کا آغاز ہوا کہ جس کے بعد برصغیر کی تقسیم ممکن ہوئی اور پاکستان وجود میں آیا اور ساتھ ہی صیہونی طاقتوں کی طرف سے اسرائیل کی ریاست بھی باقاعدہ طور پر قائم کی گئی۔

اس سے زیادہ تاریک دور مسلمانوں کی تاریخ میں کم ہی آئے ہوں گے۔اگر آپ اس زمانے اور آج کے دور کا موازنہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آج اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی مسلمانوں پر اسی طرح کی آزمائشیں ہیں کہ جیسی بیسویں صدی کے شروع میں تھیں۔ آج بھی دنیا کے نقشے تبدیل کرنے کی بات کی جارہی ہے۔آج بھی ایک نئے ’’عظیم تر مشرق وسطیٰ‘‘ کی تشکیل کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔پاکستان کے حصے بخرے کرنے کی بھی سازشیں جاری ہیں۔غرضیکہ تمام مسلمان ممالک، کہ جو ایشیا وسطی سے لیکر مشرق وسطیٰ تک پھیلے ہوئے ہیں، کے نقشے تبدیل کیے جارہے ہیں۔مسلمانوں کو قومیت، لسانیت اور فرقہ واریت کی بنیاد پر بری طرح آپس میں لڑایا

جارہا ہے۔آج بھی مسلمانوں میں قیادت کا فقدان ہے، سیاسی بحران ہے، ان پر جنگیں مسلط ہیں اور کوئی ایسا مفکر، دانشور اور فلسفی موجود نہیں ہے کہ جوان حالات میں امت کی رہنمائی کر سکے۔

اقبالؒ کا کلام آج ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ عصری لگتا ہے۔علامہ اقبالؒ نے ۲۰ء اور ۳۰ء کی دہائی میں جو پیغام امت کو دیا، وہ آج کی نوجوان نسل کی رہنمائی کیلئے ہے۔اسی سلسلے میں ایک خوبصورت واقعہ بھی ہے۔مصر سے کچھ نوجوان اقبالؒ سے ملنے کیلئے آئے۔جب ان نوجوانوں کا تعارف علامہ اقبالؒ سے کرایا گیا تو اقبالؒ نے مسکرا کر کہا کہ ان نوجوانوں کی آنے والی نسلیں میری مٹھی میں ہیں۔اقبالؒ ایک پیش بیں شخصیت تھے۔ایک ایسے صاحب فراست، صاحب نظر، صاحب بصیرت، اللہ کے درویش، کہ جو آنے والے وقت کو دیکھ رہے تھے۔یہ بات ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔اقبالؒ کو یہ معلوم تھا کہ ان کا کلام آنے والی کئی نسلوں کی رہنمائی کرے گا، اور امت کے احیاء میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔جب تک امت کا احیاء نہیں ہوتا، علامہ اقبالؒ کا مشن جاری رہے گا، ان شاء اللہ۔

....

گزشتہ ابواب میں ہم نے خطے کے سیاسی معاملات پر بات کی۔ہم نے اقبالؒ کی روحانی جہت کا بھی ذکر کیا کہ ان کا اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے کیسا تعلق تھا۔اس باب میں ہم اقبالؒ پر بحیثیت ایک انسان بات کریں گے۔

انبیاءؑ کے بارے میں بھی قرآن پاک کی سورۃ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے ہیں سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کیلئے آزمائش بنایا ہے۔کیا تم صبر و کرو گے؟ اور تمہارا رب تو دیکھنے والا ہے۔''

اللہ کے جو غیر معمولی بندے ہوتے ہیں، ان کا انسانی پہلو بھی انتہائی غیر معمولی ہوتا ہے۔اپنی بشری زندگی میں بھی وہ ایسا کردار پیش کرتے ہیں اور ایسی مثال قائم کرتے ہیں کہ جو آنے والی نسلوں کیلئے مشعل راہ ہوتی ہیں۔جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کو بڑے بڑے کام لینا ہوتے ہیں، ان کو پہلے تیار کیا جاتا ہے۔یاد رکھیئے گا، حضور ﷺ سے کار نبوت تو بعد میں لیا گیا لیکن آپ ﷺ صادق اور امین پہلے مشہور کرائے گئے، حتیٰ کہ کفار بھی آپ ﷺ کو صادق اور امین کہنے پر مجبور تھے۔

قائد اعظمؒ سے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا کام لیا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قائد اعظمؒ کی سچائی، ایمانداری، وقار، اور ان کے بکاؤ نہ ہونے کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔وہ نہ تو منافق تھے اور نہ ہی امت کی عزت و آبرو کا سودا کرنے والے۔اسی طرح علامہ اقبالؒ کے وجود میں بھی یہ تمام صفات موجود تھیں کہ جو وہ ان لوگوں میں دیکھنا چاہتے تھے کہ جو مستقبل کے معمار ہونگے۔

علامہ اقبالؒ نے امت کو جو نصیحتیں کیں اور جیسا وہ اس قوم کو دیکھنا چاہتے تھے، اس کردار کی جھلک خود ان میں بھی موجود تھی۔ایک محفل

میں کسی نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ آپ ہمیں کوئی نصیحت کیجیئے، کوئی مشورہ دیجیئے، تو اقبالؒ نے کچھ بہت خوبصورت اشعار کہے کہ جن کا مفہوم یہ تھا کہ اس دنیا میں زندگی اتنی خوبصورتی سے، اتنے باکردار اور باکمال انداز میں گزارو، کہ جب تمہاری موت کا وقت آئے تو خود خدا کو بھی افسوس ہو کہ کتنی خوبصورت زندگی کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ یہ قلندرانہ بات کہنے کیلئے بھی ایک کردار اور ایک یقین چاہیے، اللہ تعالیٰ پر ایک مان اور اس سے ایک تعلق چاہیے۔

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی

یعنی اتنے کمال اور عروج پر پہنچو کہ پورا جہان تم سے پیار کرنے لگے۔ وہ جو بزرگوں نے پہلے بات کہی ہے کہ زندگی دنیا میں اس طرح گزارو کہ لوگ تمہارے پاس آنے کیلئے بے چین ہوں اور جب تمہارا انتقال ہو تو تمہارے پیچھے تمہیں یاد کر کے رویا کریں۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی اسی قول کے مصداق تھی۔
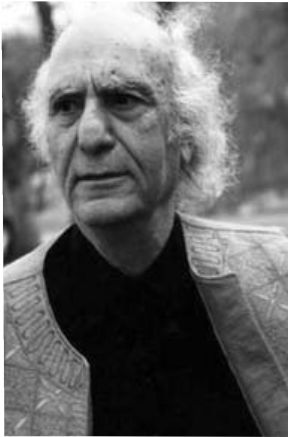
صوفی تبسم

حفیظ جالندھری

اقبالؒ کے کردار پر، ان کی زندگی میں بھی شدید حملے کیے گئے، تاکہ ان کے اس مشن اور ان کی ساکھ کو متاثر کیا جائے کہ جس کی بنیاد پر وہ امت مسلمہ کے احیاء کا پیغام لے کر اٹھے۔ ایک مرتبہ اس وقت کے بڑے شعراء مثلاً صوفی تبسم اور حفیظ جالندھری وغیرہ ان کے پاس آئے اور شکایت کی کہ ہمارے خلاف بہت پراپیگنڈہ اور بہتان تراشی کی جاتی ہے۔ اقبالؒ نے انہیں صبر کی تلقین کی اور کہا کہ شعراء، دانشوروں اور مفکرین کی آنکھیں وقت سے پہلے کھل چکی ہوتی ہیں، جبکہ قوم اس وقت سو رہی ہوتی ہے، لہٰذا ان کی زندگیوں میں ان کی قدر نہیں کی جاتی۔ جب شاعروں، مفکروں اور دانشوروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، تب تک وہ قوم کی آنکھیں کھول چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد قوم ان کی قدر کرنا شروع کرتی ہے۔

اقبالؒ کو ان کی زندگی میں بھی بہت پذیرائی ملی۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ جو عزت، محبت اور پیار، ماشاءاللہ، اقبالؒ کو ان کی زندگی میں ملا، وہ تاریخ میں کم ہی شخصیات کو نصیب ہوا ہوگا۔ اس وقت کے بڑے بڑے دانشور، مفکر، شاعر، علماء اور رہنما اقبالؒ کے پاس آ کر، ان کی محفل میں بیٹھ کر ان سے فیض لیتے تھے۔ علامہ اقبالؒ جب بیرون ملک سفر کرتے تو اس وقت کی بڑی بڑی، بین الاقوامی سطح کی شخصیات ان سے وقت لیکر ملنے آتیں۔

اس کے باوجود اقبالؒ کی شخصیت پر بہت سے ناپاک الزامات بھی لگائے گئے، مثلاً یہ کہ وہ شراب پیا کرتے تھے۔ یہ مشہور کر دیا گیا کہ وہ شراب پی کر ہی شاعری کرتے ہیں۔ ہم اس بات کو سختی سے مسترد کرتے ہیں! ہم واضح کر دیں کہ یہ پراپیگنڈہ صریحاً جھوٹ اور بہتان پر مبنی ہے۔ انہوں نے کبھی اس ناپاک چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ان کی زندگی میں کئی مواقع ایسے آئے کہ شراب کا استعمال ناگزیر تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ ڈاکٹروں نے علاج کیلئے تجویز کیا کہ آپکو چونکہ شدید تکلیف ہے، لہذا آپ تھوڑی سی برانڈی پی لیا کیجیے، تاکہ آپکی تکلیف میں کمی واقع ہو سکے۔ اس پر اقبالؒ نے کہا کہ جس ناپاک چیز کو میں نے کبھی یورپ میں بھی ہاتھ نہیں لگایا، آج میں اپنے علاج کیلئے اس کو یہاں کیسے استعمال کر سکتا ہوں۔

اسی طرح آخری وقت میں، جب تکلیف کی شدت تھی، تو ڈاکٹر ان کو مورفین کا انجکشن لگانا چاہتے تھے۔ علامہؒ کے دوستوں نے بھی یہی اصرار کیا کہ یہ تو صرف ایک انجکشن ہے، اس سے درد میں کمی ہو جائے گی، تو علامہؒ کہنے لگے کہ اس کے اندر افیون ہوتی ہے اور میں اللہ کے حضور کسی ایسی حالت میں نہیں پہنچنا چاہتا کہ میرے وجود میں کوئی نشہ آور چیز موجود ہو۔

کئی اور مواقع پر اقبالؒ کے پاس ایسے لوگ بھی آئے کہ جنہوں نے جیب سے شراب کی بوتل نکالی اور پینے کی کوشش کی۔ اقبالؒ جلال میں آ گئے اور ان کو سختی سے جھڑک کر پرے کر دیا۔

....

۲۳-۱۹۲۲ء میں، جب علامہ کو ''سر'' کا خطاب ملا، تو کئی لوگوں نے ان پر اعتراضات اٹھائے کہ یہ تو مسلمانوں کی عزت و غیرت اور آزادی کا پیغام دیتے ہیں اور خود انہوں نے انگریزوں سے سر کا خطاب لے لیا۔ لاہور میں ان کے دوستوں نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ اقبالؒ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ انگریز گورنر بھی مدعو تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب علامہؒ کو سر کا خطاب مل چکا تھا۔ اقبالؒ نے وہاں بڑے واضح طور پر کہا کہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ سر کے خطاب کی وجہ سے میں سچ بولنے سے رک جاؤں گا، تو یہ اسکی غلط فہمی ہے۔ اگر مجھے حکومت وقت نے یہ خطاب دیا ہے تو میری علمی خدمات کی وجہ سے دیا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ میں ان کا ملازم ہوں یا میں ان کی اقتدا کروں گا یا ان کی مرضی پہ چلوں گا۔ اس محفل میں علامہ اقبالؒ نے ''پیام مشرق'' کی وہ خوبصورت نظم پڑھ کر سنائی کہ جو ہم یہاں پیش کرنا چاہیں گے۔ اس نظم کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سر کا خطاب ملنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص ایسی نظم پڑھ سکتا ہے، تو پھر اس کو یہ کہنا کہ وہ نعوذ باللہ انگریزوں کا ملازم تھا یا انگریزوں کے کہنے پر وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا، تو اس سے بڑا بہتان اور ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابی

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اس حیرت انگیز اور رومانوی نظم میں اقبالؒ آنے والے وقت سے متعلق بشارت دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک بار پھر وہ کمالات عطا ہونے والے ہیں کہ جو ماضی میں کبھی مسلمانوں کونصیب ہوئے تھے۔

۳۰۔۱۹۲۰ء میں جب ایشیاء اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور مشرق میں ایسی کوئی طاقت موجود نہیں تھی کہ جو مغرب کا مقابلہ کرسکتی، اس وقت علامہؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ:

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

یعنی مشرق میں دوبارہ نئی زندگی کا آغاز ہورہا ہے اور اس راز کو کوئی سائنسدان یا دانشور نہیں سمجھ سکتا۔ آنے والے وقتوں کی نوید انہوں نے اسی وقت دے دی تھی۔ یاد رکھیے گا کہ یہ شعر انہوں نے اس وقت سنایا کہ جب لوگوں نے ان پر''سر'' کے خطاب کے حوالے سے طنز کیا۔

....

علامہؒ کی ذاتی زندگی میں جو لوگ انہیں بہت قریب سے جانتے تھے، مثلاً ان کے ملازم اور دوست وغیرہ، انہیں معلوم تھا کہ یورپ میں رہ کر بھی اقبالؒ نے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی۔ ان کی زندگی، ان کی جوانی ہمیشہ پاکیزہ رہی۔ انہوں نے مغربی ماحول، معاشرے، تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا، لیکن اپنا دامن بچائے رکھا۔

مالی معاملات کے حوالے سے بھی علامہ اقبالؒ کی زندگی بالکل بے داغ تھی۔ ساری عمر ایک مسکین اور درویش کی زندگی گزار دی، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ شدید مالی تکلیفوں کا سامنا کیا، یہاں تک کہ حال یہ ہوگیا تھا کہ گھر بنانے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل ''جاوید منزل'' بنوائی، مگر وہ بھی اپنی بیوی کے پیسوں سے، اور جہاں یہ گھر تعمیر ہوا وہ زمین بھی ان کی بیوی ہی کی تھی۔

جب علامہ اقبالؒ یورپ سے پڑھ کر آئے، تو بڑی بڑی جگہوں سے وظیفوں اور نوکریوں کی پیشکش ہوئی۔ اس کے باوجود صرف اتنی ہی وکالت کرتے کہ جس سے گھر کا خرچ چل سکے۔ جہاں دیکھا کہ دو یا تین مقدمات مل گئے ہیں اور ان کی فیس گھر کا خرچ چلانے کیلیے

کافی ہے، تو مزید مقدمات لینے سے انکار کر دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی وکالت کو پیشہ یا آمدنی کا ذریعہ اس لحاظ سے نہیں بنایا کہ اس سے زمینیں، جائیدادیں اور جاگیریں بنا سکیں۔ صرف اتنا رزق حلال کمایا کہ اپنا اور بچوں کا گزارہ ہو سکے۔ آخری وقت میں حالت یہ تھی کہ اپنی دو بیویوں کا خرچ تو تھا ہی، اس کے علاوہ چونکہ انکے بھائی پنشن پر گزارہ کرتے تھے، لہذا اقبالؒ ان کے گھر کے خرچ کا بوجھ بھی اٹھاتے تھے۔ مزید برآں بہت بڑی تعداد میں مساکین بھی آپ پر انحصار کرتے تھے۔

اس کی صرف چند مثالیں ہم آپ کو دیتے ہیں۔ اقبالؒ ایک بہت ہی بوسیدہ گھر میں دوسو روپیہ ماہانہ کرایہ پر رہتے تھے۔ گھر اتنا بوسیدہ تھا کہ اب گرا اور تب گرا۔ خود بھی مذاق سے کہا کرتے تھے کہ یہ مکان تو میری دعاؤں کے سہارے ہی کھڑا ہے، ورنہ اس میں کھڑے رہنے والی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس گھر کو بدل کیوں نہیں لیتے، دوسو روپیہ کرایہ، یہ تو ظلم ہے! کسی اچھے گھر میں جائیے، اس سے کم کرایے پر مل جائیگا۔ جواب میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ مکان ایک ہندو بیوہ کا ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ان کا گزارہ اسی کرایے پر ہوتا ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں کوئی دوسرا گھر لے لوں یا اس بیوہ سے کہوں کہ کرایہ کم کر دے۔ اس سے اُس بیوہ کی آمدنی کم ہو جائے گی اور اس کے بچوں کو تکلیف ہوگی۔

یہ تھا انسانیت کے ناطے اقبالؒ کی صلہ رحمی اور خدا ترسی کا عالم۔

علامہ اقبالؒ نے تین ملازم رکھے ہوئے تھے۔ علی بخش کہ جوان کا پرانا وفادار ملازم تھا اور اسکے علاوہ دو مزید۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ مالی اعتبار سے اتنے پریشان ہیں، تو تین تین ملازم کیوں رکھے ہوئے ہیں، علی بخش ہی کافی ہے خدمت کیلئے۔ تو علامہؒ نے بتایا کہ ایک
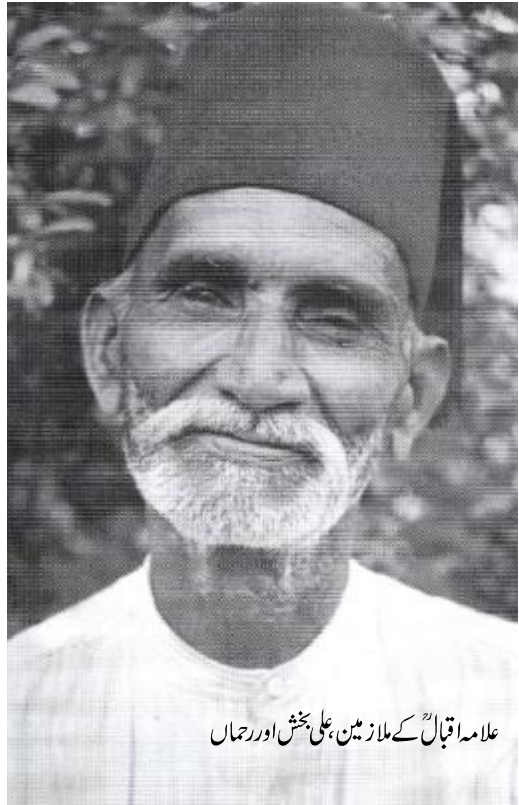
علامہ اقبالؒ کے ملازمین، علی بخش اور رحماں

جاوید منزل لاہور، موجودہ اقبالؒ میوزیم

مرتبہ علی بخش چھٹی پر گیا تو اپنی جگہ دوسرے ملازم کو رکھوا گیا۔ پھر دوسرے کو کہیں جانا پڑا تو اس نے تیسرے کو عارضی طور پر اپنی جگہ ہفتے بھر کیلئے نوکری پر رکھوا دیا۔ اب جب تینوں واپس آئے تو علی بخش نے دوسروں سے کہا کہ تم چھٹی کرو۔ تو اس پر وہ رونے لگے کہ اب ہم کہاں جائیں گے، ہماری نوکری لگی ہوئی ہے، ہمارے رزق پر لات نہ ماریے۔ مجبوراً میں نے باقی دونوں کو بھی رکھ لیا۔ اب تین ملازموں کی تنخواہ کا بوجھ اٹھاتا ہوں، جبکہ کام شاید ایک کا بھی مشکل ہی سے ہوگا۔

....

ایک مرتبہ سر اکبر حیدری کہ جو ریاست حیدر آباد دکن کے صدر اعظم تھے، نے علامہؒ کو ایک ہزار روپے کا چیک بطور تواضع بھجوایا، مگر ان کے خط سے اقبالؒ کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ احسان جتانا چاہتے ہیں، لہذا اقبالؒ کی غیرت اسے قبول نہ کر سکی اور انہوں نے وہ چیک واپس بھجوا دیا۔ اس موقع پر ایک نظم بھی کہی کہ جس کا ایک شعر ہے:

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

ایک فقیر کی غیرت یہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کو صدقہ دیا جائے یا کوئی اس پر ترس کھائے۔

لیکن ان کے نزدیک فقر کی تعریف مسکینی یا غربت نہیں تھی۔ اقبالؒ نے مومنوں سے جس فقر کی بات کی، اسکا مفہوم بہت روحانی اور وسیع ہے۔ بلکہ انہوں نے اسے اپنے ایک شعر میں بھی بیان کیا ہے کہ میرے نزدیک فقر غریبی، مسکینی اور عاجزی کا نام نہیں، فقر اس کا نام ہے کہ انسان کی نظر میں دنیا کی کوئی اہمیت نہ ہو، وہ اعلیٰ ترین عہدے پر بھی رہے، چاہے پوری دنیا کا سفر کرے، ہر طرح سے شان و شوکت کی زندگی گزارے، لیکن دنیا اس کے دل اور نگاہ میں اتری ہوئی نہ ہو۔ مطلب ''دنیا گل ہے نہ کہ درد دل'' والی بات۔ کہ وہ دنیا کو مٹی سمجھتا ہے، اس کو دل میں جگہ نہیں دیتا۔ یہ ہے اقبالؒ کا فقر!

....

اقبالؒ جب یورپ سے نئے نئے لوٹے تو انکا رکھ رکھاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ سوٹ ٹائی پہنتے اور پورے ٹھاٹھ سے رہتے۔ لیکن بعد میں کیفیت یہ ہوگئی تھی کہ اپنی دھوتی، بنیان اور حقہ لیکر ان محفلوں میں بیٹھتے کہ جہاں پوری دنیا سے لوگ آکر ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔

ایک دفعہ رشید احمد صدیقی نے اقبالؒ سے کہا کہ علامہ آپ نے مسلمانوں کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔ علامہ پوچھتے ہیں وہ کیا؟ تو بولے کہ جو باتیں آپ نے اپنے کلام میں لکھی ہیں، وہ تو کچھ بھی نہیں ہیں، جو فیض آپکی محفلوں سے جاری ہوتا ہے، وہ انتہائی غیر معمولی ہے۔

اسے تو آپ نے کہیں لکھا ہی نہیں ۔ یہ بہت بڑا ظلم ہوگا کہ آپکے علم اور فیض کے چشمے اگلی نسلوں تک نہ پہنچ پائیں۔ اقبالؒ نے کہا کہ فکر نہ کرو، میرا کلام میرے بعد بھی جاری رہے گا، اور آنے والی نسلیں میری مٹھی میں ہیں۔

اقبالؒ ایک منکسر المزاج آدمی تھے، ان کے وجود میں تکبر نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس معاملے میں وہ اللہ سے بہت ڈرتے تھے۔ بڑے لوگوں کی ایک خاص نشانی یہ ہوتی ہے کہ اللہ جتنا ان کو رزق عطا کرتا ہے، جتنا ان پر کرم کرتا ہے، اتنے ہی وہ جھکتے چلے جاتے ہیں، ان میں اتنی ہی عاجزی اور انکساری آجاتی ہے۔

ایک مرتبہ علامہؒ ایک بہت بڑے نواب کے گھر گئے تو فرش پر ہرن کی کھال بچھی دیکھی۔ اقبالؒ اس کھال سے بچ کر چلنے لگے۔ نواب کے استفسار پر فرمایا کہ میں نے اپنے استاد سے سنا ہے کہ ہرن کی کھال پر چلنے سے تکبر پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس سے بچ کر چل رہا ہوں۔

اسی طرح ایک مرتبہ ایک محفل میں گئے تو وہاں زمین پر ریچھ کی کھال بچھی ہوئی تھی، میزبان نے ریچھ کی کھال کو اٹھا کر جگہ بنائی اور کھال کونے میں پھینک دی۔ اقبالؒ کو اس سے بہت تکلیف ہوئی اور آپ نے بڑے دکھ سے فرمایا کہ پہلے تو اس کو مار دیا، اب اس کو ذلیل بھی کرتے ہو۔

راجہ صاحب محمود آباد
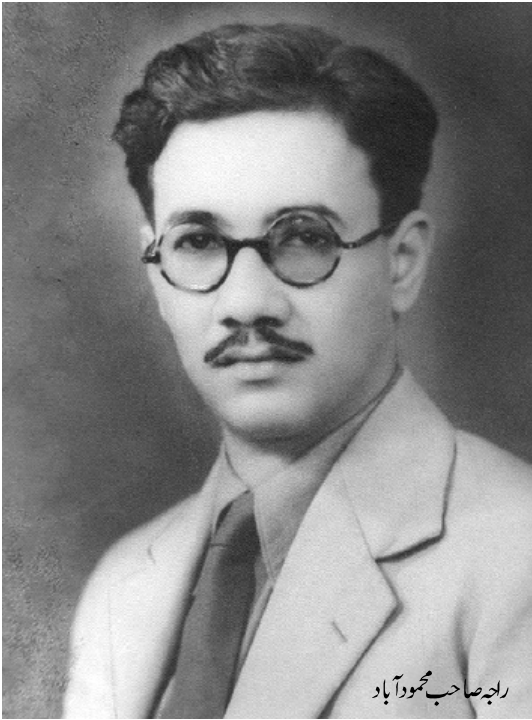
ایک مرتبہ راجہ صاحب محمود آباد، کہ جو اپنے علاقے کے امیر کبیر راجہ تھے، اقبالؒ سے ملنے ان کے گھر آئے۔ راجہ صاحب نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تھی اور انکا رویہ دوغلا تھا۔ کبھی وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو جاتے تو کبھی ہندوؤں کے۔ اقبالؒ کو ان سے شدید اختلاف تھا۔ ان دنوں اقبالؒ شدید کسمپرسی میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود، جب اتنی بڑی ریاست کا راجہ ملنے کیلئے اجازت طلب کرتا ہے، تو علامہؒ بے نیازی سے اپنے خادم سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہیں؟ وہ بتاتا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد۔ اقبالؒ پوچھتے ہیں: ''وہی جنھوں نے نہرو رپورٹ کی تائید کی ہے؟'' خادم بولا: ''جی ہاں''۔ اقبالؒ نے کہا: ''ان سے کہہ دو کہ واپس چلے جائیں، میں ان سے نہیں ملنا چاہتا''۔

....

اقبالؒ کی زندگی میں ایسے کٹھن لمحات بھی آئے کہ جب ان کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ لیکن یہ لمحات زیادہ تر اس قسم کے معاملات میں ہی پیش

آئے کہ جوان کی خانگی زندگی سے متعلق تھے۔اقبالؒ کی خانگی زندگی ان کا اکلوتا کمزور پہلو تھا۔اقبالؒ چونکہ ایک درویش فلسفی، صاحب بصیرت اور کئی سو سال آگے دیکھنے والے انسان تھے، چنانچہ گھریلو معاملات، شادی بیاہ کے جھگڑے، اولاد، کرائے، مکان وغیرہ کے جھنجٹ سے بہت پریشان ہوتے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں ان کے فکری عمل میں خلل کا باعث بنتی تھیں۔اس زمانے کے حالات واقعات کچھ اس طرح بنے کہ مجبوراً ان کو یکے بعد دیگرے تین شادیاں کرنی پڑیں (اس کی تفصیل خاصی طویل ہے)، لیکن ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک کے اڑھائی سال انکے اس قدر تکلیف میں گزرے، کہ انہوں نے اپنے دوستوں، خاص طور پر عطیہ فیضی کے ساتھ جو خط و کتابت کی، اسمیں تو انہوں نے یہ تک لکھا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یا تو دیوانہ ہو جاؤں یا کسی نشے میں پڑ جاؤں، یا پھر ہندوستان چھوڑ کر کہیں چلا جاؤں اور واپس پلٹ کر اس ملک کی طرف بھی نہ دیکھوں۔ یہ ان کی زندگی کے مشکل ترین لمحات تھے۔

ہر انسان چاہے وہ اعلیٰ ترین دنیاوی یا روحانی مقام پر ہی فائز کیوں نہ ہو، تربیت کے مختلف مراحل سے ضرور گزرتا ہے۔ تربیتی عمل کے دوران وہ اپنی کمزوریوں پر کتنی جلدی قابو پالیتا ہے، کتنی جلدی ان مشکلات پر حاوی ہو جاتا ہے، یہ اسکی استعداد، محنت اور اللہ کے فضل پر منحصر ہے۔ مضبوط لوگ ان مشکلات اور طوفانوں سے گزر کر کندن بن جاتے ہیں۔

ایک موقع پر اقبالؒ پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ قادیانی ہیں۔ چونکہ ایک زمانے میں اقبالؒ نے اس فتنے کا بہت قریب سے مطالعہ کیا، لہذا لوگوں کو یہ شک ہوا کہ شاید آپ اس سے متاثر بھی ہو گئے ہیں۔لیکن اقبالؒ نے قادیانیت کو شدت سے رد کیا، اور اپنی شاعری، گفتگو اور محفلوں میں اس کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی۔ ختم نبوت کے حوالے سے جو شک قادیانی پیدا کر رہے تھے، اسے اقبالؒ نے بڑی سختی سے رد کیا۔لوگوں کے ذہنوں سے شکوک و شبہات کو دور کیا۔اس زمانے کے بڑے بڑے دانشور اور علماء بھی علامہ اقبالؒ کے پاس یہ کہنے کیلئے آئے کہ کیوں نہ قادیانیوں کو بھی ایک فرقے کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔اس پر اقبالؒ نے کہا کہ مسلمان فرقوں میں جو اختلافات ہیں، وہ فروعی اور سطحی ہیں، لیکن اگر اس تصور کو قبول کر لیا جائے کہ جو ختم نبوت پر سمجھوتہ کرنے کو کہتا ہے، تو یہ دین اسلام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دے گا، لہذا اس پر کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح اگر کوئی بد بخت، حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا تو اقبالؒ جلال میں آ جایا کرتے۔ جب غازی عبدالقیومؒ اور غازی علم دین شہیدؒ نے حضور ﷺ کے شاتم اور گستاخ کو قتل کیا اور اسکے نتیجے میں انہیں موت کی سزا سنائی گئی تو بہت سے لوگ اقبالؒ کے پاس یہ کہنے کیلئے آئے کہ آپ وائسرے سے ان کی سفارش کر دیجیئے کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے۔ اس پر اقبالؒ جلال میں آ گئے اور بہت دل گداز اشعار کہے:

نظر اللہ پر رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا شے ہے فقط عالم معانی کا سفر

ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدرو قیمت میں ہے خون جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ اے مرد مسلماں! تجھے کیا یاد نہیں
حرف 'لاتدع مع اللہ الھا الآخر'

یعنی کہتے ہیں کہ غیرتمند مسلمان تو اللہ پہ نگاہ رکھتا ہے۔ یہ مسلمان کہ جو شہید ہونے جارہے ہیں، ان کے خون کا کفارہ تم کلیسا والوں سے مت طلب کرو۔ کیوں مجھ سے کہتے ہو کہ میں انگریزوں سے سفارش کروں کہ ان کی جان بچالی جائے؟ یادرکھو کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارنا جائز نہیں۔ ان مجاہدین کا خون حرم سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان کو شہید ہونے دو۔ یہ دین کی لاج رکھ رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے ان کو بچانے کی کوشش نہیں کی، ان کی شہادتوں کو ہمیشہ کیلئے امر کردیا۔ یہ اقبالؒ کے عشق رسول ﷺ کی اتنی بڑی دلیل ہے کہ جس کی مثال اُس دور میں بھی ملنا مشکل تھی کہ جس میں مسلمان مفکروں اور دانشوروں میں انتہائی باعمل، باکردار ہستیاں موجود تھیں۔

....

ایک مرتبہ لاہور میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں زمین کے ایک ٹکڑے پر سخت تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ ہندو یہ کہتے تھے کہ ہم یہاں مندر بنائیں گے اور مسلمان بضد تھے کہ یہاں مسجد بنائی جائے گی۔ مسلمانوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ ہم راتوں رات یہاں مسجد بنادیتے ہیں، اس کے بعد ہندو کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ علامہ اقبالؒ کو جب اس خفیہ منصوبے کا علم ہوا تو انہوں نے خود بڑھ چڑھ کر اس کے لیے چندہ دیا۔ راتوں رات وہاں ایک مسجد کھڑی ہوگئی۔ آج بھی وہ مسجد لاہور میں قائم ہے اور ''مسجد شب بھر'' کے نام سے جانی جاتی ہے، یعنی ایک رات میں بنی مسجد۔ مسجد تو بن گئی، مسلمان، ماشاءاللہ، اس معاملے میں تو جیت گئے، مگر بعد میں وہاں نمازیوں کی کم تعداد کو دیکھ کر اقبالؒ نے یہ طنزیہ شعر کہا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اقبالؒ ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ ایک طرف ان کا اس بات پر شدید زور تھا کہ دین کی تشکیل نو کی جائے، جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ایک نئی فقہ تشکیل دی جائے اور اجتہاد کے دروازوں کو، کہ جو سقوط بغداد کے وقت علماء نے بند کردیئے تھے، دوبارہ کھولے جائیں۔ مسلمانوں پر جو جمود طاری ہے، اسے توڑا جائے۔ مسلمان علماء، پیر، صوفیاء کے سلاسل میں جو منافقت، جو جمود تھا، اقبالؒ کو اس پر شدید رنج تھا اور وہ ان کے بڑے ناقد تھے۔

ایک مرتبہ ایک پیر صاحب اقبالؒ کے پاس آئے۔ ان پیر صاحب کے ساتھ ان کا ایک مرید بھی تھا۔ اس مرید نے پیر سے کہا کہ میں دو

مسجد شب بھر، لاہور

سوروپے کا مقروض ہوں، میرے لیے دعا کیجیئے کہ میرے معاملات ٹھیک ہو جائیں۔ تو ان پیر صاحب نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھا دیئے اور اقبالؒ سے کہا کہ آپ بھی دعا کیجیے۔ اقبالؒ نے کہا کہ میری دعا بعد میں ہوگی، پہلے آپ دعا کرلیں۔ ان پیر صاحب نے دعا کرلی تو پھر اقبالؒ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور پوری محفل کے سامنے دعا کی کہ یا اللہ! ایسے پیروں کو ہدایت دے کہ مریدوں کو بیوقوف بنانا بند کردیں اور ایسے مریدوں کو ہدایت دے کہ ایسے پیروں کے پاس آنا بند کردیں۔

اقبالؒ اس قسم کے روایتی پیری مریدی کے سلاسل سے سخت نالاں تھے کہ جس نے پوری قوم کو غفلت کی نیند سلا رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ ایسے ملاؤں اور علماء سے بھی سخت بدظن تھے کہ جنھوں نے مسلمانوں کو جہاد، بیداری، غیرت، دلیری اور شجاعت کا سبق دینے کی بجائے ان کو محض غلامی پر راضی کیا ہوا تھا کہ جیسے بھی حالات ہوں، ان سے سمجھوتہ کر کے گزارہ کرلیں۔ اقبالؒ ایک متحرک مرد آزاد تھے اور کسی صورت میں بھی غلامی اور رسوائی قبول کرنے کے قائل نہیں تھے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ آغاز میں اقبالؒ کی ذاتی زندگی کافی مسائل کا شکار رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیویاں سیدھی سادی گھریلو خواتین تھیں۔ وہی مسائل کہ جو گھر داری میں ہوتے ہیں، اقبالؒ کو بھی درپیش رہے۔ ان کی مرضی کے بغیر یہ نکاح ہو گئے تھے۔ اقبالؒ کی وہاں ذاتی پسند بھی شامل نہیں تھی، اور ان شادیوں کے سلسلے میں انہوں نے اپنے والدین کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے اس بات پر اپنے والدین کے ساتھ بحث بھی کی کہ وہ اس جگہ نکاح نہیں کرنا چاہتے۔ ان سب کے باوجود جب ان کے نکاح ہو گئے، تو بہت بعد میں، وہ اپنی خاندانی زندگی کو کسی حد تک مستحکم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ اس قدر عدل و انصاف کرتے تھے، کہ ایک مرتبہ انہوں نے دونوں کیلئے سونے کے کڑے بنوائے۔ ایک کڑے کا وزن کچھ کم تھا تو جتنا وزن کم تھا، اس کے مساوی رقم انہوں نے دوسری بیوی کو بھجوادی تا کہ دونوں میں عدل کا توازن قائم رکھا جا سکے۔

وہ فلسفی اور دانشور تھے۔ اس قسم کے آدمیوں کا اپنے مشن اور اپنی خانگی زندگی میں توازن قائم رکھنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ یہ تقریباً امر محال ہے کہ ایک آدمی مفکر، فلسفی، نظریاتی قائد بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ گھر داری کے معاملات بھی بطریق احسن چلا سکے۔ آپ قائداعظمؒ کو ہی دیکھ لیجیئے۔ انکی خانگی زندگی بھی کچھ خاص خوشگوار نہیں تھی۔ مثالی کردار تو حضورﷺ کے سوا کسی اور کا ہو بھی نہیں سکتا۔

کوئی شخص جب کسی ایک کام میں بہت آگے بڑھ جاتا ہے تو اسکا کوئی نہ کوئی دوسرا پہلو ضرور متاثر ہونے لگتا ہے۔ یہی نشانیاں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ عام انسانوں سے بھی اتنے بڑے بڑے کام لے لیتا ہے کہ جو اتنے غیر معمولی ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر لگتا ہے کہ شاید وہ اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں۔ لیکن یہ سارے کام کرنے والے بھی عام لوگ ہی ہوتے ہیں۔ آج کے دور میں بھی عام لوگ غیر معمولی کام انجام دے سکتے ہیں، اگر مقصد سے سچی وابستگی ہو، منزل واضح ہو، خلوص ہو، وہ دیوانگی اور جنون ہو کہ جو مردان خود آگاہ و خدا مست میں ہوتا ہے۔

اپنے بچوں کے ساتھ اقبالؒ کا غیر معمولی تعلق تھا۔ ان کی دونوں اولادیں یعنی جاوید اور منیرہ بہت چھوٹے تھے کہ جب اقبالؒ کا انتقال ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں ان بچوں کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے بعد، تقریباً تین سال اقبالؒ نے اپنے ان دو بچوں کے ساتھ ہی زندگی گزاری۔ بچے اسوقت بہت چھوٹے تھے۔ اقبالؒ ان بچوں کے ساتھ بہت پیار کرتے۔ بڑھاپے کی اولادیں تھیں اور بچوں کی ماں بھی نہیں تھی۔ جب ان بچوں کی والدہ کا انتقال ہوا تو اقبالؒ نے دونوں بچوں کو بلایا اور سینے سے لگا کر انہیں بہت دیر تک پیار کرتے رہے۔ اقبالؒ بہت سا وقت ان کے ساتھ گزارتے۔ جاوید کو نصیحت کرتے کہ بیٹا تم مرد ہو، تمہیں رونا نہیں ہے۔ بہن بھائی میں اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا تو اقبالؒ کو بہت دکھ ہوتا، خاص طور پر منیرہ کے حوالے سے۔ اپنے بیٹے کو ڈپٹ بھی دیتے کہ تم چھوٹی بہن پر سختی کیوں کرتے ہو؟ بیٹی اقبالؒ کی کمزوری تھی۔ ان کا منیرہ کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا۔ آخری وقت میں یہ کیفیت تھی کہ ڈاکٹروں نے کسی کو بھی ان کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ جو نرس وہاں تھیں، جو بچوں کی آیا بھی تھیں، بچوں کا دھیان رکھتی تھیں، ایک دن انہوں نے

علامہ اقبالؒ کی شریک حیات

کریم بی بی

سردار بیگم (جاوید اور منیرہ کی ماں)

مختار بیگم
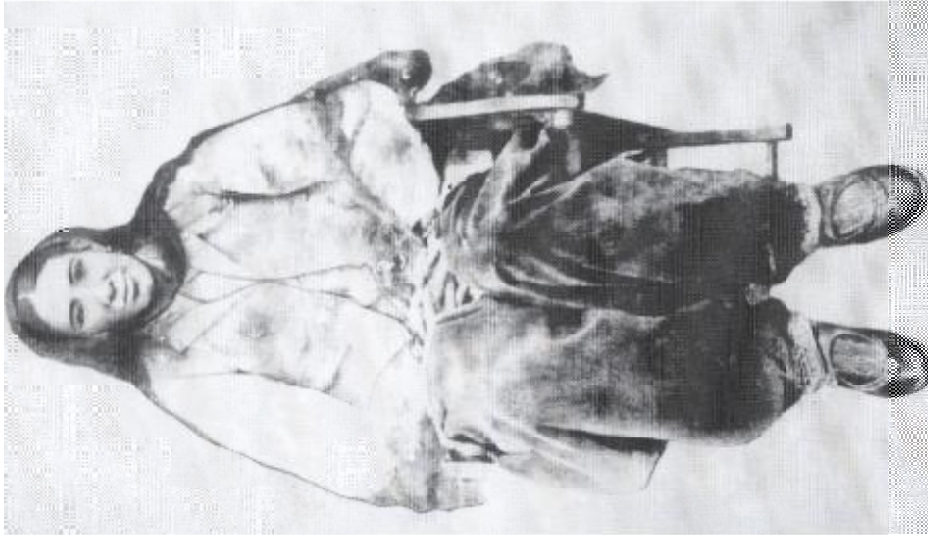
جاویداورمنیرہ کی گورنس فراؤلین ڈورس لینڈ ویر

دیکھا کہ اقبالؒ آنکھیں بند کر کے لیٹے ہیں اور چھوٹی منیرہ انکے سینے پر سوار ہے۔ جب نرس نے منیرہ کو ہٹانے کی کوشش کی تو اقبالؒ نے منع کر دیا اور کہا کہ اسے میرے اوپر لیٹا رہنے دو، مجھے اس سے بہت سکون مل رہا ہے۔

اپنے انتقال کے وقت ان کو فکر تھی، کہتے تھے کہ میری اولاد بہت چھوٹی ہے، مجھے ان کے ساتھ وقت نہیں مل سکا۔ بار بار جاوید سے اصرار کرتے کہ جب میرے پاس کوئی بڑی شخصیت آیا کرے، جیسے قائداعظمؒ، تو تم بھی آ کر بیٹھا کرو، میرے پاس وقت گزارا کرو، مجھ سے سیکھواور کچھ لو۔ مگر وہ بچے بہت چھوٹے تھے کہ جب اقبالؒ کا انتقال ہوگیا۔ بچوں کی خاطر انہوں نے ایک نرس رکھ لی تھی کہ جو جرمن نژاد تھیں۔ بہت نیک خاتون تھیں۔ بعد میں بھی اس جرمن نرس کا جاوید اور منیرہ کے ساتھ تعلق رہا۔ ان کا آپس میں محبت اور پیار کا اتنا گہرا رشتہ قائم ہوگیا کہ وہ بالکل خاندان کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر گئیں۔

وہ ایک غیر معمولی گھر تھا کہ جس کے دروازے ہر وقت ہر ایک کیلئے کھلے رہتے۔ کوئی بھی، کسی بھی وقت ان کے ہاں آ سکتا تھا۔ اقبالؒ چارپائی پر اپنے مہمان خانے یا سبزہ زار میں بیٹھے ہوتے۔ درویش یا رئیس غرضیکہ جس کسی کا بھی دل چاہتا، ان کی محفل میں شامل ہو جاتا۔ کوئی پابندی نہیں، کوئی تکبر نہیں۔ آخر میں تو پیسوں کی اس قدر قلت ہو چکی تھی کہ انکے دوست احباب انکا وظیفہ لگوانے کیلئے کوششیں کرتے رہے، مگر اقبالؒ بے نیاز ہی رہے۔

وہ ایک انسان ہی تھے لیکن اس عام انسان نے خود اعتراف کیا ہے کہ ان کے وجود میں غیر معمولی قوتیں کارفرما ہیں۔ اقبالؒ اپنا تعارف خود کرواتے ہیں کہ:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

اقبالؒ کی وفات سے پہلے

جاوید اقبال اور منیرہ بیگم

اور موجودہ دور میں

بلاشبہ اقبالؒ ایک پراسرار وجود تھے۔ان کا ایک پہلو دیکھیں تو آپکو لگے گا کہ یہ بالکل ایک عام آدمی ہیں،ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔حقہ پی رہے ہیں۔ بنیان اور دھوتی میں بیٹھے ہیں۔ایک فقیرانہ انداز ہے۔گھر بھی ایسا کہ جوان کی دعاؤں کے سہارے ہی کھڑا ہے۔لیکن اس گھر میں رہنے والا شخص آئندہ کئی سو سال تک آنے والے دور کو دیکھ رہا تھا،اسکی تعبیر بھی کرر ہا تھا،کروڑوں کی مسلمان امت کو بیدار بھی کرر ہا تھا،اس کی تقدیر بھی تبدیل کرر ہا تھا اور جو تقدیر ساز بھی تھا اور تاریخ ساز بھی۔

قائداعظمؒ جب علامہ اقبالؒ کی صحبت اور محفلوں سے آشنا ہوئے تو انہوں نے اپنی تقریروں میں پہلی مرتبہ دین کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا۔جب اقبالؒ نے اخبار میں جناحؒ کا بیان پڑھا تو اپنے دوستوں کو بلا کر کہا کہ محمد علی جناحؒ کی زبان سے دین کا لفظ کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے۔قائداعظمؒ کی تقدیر بھی اقبالؒ نے ہی تبدیل کی اور پھر قائداعظمؒ کو برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر تبدیل کرنے اور ایک نئی تاریخ مرتب کرنے کیلئے بھی اقبالؒ نے ہی منتخب کیا۔اقبالؒ خود شاہین شہہ لولاک ﷺ تھے اور وہ امت کے ہر نوجوان کو یہ مقام دلانا چاہتے تھے۔

بلاشبہ،آج کے دور کے نوجوان اقبالؒ کی مٹھی میں ہیں۔

استنبول، خلافت عثمانیہ کے دور میں

۵

خلافت حفظ ناموس الٰہی است

پچھلے ابواب میں ہم نے اس دور کی تاریخ کا جائزہ لیا کہ جس میں اقبالؒ تشریف لائے۔ ہم نے ان تمام تاریخی اسباب پر بھی روشنی ڈالی کہ جن کے باعث اللہ تعالیٰ امت کے احیاء کے لیے غیر معمولی افراد پیدا کرتا ہے۔ پھر ہم نے اقبالؒ کی شخصیت اور کردار کے حوالے سے بھی بات کی۔ ہم نے اقبالؒ کے اس تعلق کی بھی بات کی کہ جو ان کا حضورﷺ سے قائم تھا۔ اقبالؒ کی سوچ اور فکر پر ہم جو کام کر رہے ہیں اس کی بنیاد ہی یہ نقطہ ہے کہ اقبالؒ نے قرآن اور سنت کے پیغام کو اردو اور فارسی شاعری میں اتنے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر طور پر قرآن و سنت کی حکمت اور اس کے انقلابی پیغام کی نمائندگی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اقبالؒ خود اپنی شاعری میں حضورﷺ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر میں نے اپنی شاعری میں آپﷺ کے دین کی نمائندگی نہ کی ہو تو قیامت کے روز مجھے ذلیل و رسوا کر دیجیئے گا اور اپنی قدم بوسی سے محروم فرما دیجیئے گا۔ اپنے پیغام اور مشن کی صداقت پر اتنا یقین اور اس پر اتنے بڑے دعوے کی جرأت امت مسلمہ میں کوئی اور مفکر، دانشور یا شاعر نہ کر سکا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بار بار تاکید کرتے ہیں کہ اپنی اولادوں کو ان کی شادیوں پر جو تحفے آپ دیں، ان میں کلیات اقبالؒ لازماً شامل کریں۔ اپنے بچوں کو سالگرہ کے تحفے میں کلیات اقبال دیں۔ ہمیں اقبالؒ کو رواج دینا ہوگا۔ اقبالؒ ہمارے لیے زندگی کا پیغام ہیں کہ جنہوں نے قرآن وسنت کی ہماری ہی زبان میں تشریح کر کے، آج کے مسائل کا اس طرح حکیمانہ تجزیہ کیا اور انکا حل بتایا۔ اگر اب بھی اس قوم نے

اقبالؒ سے فیض نہ لیا تو یہ بہت بدنصیب ہو گی۔

ایک بات ذہن میں رکھیئے گا۔ ہر دور، ہر زمانہ اپنے ساتھ نئے فتنے لاتا ہے۔ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں جتنے بھی بزرگ گزرے ہیں، انکا مقابلہ اپنے دور کے فتنوں سے ہی رہا۔ کسی زمانے میں فتنے علمی ہوا کرتے تھے، یعنی فتنہ خلق قرآن اور اس قسم کے فتنے کہ جنہوں نے علمی سطح پر قرآن و سنت کو چیلنج کیا۔ ایسے فتنوں کا دور بھی آیا کہ جب اسلام میں یونانی اور لاطینی فلسفہ داخل ہو گیا اور وقت کے علماء کو ان علمی بدعتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

شاہ ولی اللہؒ نے مرہٹوں کے فتنے کو دیکھا اور احمد شاہ ابدالیؒ کو ہندوستان مدعو کیا تا کہ مسلمانوں کی کمزور ہوتی ہوئی سیاسی طاقت کو سہارا دیا جا سکے، اور ساتھ ہی ساتھ امت میں دین اسلام اور قرآن کی ترویج کا کام بھی جاری رکھا۔

ہر دور کے مجدد، دانشور اور وہ صاحب نظر افراد کہ جن کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے امت کو بیدار کرنے اور اپنے دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کی ذمہ داری دی جاتی ہے، وہ ان قیاسی امور پر بات نہیں کرتے کہ جو آئندہ وقتوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی مسئلہ لے کر آتا تھا تو پہلے وہ یہ سوال کرتے کہ کیا آج کے دور میں کسی کو یہ مسئلہ درپیش ہے؟ اور اگر لوگ کہتے کہ نہیں، تو وہ اسکا جواب نہ دیتے، اور یہ کہتے کہ وقت آنے پر مستقبل کے علماء ان مسائل کا جواب دیں گے۔

....

جس دور میں اقبالؒ پیدا ہوئے، اس دور کا ایک بار پھر مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی۔ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کا درمیانی دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم برپا کرنے کے اصل محرکات کیا تھے، یہ بات تفصیلاً ہم نے اپنی کتاب ''معاشی دہشت گردی'' میں بھی بتائی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب سرمایہ دارانہ معاشی نظام پوری طرح دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ آپ ایک چیز نوٹ کریں گے کہ فرانسیسی انقلاب جو اٹھارویں صدی میں آیا، اس کے ساتھ ساتھ دو نظریات کو بھی عروج حاصل ہوا۔ ایک تو جمہوریت، لبرل ازم اور آزاد سیکولر معاشرے کا تصور، اور دوسرا سرمایہ دارانہ نظام کہ جس کی جدید شکل آج کے دور کے بینکاری نظام کی شکل میں موجود ہے، یعنی جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام ایک ساتھ ہی اٹھے۔

لینن ہو یا وہ تمام بڑے بڑے مارکسسٹ مفکرین اور فلسفی کہ جنہوں نے کمیونسٹ معاشی نظام تیار کیا، وہ سب کے سب بنیادی طور پر صیہونی تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو جغرافیائی طور پر بھی تقسیم کیا جائے اور نظریاتی و معاشی طور پر بھی۔ کیونکہ آنے والے وقتوں میں صیہونیوں نے انہی دونوں قوتوں، یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت، کے درمیان کھیل کر ہی دنیا پر قبضہ قائم رکھنا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب اسلام ایک دین کی حیثیت سے، ایک سیاسی، معاشی اور فوجی طاقت کی حیثیت سے عملی طور پر ختم ہو چکا تھا۔ اگر آپ حالی کی مسدس اٹھا کر دیکھیں تو اس میں الطاف حسین حالی امت کے زوال کا رونا رو رہے ہیں۔ انہوں نے اس حوالے سے جو شاعری کی، وہ انتہائی دردناک ہے۔

اے خاصا خاصان رُسل ﷺ، وقت دعا ہے

امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

ہر دور میں کفر نئے بت بناتا ہے۔ فتح مکہ سے قبل، جب حضور ﷺ خانہ کعبہ کا طواف فرماتے تو اس وقت بھی وہاں تین سو ساٹھ بت موجود تھے۔ ہر بت کسی نہ کسی قبیلے، کسی نہ کسی نظریے کی نمائندگی کرتا۔ آج کے دور کے آزروں اور بت تراشوں نے بھی بڑے بڑے بت تراش رکھے ہیں۔ چونکہ یہ مسائل ایسے ہیں کہ اس سے پہلے کبھی امت کے مفکروں، دانشوروں یا مجددوں کو ان سے واسطہ نہیں پڑا تھا، کیونکہ یہ سارے بت بیسویں صدی کی پیداوار ہیں، کہ جس میں کمیونزم، سرمایہ دارانہ نظام، جمہوریت، آمریت، نیشنلزم، لبرل ازم، فاشزم، آزادیٔ نسواں اور آزادیٔ صحافت وغیرہ شامل ہیں، چنانچہ ان کا حل بھی اقبالؒ سے پہلے کسی نے پیش نہیں کیا۔ یہ اصطلاحیں اس سے پہلے انسانیت نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ مسلمان دنیا کے دانشور اور مفکر اس قابل ہی نہیں تھے کہ زوال کے دور میں ان سارے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکیں، ان بتوں کا تجزیہ کرسکیں اور ان کو پاش پاش کرسکیں۔ یہ دجال کا بہت بڑا فتنہ تھا۔ ہم دجال کے نظام کی بات کررہے ہیں، یہ طاغوت کا وہ نظام ہے کہ جس سے حضور ﷺ نے اور آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیاءؑ نے اپنی قوموں کو ڈرایا ہے۔

فتنے کے دور میں مجدد کا کیا کردار ہوا کرتا ہے؟ مجدد کا کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے فتنوں کا تجزیہ کرتا ہے، انکی شناخت کرتا ہے، امت کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور پھر انکا سدباب کرتا ہے۔ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں بت کو کس طرح توڑنا ہے اور کونسا متبادل راستہ یا حل موجود ہے۔

اس وقت کہ جب امت مسلمہ پہ گھٹا ٹوپ اندھیرا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی، خصوصاً ہند کے مسلمانوں پر، اس وقت حکیم الامت کا آنا اور مسلمانوں کو ان تمام فتنوں سے خبردار کرنا، کہ جو پوری دنیا سے بارش کے قطروں کی طرح امت پر برس رہے تھے، یقیناً اللہ کا ایک عظیم احسان تھا۔ ہم نے جن نظریات کا نام لیا ہے، مثلاً جمہوریت، قومیت، آمریت، اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام، حقوق نسواں وغیرہ، یہ سارے اس وقت بھی بہت بڑے بڑے فتنے اور بت تھے، اور مسلمان اس قابل ہی نہیں تھے کہ ان کو سمجھ پاتے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ مسلمانوں نے بھی انہی بتوں کو انجانے میں پوجنا شروع کردیا، کہ جس کے نتیجے میں امت، قومیت، لسانیت، نسلی عصبیت اور جغرافیائی حدود کی بنیاد پر تقسیم ہوگئی۔ خلافت کو توڑ کر انہوں نے کئی ملک بنائے۔ بڑے بڑے مسلمان دانشور اور مفکر اس وقت یا تو بصیرت کے اعتبار سے نابینا ہوگئے یا ان کی آنکھیں مغربی معاشرے، اسکی تہذیب اور تمدن کی چکا چوند سے اس قدر خیرہ ہوئیں کہ وہ اسلام کا نور دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد صیہونیوں نے ایک نئے عالمی نظام کا نقشہ تیار کیا کہ جس میں انہوں نے سیاسی، جغرافیائی اور معاشی طور پر پوری دنیا کو مختلف گروہوں میں تقسیم کردیا۔ ہر مملکت اپنے آپ کو کسی نہ کسی طاقتور سیاسی و معاشی بلاک سے وابستہ کرنے پر مجبور تھی اور اس کے

بغیر اسکی بقاء ممکن ہی نہیں تھی۔

اقبالؒ کا پیغام اس لیے آج بھی اہم ہے کہ اکیسویں صدی کے شروع میں بھی وہی کھیل دہرایا جا رہا ہے کہ جسکا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا تھا۔ آج بھی کم وبیش وہی حالات ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں دو معاشی نظام پوری دنیا پر مسلط تھے، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت۔ آج تقریباً سو سال گزرنے کے بعد ایک تو زمیں بوس ہو چکا ہے اور دوسرا ہونے کے قریب ہے۔ اب یہ دوبارہ ایک نیا عالمی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ پوری دنیا کا نقشہ ایک دفعہ پھر تبدیل کیا جا رہا ہے، اور اسی مقصد کیلئے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کے نام پر پوری دنیا پر جنگ مسلط کر کے اس کو تہہ و بالا کیا جا رہا ہے۔

یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں، بلکہ تیسری جنگ عظیم ہے۔ اس کا مقصد وہی ہے کہ جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں اپنا معاشی نظام قائم کیا۔ اِس وقت صیہونیوں کو، اپنے بینکاری نظام کو قائم رکھنے کیلئے، پوری دنیا کو تباہ و برباد کرنا ہے، کیونکہ اب یہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی بلاکس میں دنیا کو تقسیم نہیں کر سکتے، بلکہ اب یہ ایک واحد عالمی نظام بنانا چاہتے ہیں کہ جو صیہونیوں کے زیر اثر ایک عالمی حکومت ہو۔ وہ اپنے خیال میں اب اس تصور کی تکمیل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ یہ دجال کے نظام کی حتمی شکل ہے کہ جواب سامنے آ رہی ہے۔ اسی لیے آج اقبالؒ کے پیغام کو سمجھنا ہماری بقاء کیلئے اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔

....

آج بدنصیبی کیا ہے؟ ہمارے ملک میں بھی تمام دانشور، مفکر، ذرائع ابلاغ، سیاسی جماعتیں حتیٰ کہ مذہبی جماعتیں اور علماء بھی آج جمہوریت کا راگ الاپ رہے ہیں۔ یہ اس ملت اور امت کیلئے اتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ کئی نسلوں کے بعد بھی، اور ظاہری طور پر آزاد ہونے کے باوجود، ان کی فکریں غلام ہیں اور یہ اس مغربی معاشی اور سیاسی نظاموں سے اس قدر مرعوب ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے دانشور اس سوچ سے باہر ہی نہیں نکل پا رہے۔ ہماری باتیں لوگوں کو بہت سخت لگیں گی، مگر حقائق، حقائق ہیں۔ اقبالؒ نے بھی اسی المیے پر یہ مرثیہ کہا تھا:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

اب ہم صاف صاف بات کریں گے، اس لیے کہ امت اور ملت کو بیوقوف بناتے ہماری اشرافیہ کو بہت وقت ہو چکا ہے۔ ہمارے بہت سے لوگ جو مخلص ہیں، جو واقعی چاہتے ہیں کہ اس ملک و ملت کی بہتری کیلئے کچھ کر سکیں، وہ دین سے اتنے نابلد اور مغرب سے اتنے مرعوب ہیں کہ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ہمارے دین میں اسلامی فلاحی ریاست بنانے کیلئے کیا احکامات دیئے گئے ہیں۔ لہذا اپنے اخلاص کے باوجود وہ دوڑتے ہوئے اسی کفر کے نظام کی گود میں جا گرتے ہیں اور اسی طاغوت کو اپنے ہاں نافذ کرنے کی

The Middle East
1914
1922
Black Sea
RUSSIA
Istanbul
Gallipoli
OTTOMAN EMPIRE
Mediterranean
Beirut
Damascus
Baghdad
PERSIA
Suez
Jerusalem
CAIRO
Basra
Persian Gulf
EGYPT
Red Sea
ARABIA
Mecca
ANGLO-EGYPTIAN SUDAN
Hadramaut
SOVIET UNION
TURKEY
1923
SYRIA
1946
LEBANON
1943
Aleppo
Mosul
MESOPOTAMIA (IRAQ) 1932
PALESTINE
Damascus
Baghdad
Jerusalem
Sinai
KUWAIT
1961
EGYPT
1922
ARABIA
Mecca
YEMEN
1918
French
British
Italian
1923
Year of independence
500 km
DER SPIEGEL

کوششوں میں زندگی صرف کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ بہت زیادہ اہم ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے وہ سارے بت پاش پاش کیے ہیں کہ جن کو آج ہمارے حکمران اپنے دل و دماغ اور ایوانوں میں سجا کے رکھتے ہیں۔جن بتوں کو ہم نے سجا کے رکھا ہے، یہ آج کے لات و منات ہیں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

یعنی مسلمان امت اور ملت کا موازنہ مغرب سے نہ کرو، مغرب سے افکار نہ لو۔اپنے سیاسی و معاشی نظام کیلئے مغرب کی طرف دیکھنا چھوڑ دو۔حضور ﷺ کی قوم کی روحانی ساخت مختلف ہے، ہم ترکیب میں مصطفوی ہیں۔ہم جن اجزاء سے مل کر بنے ہیں، نوری ہیں۔ ہمارا مغرب کی جمہوریت اور آمریت کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں۔ ہمارا انکی تہذیب یا سرمایہ دارانہ اور اشترا کی نظاموں کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں۔ ہماری اخلاقیات اور تہذیب جدا ہیں۔

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار

وہ جب اکٹھے ہوتے ہیں تو قوم پرستی، لسانیت یا سیاسی و معاشی مفادات کی بنیاد پر۔مثال کے طور پر کوئی جرمن، فرانسیسی تاریخ کے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہماری تاریخ تھی۔کوئی فرانسیسی، ہسپانوی تاریخ سے متعلق یہ نہیں کہے گا کہ وہ ہماری تاریخ تھی، لیکن ہم مسلمان اگر خلافت عثمانیہ کی بات ہو تو کہتے ہیں کہ ''جب ہماری عثمانی خلافت قائم تھی......''، ''جب ہم سپین پر حکومت کرتے تھے......'' ''جب ہماری حکومت تھی چین سے لیکر سپین تک......'' کیوں؟ اس لیے کہ ہمارے خون میں، ہماری فکر اور سوچ میں اور ہماری روح کی گہرائیوں تک میں، یہ بات داخل ہے کہ ہم قومیت کی حدود سے نکل کر امت کی سطح پر سوچتے ہیں۔

قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

مسلمانوں کی اجتماعیت مذہب کی قوت سے مضبوط ہوتی ہے، قومی و لسانی عصبیت یا تعصّبات جاہلیہ سے نہیں۔

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اگر تم نے اپنے ہاتھ سے دین چھوڑ دیا تو پھر تمہاری جمعیت بھی بکھر جائے گی اور امت رسوا ہوگی۔اگر مسلمانوں کا اتحاد ٹوٹا اور ملت بکھر گئی تو پھر امت بھی تباہ ہوگی۔

اہل مغرب قومیت، لسانیت اور رنگ و نسل پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔اس قوم رسول ہاشمی ﷺ کا انحصار ان تعصّبات پر نہیں۔

جس جمہوریت یا آمریت کی آج بات کی جاتی ہے، اقبالؒ نے ان دونوں کو یکسر مسترد کیا ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظاموں کو بھی رد کیا ہے۔ اگر آزادیٔ افکار، آزادیٔ اظہار، آزادی صحافت، کی بات کرتے ہیں تو اقبالؒ نے ان سب کو بھی اڑا کر رکھ دیا ہے۔ اقبالؒ کو اسی لیے بعض لوگوں نے فاشسٹ بھی کہا ہے، خصوصاً ان لوگوں نے کہ جو اقبالؒ کی انقلابی فکر سے خوفزدہ ہیں۔ یاد رکھیے! اگر اقبالؒ کا پیغام پاکستانی یا مسلمان قوم میں پھیل گیا تو کفر کے سارے بت ٹوٹ جائیں گے۔ کفر کا پورا نظام اگر کسی ایک شخص سے خوفزدہ ہے تو وہ اقبالؒ ہیں۔

ہم آپ کو جمہوریت کی مثال دیتے ہیں۔ بعد میں ہم اقبالؒ کے تمام نظریات پر تفصیل سے بات کریں گے۔ آج پوری دنیا جمہوریت کا راگ الاپ رہی ہے۔ آئیں ذرا اقبالؒ سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس سے متعلق کیا کہتے ہیں:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

مغرب کا جدید جمہوری نظام کہ جو آج تمہیں نظر آ رہا ہے، یہ وہی پرانا راگ ہے کہ جو ایک مرتبہ پھر الاپا جا رہا ہے، کہ جس کی حقیقت وہی قیصر و کسریٰ کا ظلم و جبر اور استبداد ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جس کو تو آزادی کی نیلم پری سمجھتا ہے، درحقیقت وہ ظلم و استبداد کا ایک دیو ہے کہ جو انسانیت کو پیروں تلے روندھتا چلا آ رہا ہے۔

....

آیئے! اس مغربی جمہوری نظام کی اصل شکل بھی آپ کو دکھاتے ہیں۔ امریکہ کی عمر تقریباً سوا دو سو سال ہے۔ اس میں اس نے اپنی سرحدوں سے باہر ڈھائی سو سے زائد جنگیں لڑی ہیں۔ صرف پچھلے سو سال میں ہی کم از کم دس کروڑ انسان اس جمہوری نظام نے پوری دنیا میں قتل کیے ہیں اور یہ فساد ابھی جاری ہے۔ پوری دنیا کو تباہ و برباد کرنے والا یہ سودی سرمایہ دارانہ معاشی نظام جمہوریت ہی کی چھتری تلے چل رہا ہے۔ پوری دنیا کو معاشی طور پر اس طرح تباہ و برباد کیا گیا ہے، کروڑوں انسانوں کا خون اس بے دردی سے بہایا گیا ہے کہ انسانیت غرق ہو کر رہ گئی ہے۔ مغربی استعماری قوتوں کو دیکھیئے کہ انہوں نے شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا میں مقامی باشندوں کو کس بے دردی سے تہہ تیغ کیا۔ یہ ساری وہ مغربی تہذیب اور جمہوریتیں ہیں کہ جنہیں اقبالؒ بجا طور پر دیو استبداد کہتے ہیں اور جس کو ہمارے دانشور آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہیں۔

اسی طرح علامہ اقبالؒ کی مسولینی جیسے آمر سے بھی ملاقات ہوئی۔ مسولینی کہ جو اٹلی کا فاشسٹ حکمران تھا، نے اقبالؒ کو ملنے کو دعوت دی۔ اقبالؒ جب یورپ میں تھے تو ان کی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ بڑے بڑے حکمران ان کو بلا کر مشورے لیا کرتے۔ یورپ ہی کیا پوری دنیا

کے نامور حکمران اقبالؒ سے ملنے میں سعادت محسوس کرتے۔ مسولینی نے اقبالؒ کو بلا کر پوچھا کہ میری فاشسٹ تحریک کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ اقبالؒ نے اس کو جواب دیا کہ اسلام ڈسپلن کو بہت پسند کرتا ہے اور مسولینی نے اس فاشسٹ تحریک میں اپنی قوم کو بہت ڈسپلن دیا ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کو یہ نصیحت بھی کی کہ اس میں دین اسلام کی انسانیت بھی شامل کرو کہ جو تمہارے اس فاشزم کو نرم کرے اور اسے ایک انسان دوست تحریک بنائے۔ بلکہ انہوں نے یہ بھی مشورہ دیا کہ تم دنیا سے مسلمانوں کو بلا کر اٹلی میں آباد کرو اور اس طرح اپنے معاشرے میں نیا خون داخل کرو۔ اسلامی نظریہ، تہذیب اور معاشرت اٹلی میں تمہاری اس تحریک کو ایک رحمانی آمریت میں تبدیل کردیں گے۔اقبالؒ نے مسولینی کو ایک اور مشورہ دیا کہ اپنے شہروں کو زیادہ بڑا نہ ہونے دینا، اور جب ضرورت پڑے تو نئے شہر آباد کرلیا کرو۔ مسولینی بہت حیران ہوا اور پوچھا کہ یہ مشورہ آپ نے کس بنیاد پر دیا ہے؟ اقبالؒ نے کہا کہ یہ میری ذاتی رائے نہیں، یہ میرے آقا ﷺ کا حکم ہے کہ جب تمہارے شہر بہت بڑے ہو جائیں تو نئی بستیاں آباد کرلو۔ اقبالؒ نے مسولینی کو اسلام اور حضور ﷺ سے متعارف کروایا۔ آنے والے دور میں مسولینی نے اقبالؒ کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اٹلی میں کئی نئے شہر آباد کیے۔

شروع میں جب مسولینی نے ظلم وستم کا آغاز نہیں کیا تھا تو اس وقت وہ اقبالؒ کو بہت پسند تھا۔ انہوں نے کوشش کی کہ اس کی آمریت میں رحم کا عنصر شامل کر کے اسکو زیادہ انسان دوست بنایا جائے۔لیکن آنے والے وقتوں میں جب مسولینی مزید ظالم و جابر بن گیا، تو اقبالؒ نے بھی اس کے خلاف بڑی سخت باتیں کیں۔

علامہ اقبالؒ نے فاشزم،آمریت اور جمہوریت سب کو رگیدا۔ کہتے ہیں کہ:

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یعنی آمریت کا جلال ہو یا جمہوریت کا تماشا، جب سیاست سے دین نکال دیا جائے تو صرف ظلم واستبداد رہ جاتا ہے۔اس جدید مغربی جمہوریت کا بنیادی عنصر ہی یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھا جائے۔آمریت کا بھی بنیادی اصول یہی ہے۔اشتراکیت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام، دونوں ہی لادین ہیں،اور آج انہی دونوں نظاموں نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔

اب یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ایک اسلامی ملک کو لادین ریاست ہونا چاہیے یا ایک ملائیت؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس پر بیکار میں ایک طوفان برپا کیا جاتا ہے۔اس کو ہم اقبالؒ کے حوالے سے واضح کرتے ہیں۔اقبالؒ نے اس میں تو کوئی شک وشبہ ہی نہیں چھوڑا کہ جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔سیاست اور ریاست سے دین کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

تھیوکریٹک ریاست یا ملائیت کے حوالے سے دو تصورات کو ہم واضح کرنا چاہیں گے۔اسلام میں کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو ملائیت یا پاپائیت کہیں۔عیسائیت میں پادریوں کا ایک الگ طبقہ ہوتا ہے۔دین یا مذہب کی اجارہ داری صرف پادری کے پاس ہے۔اسی طور یہودیوں میں بھی مذہب کی اجارہ داری ان کے ربیوں کے پاس ہی ہے۔اسی طرح برہمن پنڈت ہندو مذہب کے ٹھیکیدار ہیں،مگر اسلام میں ایسا کوئی طبقہ نہیں ۔ہر مسلمان دین کی نمائندگی کرتا ہے۔اس لحاظ سے ایک اسلامی ریاست کبھی بھی ملائیت نہیں ہو سکتی،مگر اس اعتبار سے اس کو ایک تھیوکریٹک ریاست کہا جا سکتا ہے کہ اس میں قانون الہامی ہوتا ہے،اس بات کے باوجود کہ کوئی ملائیت نہیں ہوتی۔اگر ملا کی حکومت کو تھیوکریٹک ریاست کہا جاتا ہے تو اس لحاظ سے اسلام میں کوئی تھیوکریسی نہیں ہے۔لیکن اگر الہامی قانون کے نفاذ کو تھیوکریٹک ریاست کہا جائے تو پھر ایک اسلامی ریاست یقینی طور پر ایک تھیوکریٹک ریاست ہوتی ہے۔

....

یہاں پر ہم اقبالؒ کا ایک بہت ہی خوبصورت کلام آپ کے سامنے پیش کرنا چاہیں گے۔''ارمغان حجاز''اقبالؒ کی وہ کتاب کہ جوان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔اس میں ایک غیر معمولی مکالمہ ہے۔ان کے پورے کلام کا نچوڑ،ان کے سیاسی فلسفے اور فکر کا مغز اس نظم میں ملے گا کہ جس میں ابلیس بیٹھا ہے اور اس کی مجلس شوریٰ لگی ہوئی ہے۔اس کا کچھ حصہ ہم یہاں شامل کرتے ہیں۔گفتگو یہ ہوتی ہے کہ ابلیس کا ایک مشیر دوسرے مشیر، کہ جو مشیر سیاسیات ہے، سے پوچھ رہا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ جمہوریت آ رہی ہے، پہلے تو ہم پوری دنیا پر ظلم و جبر اور استبداد کا نظام بادشاہوں اور آمریتوں کے ذریعے قائم کیا کرتے تھے،مگر اب لوگوں میں شعور بڑھ گیا ہے، ذرائع ابلاغ ترقی کر گئے ہیں،فرانسیسی انقلاب کی وجہ سے نئے نئے تصورات اور نظریات اٹھے ہیں،اٹھارویں،انیسویں،بیسویں صدی میں لوگ

بیدار ہو گئے ہیں، لہذا اب ہم کس طرح لوگوں کو ایک بادشاہ کے نیچے، آمریت کے ذریعے قابو کریں گے؟ کیا تمہیں معلوم بھی ہے کہ دنیا میں نئے نئے فتنے کیسے پیدا ہو رہے ہیں؟

خیر ہے سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

یعنی یہ جو سلطانی جمہور کا شور شرابہ ہے، یہ ہمارے لیے بہتر ہے یا نہیں؟ ہمارے کفر کے نظام کیلئے بہتر ہے یا شر ہے؟ یعنی شیطان کا پہلا مشیر بھی شروع میں یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے آنے سے شیطانی نظام کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن سیاسیات کا جو صف اول کا مشیر ہے، وہ مسکرا کے جواب دیتا ہے کہ ہاں میں ان تازہ فتنوں سے باخبر ہوں، یعنی مجھے جمہوریت کا اچھی طرح علم ہے۔

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پر تو ہو، اس سے کیا خطر

میں نے جو پوری دنیا کو دیکھا ہے، زمانے کو دیکھا ہے، میرا تجربہ مجھے بتا رہا ہے، کہ جو آمریت ہی کی ایک شکل ہو، اس سے ہمیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر

ہم نے ہی تو بادشاہت اور آمریت کو جان بوجھ کر جمہوریت کا لباس پہنایا ہے، کہ جب انسان کو ذرا ہوش آیا، اور وہ بیدار ہونا شروع ہوا تو ہم نے اسے دھوکہ دینے کیلئے خود بادشاہت کو جمہوریت کے روپ میں پیش کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ:

کاروبار شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجود میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

دنیا میں حکومتوں کی حقیقت ظاہر میں کچھ اور ہے اور باطن میں کچھ اور۔ یہ جو نظام حکومت ہم چلا رہے ہیں، اس کا تعلق نہ بادشاہ سے ہے، نہ صدر سے، اصل میں تو سارا نظام ہم ہی پیچھے سے چلاتے ہیں۔ یہ چاہے اشتراکیت ہو، سرمایہ دارانہ نظام ہو یا جمہوریت ہو، اصل میں تو پس پردہ ہم ہی اس کی ڈوریں ہلا رہے ہیں۔

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

خواہ پارلیمان ہو یا بادشاہ کا دربار، اصل میں تو ہمارے نزدیک وہی سلطان ہے کہ جو دوسروں کا مال لوٹے اور جس کا مقصد دوسروں کے

تیل اور گیس کے ذخیروں پر قبضہ کرنا ہو، کہ جو دوسرے ملکوں پر حملہ کر کے تباہی و بربادی پھیلائے اور جو دنیا کے وسائل پر قبضہ کر کے ایک نیا عالمی نظام بنانے کیلئے دنیا کے نقشے تبدیل کرے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

ایک شیطان دوسرے شیطان سے کہہ رہا ہے کہ کیا تم نے مغرب کی جمہوریت نہیں دیکھی؟ اسکا چہرہ تو بہت روشن لگتا ہے، مگر اس کے باطن کو دیکھو تو چنگیز خان سے زیادہ تاریک ہے۔

اسی مجلس شوریٰ میں ایک مشیر دوسرے مشیر کو یہ حقیقت کھول کے بتا رہا ہے کہ ہم نے ہی یہ جمہوریت اور آمریت کے نظام قائم کیے تھے اور جب انسان میں ذرائع ابلاغ کی وجہ سے کچھ شعور آیا اور وہ پڑھ لکھ گیا، جدید دور آیا، ٹیکنالوجی آئی، ذرائع ابلاغ نے ترقی کی تو انسان کو اندھا کرنے کیلئے ہم نے خود ہی نئے نئے فکری اور سیاسی فتنے ایجاد کیے کہ جن میں جمہوریت بھی ایک ہے۔

کیا ہم اس کی مثال نہیں دیکھتے کہ اسی جمہوریت نے عراق پر حملہ کیا۔ یہ لوگ کس بے دردی سے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو صرف عراق میں شہید کر چکے ہیں اور چالیس لاکھ سے زائد مسلمان ہجرت پر مجبور ہیں۔ اب یہی جنگ پھیلا کر پورے مشرق وسطیٰ میں مسلط کر دی گئی ہے، اور کروڑوں مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ہیں۔ اس سے قبل روسی آمریت نے بھی افغانستان میں پندرہ لاکھ مسلمان شہید کیے۔ مسلمانوں کا خون تو یہ لاکھوں میں بہاتے ہیں۔ جمہوریت اور سیکولرازم کے نام پر بدترین ظالم اور فاشسٹ حکومت کہ جو انسانیت پر دھبہ ہے، وہ بھارت کی حکومت ہے، کہ جہاں دلیت، سکھوں، مسلمانوں، عیسائیوں اور نکسلیوں کے ساتھ وہ سلوک ہو رہا ہے کہ اللہ کی پناہ! اور یہ سب جمہوری لباس میں ہو رہا ہے۔

....

اقبالؒ مسلمانوں کو کیا متبادل حل پیش کرتے ہیں؟ اقبالؒ نے ایک نئی غیر معمولی اصطلاح استعمال کی ہے کہ جس پر دنیا کا کوئی دانشور بات نہیں کرتا۔ انہوں نے ''جمہوریت روحانی'' (Spiritual Democracy) کی بات کی ہے کہ جسے ہم ''آمریت رحمانی'' (Benevolent Dictatorship) بھی کہہ سکتے ہیں۔ جمہوریت اور آمریت کو رد کرتے ہوئے ایک نیا تصور کہ جس کو وہ خلافت بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں کا جو تصور خلافت کا ہے، وہ نہ تو آمریت ہے اور نہ ہی مغربی جمہوریت۔

خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
خلافت حفظ ناموس الٰہی است
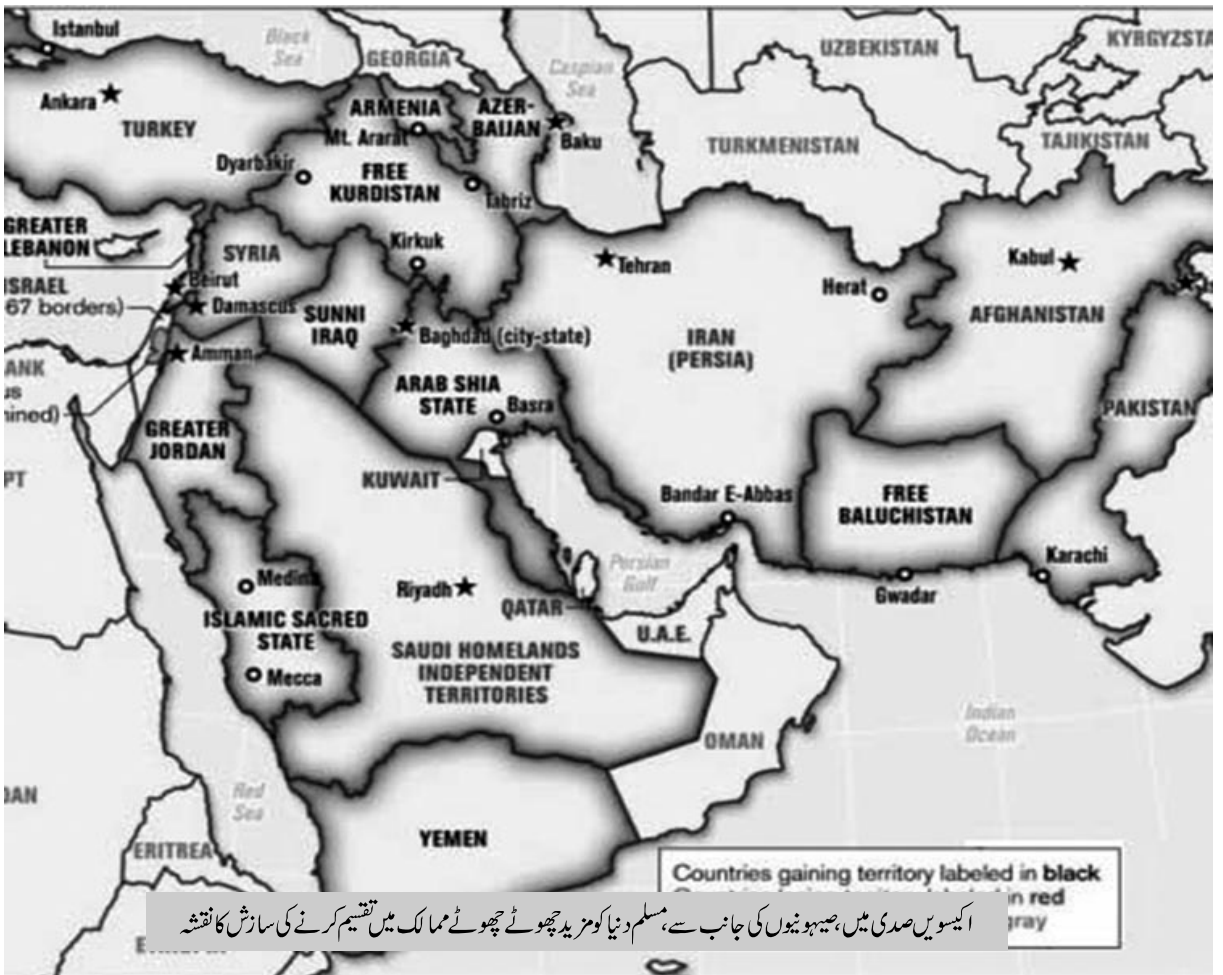
اکیسویں صدی میں، صیہونیوں کی جانب سے، مسلم دنیا کو مزید چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کرنے کی سازش کا نقشہ

ہمارے لیے خلافت ہی دلیل ہے اور اس کے مقابلے میں بادشاہت ہمارے لیے حرام۔ جو آمریت، ملوکیت اور بادشاہتیں ہیں، وہ صرف ظلم ومکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ خلافت اللہ سبحان وتعالیٰ کے دین کی آبرو کی محافظ ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک متبادل حل روحانی جمہوریت یا رحمانی آمریت ہیں۔ یہ دو اصطلاحتیں حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ اسلام نے اس بات پر کوئی پابندی نہیں لگائی ہے کہ حکمران کیسے منتخب ہوں۔ صرف یہ شرط ہے کہ قانون قرآن وسنت کا ہو، انسانیت پر عدل قائم ہو، شریعت نافذ ہو، محبت اور پیار ہو، اقلیتیں محفوظ ہوں، جان، مال اور عزت کی حفاظت کی ضمانت ہو، الغرض اللہ کی تمام مخلوقات حتیٰ کہ جانور اور پرندے بھی ایک عادل حکمران کے سائے میں سکون سے زندگی بسر کریں۔

مسلمانوں نے اپنے عروج کے دور میں یہی نظام دنیا کو دیا تھا۔ ہماری اعلیٰ ترین تہذیبیں، خلافت راشدہ سے شروع ہوکر چودہ سو سال کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی مغربی جمہوریت کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ہر دور میں جو عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں وہ یا تو رحمانی آمریتیں تھیں یا روحانی جمہوریتیں۔ اس سے بڑی روحانی جمہوریت کی مثال کائنات میں کوئی دے سکتا ہے کہ خلیفۂ وقت سے سوال کرلیا جائے کہ آپ کے وجود پر دو چادریں کہاں سے آئی ہیں جبکہ سب کو ایک ایک چادر ملی ہے؟ اس سے بڑی کوئی رحمانی آمریت ہوسکتی ہے کہ مصر اور شام کا سلطان، صلاح الدین ایوبیؒ، کہ جو پوری دنیا میں صلیبیوں سے لڑ رہا ہو، میدان جنگ میں ایک عیسائی عورت کے بچے کے گم ہونے پر آنسوؤں سے روئے اور پھر اس بچے کو ڈھونڈ کر ماں کے حوالے کردے۔

مسلمانوں کا تصور حکومت مغرب سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں یا تو رحمانی آمریت ہے یا روحانی جمہوریت، نہ کہ لادین جمہوریت اور چنگیزی آمریت! اس نقطے کو اقبالؒ نے جس طرح واضح کیا ہے، وہ اقبالؒ کا ہی کمال ہے۔

مسجد قرطبہ، سپین

۶

بے ید بیضاء ہے پیران حرم کی آستین

گزشتہ باب میں ہم نے فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں جمہوریت اور آمریت کے باطل تصورات کا جائزہ لیا۔ یہ جدید طاغوتی نظام کہ جو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے باہم تصادم پر مبنی تھا، اور جسے کفر نے بیسویں صدی کے اوائل میں قائم کیا، تقریباً سو سال چلا۔ بیسویں صدی کے آخر میں اشتراکیت ختم ہوگئی اور سرد جنگ کے خاتمے پر سوویت یونین بھی ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد اب اکیسویں صدی میں یہ ایک مرتبہ پھر اپنا نیا عالمی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، لیکن اب کی باران کے سامنے کچھ مشکلات ہیں۔ دقت یہ آگئی ہے کہ پہلے یہ اشتراکیت اور آمریت کو ایک نظریئے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا کرتے تھے، کہ جو انکی ''آزاد دنیا'' اور جمہوریت سے متصادم تھا۔ اشتراکیت کو یہ ایک ایسی لادین فکر کے طور پر پیش کرتے کہ جو انکی ''عیسائی'' اخلاقیات کا متضاد ہو۔

مگر اب اس سرمایہ دارانہ، جمہوری، صیہونی بینکاری پر مبنی نظام کے سامنے جو سب سے بڑا نظریاتی خطرہ ہے، وہ ایک لادین فکر نہیں بلکہ اسلام ہے۔ اسلام اب ایک عسکری قوت بھی بن چکا ہے۔ پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے اور دشمنوں کو خطرہ یہ ہے کہ دوسرے اسلامی مما لک بھی، پاکستان کی مدد سے، ایٹمی طاقتیں بن جائیں گے۔ نظریاتی طور پر بھی یورپ اور امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین اسلام ہے۔ اسلام اپنے اندر یہ صلاحیت اور قوت رکھتا ہے کہ جمہوریت، آمریت، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں، اپنا الگ روحانی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام پیش کر سکے۔ ہمارے پاس چودہ سو سال کا شاندار ماضی اور تاریخ موجود

ہے، کہ جس کے باعث کفار کو یہ خوف اور خطرہ لاحق ہے کہ مسلمان دنیا نظریاتی قوت تو پہلے ہی تھی اور اب ایک عسکری طاقت بھی بن چکی ہے۔ اگر یہ خلافت کے نام پر اکٹھے ہو کر ایک بہت بڑی مسلم یونین یا بلاک بن گئے، تو پھر صیہونیوں کا کفر کا یہ نظام کیونکر قائم رہ پائے گا؟ کفار نے اس کا حل یہ نکالا کہ اگر اسلام کے سیاسی، عسکری اور نظریاتی تصور کو تباہ کر دیا جائے، تو پھر اس خطرے کا سدباب ممکن ہو سکے گا۔

اب چونکہ یہ لوگ اسلام کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظریہ نہیں لا سکتے، تو اس کا علاج اس سرمایہ دارانہ بینکاری صیہونی نظام اور نام نہاد جمہوری دنیا نے یہ نکالا ہے کہ پوری دنیا پر ایک ہی نظام مسلط کر دیا جائے۔ نئے عالمی نظام میں وہ ایک واحد عالمی حکومت کی بات کر رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں ہی انہوں نے دنیا کو دو بلاکس میں تقسیم کر دیا تھا۔ اب چونکہ دوسرا بلاک نہیں رہا اور اسلام ان کے مقابلے پر آ کھڑا ہوا ہے، لہٰذا اسلام اب ان کے سامنے سب سے بڑا نظریاتی اور عسکری حریف ہے۔

ان سارے فتنوں کو، کہ جو سو سال بعد پیدا ہونے تھے، اقبالؒ نے ۱۹۱۸ء میں ہی دیکھ لیا تھا، انکی نشاندہی کر دی تھی، ان کا حل بھی بتا دیا تھا، اور مسلمانوں کو اس وقت متنبہ بھی کر دیا تھا کہ آنے والے وقتوں میں تمہارا براہ راست تصادم سرمایہ داری اور سود کے نظام سے ہوگا۔ یہ اشتراکیت، روس کا انقلاب، بالشیوک انقلاب، یہ سب آنکھوں میں دھول جھونکنے والی باتیں ہیں۔

....

اس زمانے میں کہ جب روس میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بالشیوک انقلاب برپا ہوا تو اس نے پوری دنیا کو اس انقلاب کے رومان میں مبتلا کر دیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اگر انقلاب برپا کرنا ہے تو روس کے انقلاب کو دیکھو، کہ جس کے بعد وہاں ایک ایسی حکومت قائم ہوئی ہے کہ جس میں ریاست ہی تمام وسائل کی مالک ہے اور جہاں تمام انسانوں کے ساتھ سودی سرمایہ دارانہ نظام کے برعکس، مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے۔

اقبالؒ بڑے غور اور دلچسپی سے اس سارے طوفان کو دیکھ رہے تھے۔ روس، اور اسکے انقلاب سے متاثر افراد کو مخاطب کر کے انہوں نے بڑی حکیمانہ باتیں کہیں۔ سیاسیات کے حوالے سے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کے سیاسی مشیر نے جمہوریت اور آمریت کا موازنہ کیا تھا۔ اسی طرح اس نظم میں اقبالؒ نے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی معیشت کا موازنہ کیسے کیا اور ابلیس اس میں اپنے کیا راز کھولتا ہے، آیئے اقبالؒ سے بات کر کے جانتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ رفتار

قوموں کے عروج و زوال کے جو اسباب ہیں، جس طرح انسانوں کو قومیتوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، نئے نئے نظریات اور ملک ترتیب پا

بالشیوک انقلاب

رہے ہیں۔ مجھے اس سے نظر یوں آتا ہے کہ روس میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ بلا وجہ نہیں، یقیناً اس کے پیچھے کچھ راز چھپے ہیں۔

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

انسان کی حرص وہوس نے جو راز چھپا کر رکھے ہوئے تھے، جوان صیہونی بینکاروں اور اس اشتراکی نظام نے اپنے آپکو قائم کرنے کیلئے مختلف منصوبے بنائے تھے، وہ راز اب آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو رہے ہیں۔

پہلے دنیا میں صرف ایک ہی نظام نظر آیا کرتا تھا، بادشاہت۔ پھر اس کو جمہوریت کا روپ دے دیا گیا۔ اب پھر سرمایہ داری نظام کو اشتراکیت کا روپ دیا جارہا ہے۔ یہ راز اب آہستہ آہستہ دنیا کے سامنے کھلتے جارہے ہیں۔ یہ ڈرامہ دنیا کو تقسیم کرنے کی غرض سے رچایا جارہا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

مرد مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ دیکھو! تم اس سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے انقلاب سے متاثر نہ ہونا۔ بالشیوک انقلاب اور اس مغربی جمہوریت کی قبا سے دھوکہ نہ کھانا۔ قرآن میں غوطہ زن ہو جاؤ۔ قرآن کی معرفت حاصل کرو۔ حضور ﷺ کی سنت اور سیرت سے حکمت اور علم سیکھو، اللہ تمہیں جدت کردار عطا کرے، وہ فہم اور فراست دے کہ تم حقیقت کا ادراک کر سکو۔

جو حرف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

یہ جو معاشی نظاموں کی بات ہوتی ہے تو سرمایہ داری نظام کہتا ہے کہ ہم دولت کو سمیٹ کر رکھیں گے، دولت چند ہاتھوں میں ہی محدود رہ سکتی ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ ساری دولت حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے جو اپنا معاشی نظام دیا ہے، اس کا راز قرآن کی آیت ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے، کہ جو مال تمہارے پاس فالتو ہے وہ تم اللہ کی راہ میں اپنی مرضی سے تقسیم کر دو، خرچ کر دو۔ تمہیں مال رکھنے کا اختیار تو دیا گیا ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ ترغیب بھی دی گئی ہے کہ اپنی ضرورت سے زیادہ مال جمع نہ کرو۔ یہ روحانی نظریہ اور تصور نہ تو اشتراکیت ہے، کہ جہاں ذاتی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں، اور نہ ہی سرمایہ داری، کہ جہاں لوگ قارون کا خزانہ جمع کر کے بیٹھ جائیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کریں۔ اقبالؒ یہ بات واضح کرتے ہیں کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام کو نافذ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ:

ای کہ می خواہی نظام عالمی
جستہ ئی او را اساس محکمی؟

تم وہ کہ جواشترا کی یا سرمایہ داری نظام کونافذ کرنا چاہتے ہو،اس کی بنیاد کس عقیدے پر رکھتے ہو؟اس کی اساس کیا ہے؟

داستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب

تم ایک پرانی گلی سڑی بوسیدہ داستان کو اب دوبارہ ایک ایک باب کر کے کھول رہے ہو،اسی پرانے نظریے کو کہ جو صدیوں سے انسان کا استحصال کرتا چلا آرہا ہے۔اگر تم حقیقت جاننا چاہتے ہو تو ''ام الکتاب'' کی طرف رجوع کرو،قرآن کی طرف رجوع کرو،تمہاری فکر اسی نور سے روشن ہو سکتی ہے۔

اقبالؒ نے روسی انقلاب اور مغربی جمہوریت ، دونوں پر ہی شدید طنز کیا ہے۔بالشیوک انقلاب اور اشترا کی نظریئے کو تو انہوں نے اڑا کر رکھ دیا۔کہا کہ تم سمجھ رہے ہو کہ تم انقلاب بر پا کر رہے ہو،لیکن حقیقت میں انسان کا استحصال کرنے والا یہ ویسا ہی نظام ہے کہ جیسے انہوں نے مغرب میں استبداد کو جمہوریت کی قبا پہنا کر قائم رکھا ہوا ہے،اور جس کو وہ آزادی کی نیلم پری کہتے ہیں۔اقبالؒ نے جمہوریت کے بارے میں کہا کہ یہ ظلم واستبداد اور جبر کا ایک دیو ہے کہ جو پاؤں مارتا چلا آرہا ہے اور تم احمق لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ جمہوریت تمہیں آزادی دلائے گی۔ پھر اس کے بعد دنیا نے بھی دیکھا کہ صرف دو عظیم جنگوں سے لیکر اب تک کم از کم دس کروڑ انسان اس جمہوریت اور اشترا کیت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور پوری دنیا میں انسانیت کو غلام بنا دیا گیا ہے۔

....

اس کے بعد اقبالؒ ابلیس کی مجلس شوریٰ میں جاتے ہیں اور یہاں بڑی غیر معمولی گفتگو ہوتی ہے۔یہ ایک انتہائی مسحور کن کلام ہے۔

اب اسی ابلیس کی مجلس شوریٰ میں مشیر اقتصادیات کی باری آتی ہے۔پہلے چونکہ سیاسیات سے متعلق بات تھی اور جمہوریت اور آمریت کا موازنہ کرنا تھا، چنانچہ مشیر سیاسیات بول رہا تھا۔اب مشیر اقتصادیات اشترا کی اور سرمایہ داری نظام کا موازنہ پیش کرتا ہے۔ظاہر ہے کہ جب اشترا کی نظام شروع ہوا،تو ابلیس کے مشیروں کو بھی خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا یہ سود اور رباء کی بنیاد پر قائم صیہونی بینکاری نظام، کہ جہاں دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو کر رہ جاتی ہے،اشترا کیت کے ہاتھوں ختم نہ ہو جائے۔اس کے جواب میں ابلیس نے زور دے کر کہا کہ ہمیں اشترا کیت سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اشترا کیت کی حقیقت کیا ہے،اور ہمیں خطرہ کس نظام اور نظریئے سے ہے۔

جانتا ہوں جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں، اسلام ہے!

یہاں پر ابلیس، کہ جو دنیا کے عروج و زوال کو جانتا ہے، قوموں کی حقیقتوں کو جانتا ہے، جس کو پتہ ہے کہ کس نظریئے کی کیا حقیقت ہے، اور جو اچھی طرح جانتا ہے کہ سوشلزم، اشتراکیت اور باقی جتنے بھی ازم آ رہے ہیں، وہ اسکے نظام کیلئے خطرہ نہیں ہیں، وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ ہمیں نظریاتی خطرہ صرف اسلام سے ہے۔

یہ بات ۱۹۳۰ء کی دہائی میں کہی جا رہی ہے کہ جب خلافت عثمانیہ ٹوٹ کر بکھر چکی تھی، ملت اسلامیہ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا اور روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ اس وقت ابلیس کہتا ہے کہ آنے والے دور میں سرمایہ دارانہ نظام کو اصل خطرہ صرف اسلام سے ہے۔

جب ابلیس نے اپنے تمام مشیروں کو یہ بتایا کہ آنے والے دور میں تمہیں اسلام سے خطرہ ہوگا، اشتراکیت سے نہیں، تو وہ ذرا حیران ہوئے۔ بعد میں ابلیس نے ان کو سمجھانا شروع کیا کہ میں یہ کیوں کہتا ہوں کہ آنے والے دور میں تمہیں اسلام کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی نظام سے ہی اصل خطرہ ہوگا۔ مگر اس سے پہلے اقبالؒ کے الفاظ میں ابلیس مسلمانوں کی موجودہ صورتحال پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندہء مومن کا دیں

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس امت کی فکر کا مرکز اب قرآن نہیں رہا۔ یہ امت بھی آج سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے پیچھے چلی جا رہی ہے، مال و دولت جمع کرنے میں لگی ہے، زکوۃ نہیں نکالتی، وراثت تقسیم نہیں کرتی، یہ بھی وہی کاغذی کرنسی اور صیہونی بینکاری نظام استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کا لین دین بھی حقیقی دولت پر مبنی نہیں ہے، ان کی ساری دولت لوٹ لی گئی ہے، سونا ان سے لیکر ردی کاغذ ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ اس کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے ابلیس مزید کہتا ہے:

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیران حرم کی آستیں

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مشرق میں جہاں اسلام ہوا کرتا تھا، وہاں اب مسلمانوں کے علماء اور دانشوروں کے پاس ید بیضا نہیں ہے، یعنی موسیٰؑ کے معجزات نہیں ہیں۔ ان کے پاس وہ عشق رسول ﷺ کی تڑپ اور مومن کا وہ جلال و جمال نہیں ہے کہ جو ان کو صاحب فراست بنا سکتا۔ گو کہ مسلمان اپنی روحانیت کھو چکے ہیں مگر اس کے باوجود ابلیس اپنے شیطانی نظاموں کو اسلام سے درپیش خطرے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

آج کے دور کے تقاضوں مثلاً ٹیکنالوجی کی ترقی، ذرائع ابلاغ، کتب خانے، لوگوں میں علمی بیداری سے ہمیں خطرہ ہے کہ سرمایہ دارانہ

نظام اور اشتراکیت کے جو شیطانی راز ہم نے چھپا رکھے تھے اور جمہوریت کو جس طرح ہم نے پوری دنیا کے سامنے آزادی کی ایک نیلم پری بنا کر پیش کیا تھا، کہیں یہ فاش نہ ہو جائیں۔ کہیں مسلمان اس سارے نظام کا موازنہ قرآن وسنت سے کرنا نہ شروع کر دیں، اور نتیجتاً شرع پیغمبری عام ہو جائے۔

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

اب ابلیس اپنے مشیروں کو شریعت پیغمبری سے سو مرتبہ محتاط رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا نظام ہے کہ جو عورت کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتا ہے، مرد کو جلال اور طاقت وقوت بخشتا ہے، اور اسکی تربیت کر کے اسکو ایک مرد آزاد بناتا ہے۔ جبکہ ہم عورتوں کی عزت و آبرو کا سودا کرتے ہیں، مردوں کو بے ضمیر اور بے غیرت اور قوموں کو غلام بناتے ہیں۔ ہمیں اس شریعت سے خطرہ ہے کہ جو عورتوں کو باحجاب، باکردار بنا دے، ایسی مائیں پیدا کرے کہ جو اقبالؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور محمود غزنویؒ جیسے بیٹے پیدا کرنا شروع کر دیں۔ ہمیں اس شرع پیغمبری سے خطرہ ہے۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں

یہ ایک ایسی شریعت ہے کہ ہر قسم کی غلامی، کہ جو انسان کی بنائی ہوئی ہو، کیلئے موت کا پیغام ہے۔ اگر کوئی نظریہ انسان کو حقیقی معنوں میں آزاد کرتا ہے تو وہ شریعت ہے۔ اس میں نہ انسان جمہوریت کا غلام ہوتا ہے، نہ آمریت، اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام اور نہ ہی فاشزم کا۔ اس میں نہ کوئی خاقان ہوتا ہے، نہ کوئی بادشاہ اور نہ ہی کوئی فقیر، بلکہ سب برابر ہوتے ہیں۔ معاشرے میں مساوات اور نظام عدل قائم کر دیا جاتا ہے اور دولت کو ہر غلاظت سے پاک کیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ نکالی جاتی ہے، صدقات دیئے جاتے ہیں، وراثت تقسیم ہوتی ہے، عشر دیا جاتا ہے اور اس کیلئے اسلام، دولت مندوں کو مال و دولت کا مالک نہیں بلکہ امین بناتا ہے۔ یہ فکر و عمل کا اتنا بڑا انقلاب ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی انقلاب ممکن نہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں

یعنی انسان کو یہ بتا دیا جائے کہ یہ زمین بادشاہوں کی نہیں بلکہ اللہ کی ہے۔ دنیا کو یہ بتا دیا جائے کہ پارلیمان سپریم نہیں، قرآن وسنت سپریم ہے۔ دنیا کو یہ بتا دیا جائے کہ بادشاہ وقت حاکم اعلیٰ نہیں، اللہ احکم الحاکمین ہے۔ دنیا کو یہ بتا دیا جائے کہ یہ زمین اللہ کی ملکیت ہے، مسلمان جہاں چاہیں، ہجرت کر کے جاسکتے ہیں، ویزے اور پاسپورٹ کی ان کو ضرورت نہیں ہوتی۔ پوری اسلامی دنیا میں مسلمان پر ویزے کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ مسلمانوں کو قومیت کی بنیاد پر کسی خاص جغرافیے میں بھی مقید نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شخص کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور پورا عالم اسلام اسکا گھر ہے، پورا جہان اس کا میدان عمل۔ مسلمانوں کی نسبت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت کی بنیاد پر ہے، قومیت، لسانیت یا کسی بھی قسم کی عصبیت پر نہیں۔ ابلیس کہتا ہے کہ اگر یہ بات عام ہوگئی، تو ہمارا پورا نظام اور اس کے تمام بت تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

ابلیس کہتا ہے کہ یہ انتہائی ضروری ہے کہ پوری دنیا اس قانون، اس آئین سے محروم رہے۔ کوشش کرو کہ پوری دنیا سے قرآن وسنت کے یہ قوانین اور تعلیمات چھپی رہیں اور مسلمان خود یقین سے محروم رہیں۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسے اور شک اٹھیں کہ کیا آج کے دور میں بھی ہم وہ اسلامی سیاسی، معاشی، عسکری نظام قائم کر سکتے ہیں کہ جو پوری مسلمان امت کو متحد کر دے۔ کیا آج سونے اور چاندی کے سکے آسکتے ہیں؟ کیا آج حقیقی دولت پر مبنی معاشی نظام قائم کیا جاسکتا ہے؟

اب ابلیس کے مشیر پوچھتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے کہ ہم مسلمانوں کو آئین پیغمبری اور شریعت سے محروم کر دیں؟ ان کو خرافات میں الجھا دیں۔ کیا کریں کہ مسلمان ہمارے سرمایہ داری اور اشترا کی معاشی نظام، آمریت اور جمہوریت کے فراڈ اور اس کے دھوکے میں پھنسے رہیں؟ تو ابلیس ان کو مزید ایک راز بتاتا ہے کہ ان کو ایسے ایسے مسائل میں الجھا دو کہ جو ظاہراً بڑے علمی نظر آئیں، لیکن حقیقت میں میدان عمل سے ان کا کوئی واسطہ اور تعلق نہ ہو۔

علامہ اقبالؒ حکیم الامت ہیں، وہ امت کے تمام امراض سے بخوبی واقف ہیں، چنانچہ یہاں وہ ابلیس کی زبان میں ان فتنوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر آج آپ اپنے آس پاس دیکھیں تو مسلمان امت انہی خرافات میں پھنسی ہوئی ہے۔

ابن مریم مرگیا یا زندہء جاوید ہے
ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات؟

حضرت عیسیٰؑ کا انتقال ہوگیا تھا یا وہ زندہ و جاوید آسمان پر اٹھالیے گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کی صفات اللہ کی ذات سے جدا ہیں یا ذات کا حصہ ہیں؟ یہ ایسی فلسفیانہ موشگافیاں اور علمی بحثیں ہیں کہ جن کا کوئی فائدہ اس دنیا کے کارزار میں مسلمانوں کو نہیں۔

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟

جن عیسیٰؑ کو اس دنیا میں تشریف لانا ہے، ان سے مراد وہی عیسیٰؑ ہیں کہ جو اٹھا لیے گئے تھے یا کوئی ایسے مجدد آئیں گے کہ جن میں حضرت عیسیٰؑ کی صفات ہونگی؟

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

قرآن پاک کے الفاظ حادث ہیں یا قدیم؟ یعنی وہ بنائے گئے تھے یا ہمیشہ سے تھے۔ امت کی کس عقیدے میں، کس فرقے میں نجات ہے؟ کونسا فرقہ ناجی ہے، کہ جو بچالیا جائیگا، اور کونسا فرقہ جہنم میں جائے گا؟ آج ہر فرقہ دوسرے پر تکفیر کے فتوے جاری کر رہا ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ مسلمانوں کو انہی بحثوں اور موشگافیوں میں الجھا دو اور انہیں میدان عمل سے ہٹا دو، اور پھر ان سے کہتا ہے کہ:

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

جس طرح خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے اور اس وقت کے مشرک ان کو پوجتے تھے، آج کے مسلمانوں کیلئے بھی تمہیں ویسے ہی بت تیار کرنا ہیں کہ جنہیں آج کا مسلمان پوجے، ایسی بحثوں میں پڑ جائے کہ جن میں فقط دنیا و آخرت کا خسارہ ہے۔ یاد رکھیے گا! بغداد میں جب ہلاکو خان کی فوجیں آرہی تھیں تو وہاں بھی اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔ وہاں کے علماء یہ بحث کر رہے تھے کہ اگر سور بکری بن کر آجائے تو اس کا گوشت کھانا جائز ہوگا یا نہیں۔ جب کوئی قوم اس سطح کی گفتگو تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے ایسے تباہ کرتا ہے کہ اس کا نام ونشان بھی مٹ جاتا ہے۔ پھر ابلیس اپنے مریدوں کو مزید نصیحت کرتا ہے:

تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

میدان عمل میں مسلمان کے کردار کی تعمیر نہ ہونے دینا۔ اس کو ایک صاحب کردار، مرد مجاہد، صاحب یقین، شاہین نہ بننے دینا۔ اس کو ایسی گفتگوؤں اور خرافات میں پھنسا کر رکھنا کہ عملی زندگی کے کسی پہلو میں بھی یہ کامیاب نہ ہو سکے اور زندگی کے ہر محاذ پر شکست کھاتا چلا جائے۔

خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہان بے ثبات

یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان ہر قسم کے نظریئے، ہر قسم کے ''ازم''، ہر قسم کی غلامانہ فکر میں پھنسا رہے۔ یہ دنیا بے شک بے ثبات ہے، تباہ ہونے والی ہے لیکن اسی دنیا میں مسلمان کو ڈیوٹی کیلئے بھیجا گیا ہے۔ مسلمانوں کو دنیا میں اپنی ڈیوٹی سے غافل رکھو، خانقاہی نظام

یا خرافات میں مست کردو۔ اس کو ایسے زہد اور عبادت میں لگا دو کہ جو اس کو حقیقی میدان عمل اور کشمکش حیات سے دور رکھے۔

وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

اس کو ایسی شاعری، ایسے تصوف، ایسے مذہبی عقیدوں میں گم کر دو کہ جو اس دنیا کی کشمکش، جہد مسلسل، یعنی جہاد سے اس کو دور رکھے۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

میں اس امت کی بیداری سے ہر لمحہ خوف کھاتا ہوں۔ یہ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے آخری الفاظ ہیں کہ جن میں اقبالؒ ابلیس کی زبانی بیان کرتے ہیں، کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ امت کہیں بیدار نہ ہو جائے، کیونکہ اس امت کا دائرہ اختیار پوری کائنات ہے۔ اس کو، خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے، پوری کائنات کے احتساب کا اختیار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ابلیس آخری نصیحت کرتا ہے:

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

اس کے مزاج میں رہبانیت پیدا کر دو کہ یہ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر صرف اپنے ذکر و عبادات میں ہی مست رہے، اور دنیا میں کشمکش حیات اور جہاد کے ذریعے کوئی انقلاب نہ برپا کرنے پائے۔ ان کو یوں پھنسا دو کہ یہ جہاد، سیاست اور معیشت کی طرف سے غافل ہو جائیں۔ روزے، حج اور عمروں میں اتنے مشغول ہوں کہ ان کو یہ علم ہی نہ ہو کہ وہ طاغوت کے نظام کے غلام بنا دیئے گئے ہیں۔

....

اقبالؒ نے ایک اور مقام پر ایک آزاد مرد مجاہد اور ایک خانقاہی نظام میں مست راہب کا یہی فرق بتایا تھا کہ جس سے کفر کو کوئی خطرہ نہیں۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا پیوستہ زمین پہ تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اقبالؒ نے یہاں موازنہ کیا ہے، ایک مرد مجاہد اور ایک شاہین شہہ لولاک ﷺ کا، کہ جو پوری کائنات کا احتساب کرتا ہے، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل بلند کرتا رہتا ہے، اس شخص سے کہ جو پیوستہ زمین تسبیح و مناجات میں ہی لگا رہتا ہے۔ ایسے بے عمل راہبوں میں، اور

پتھروں اور درختوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسکے مذہب کی حیثیت وہی ہے کہ جو ملا کے مذہب کی ہے، کہ جو جمادات و نباتات اور کیڑے مکوڑوں کا مسلک ہے۔

اقبالؒ نے دونوں سیاسی اور معاشی نظریوں، سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت، اشتراکیت اور آمریت، سب کی اصلیت مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دی اور بتا دیا کہ یہ تمام کے تمام ابلیس کے بنائے ہوئے نظام ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے حوالے سے اس صیہونی بینکاری کو، کہ جس کو یہودی کنٹرول کرتے ہیں، اقبالؒ کئی مقامات پر کہہ چکے ہیں کہ فرنگ کی رگ جاں پنجہء یہود میں ہے۔

اقبالؒ نے مغربی تہذیب کے حوالے سے یہ بھی کہا کہ یہ پوری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی۔ مغرب تہذیب پر آپکی بڑی گہری نگاہ تھی اور اتنی ہی شدید تنقید بھی۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہء حیوان ہے یہ ظلمات

آج پوری دنیا مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔ پوری چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ لاکھوں مسلمان اپنی مرضی سے ہجرت کر کے دارالاسلام چھوڑ کر دارلکفر میں آباد ہو رہے ہیں۔ مغربی تہذیب نے اتنا پرکشش جال پھیلایا ہے کہ مسلمان اپنے گھروں کو

چھوڑ چھوڑ کر خود کفر کے نظام میں جا بستے ہیں اور اپنے دین اور ایمان کو خطرے میں ڈال لیتے ہیں اور جب ان کی اولادیں لادین ہو کر ان کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں تو ان کیلئے ایک بحران بن جاتا ہے۔لیکن مغرب نے یہ نظام بنایا ہی کچھ یوں ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔

علم و ہنر سیکھنے کیلئے کوئی جانا چاہے تو ٹھیک، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہاں اندھیرا اور تاریکی ہے۔ وہاں انسانیت اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ نہ عزت ہے، نہ آبرو اور نہ ہی گھریلو زندگی۔خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ پورا نظام کہ جو مغرب نے قائم کیا ہے، وہ انسانیت کے حوالے سے درندوں اور جانوروں کی سطح تک گرا ہوا ہے۔

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بینکوں کی عمارات

تم اس چیز سے اندازہ کرو کہ عمارتوں کی شان و شوکت، تعمیر اور رعنائی کے حوالے سے سرمایہ داری نظام کی نمائندہ بینکوں کی عمارات، مذہب کی نمائندہ گرجوں کی عمارت سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہیں، یعنی معاشرے میں اب مذہب کی نہیں، سرمائے کی عزت و اہمیت ہے۔ پوری دنیا میں بڑی بڑی عمارتیں اور خوبصورت تعمیرات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اس معاشرے کی بنیاد کس چیز پر ہے، مذہب پر یا مادہ پرستی پر۔ ترکوں نے سب سے زیادہ خوبصورت مسجدیں بنائیں، چونکہ اس دور میں غلبہ، اسلام کی روحانی اساس کا تھا۔ تمام اسلامی تہذیبوں میں مسلمان جب بھی عمارتیں تعمیر کرتے، تو ان کی سب سے ممتاز عمارت مسجد ہی ہوا کرتی۔ اس کے مقابلے میں جدید مغربی تہذیب نے یہ رواج شروع کیا کہ سب سے بڑی اور خوبصورت عمارتیں بینکوں کی ہوتی ہیں۔ کراچی میں بھی کئی دہائیوں تک سب سے اونچی عمارت حبیب بینک پلازہ ہی کی تھی۔ اقبالؒ نے اس نقطے کو بیسویں صدی کے آغاز میں ہی نوٹ کر لیا تھا۔

ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جُوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

اقبالؒ نے یہاں پہ پورے بینکاری نظام اور صیہونیوں کی سرمایہ دارانہ معیشت کو اڑا کے رکھ دیا ہے۔ اقبالؒ نے قرآن سے یہ الفاظ لیے ہیں کہ جب یہودی کہتے ہیں کہ سود بھی تجارت ہی کی ایک شکل ہے، تو جواباً اللہ کہتا ہے کہ تجارت حلال ہے اور سود حرام، اور اللہ نے قرآن پاک میں سود اور رباء کے نظام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ یہاں پر اقبالؒ نے بھی یہی الفاظ استعمال کیے ہیں کہ یہ لوگ سود کو تجارت کہتے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ جواء ہے۔ اور یہ لوگ ہمیں مساوات، انسانی حقوق، آزادی اظہار کا درس تو دیتے ہیں، مگر حقیقت میں یہ خود لوگوں کا لہو پیتے ہیں۔ ایک آدمی کا نفع لاکھوں کیلئے تباہی کا باعث بنتا ہے، پوری پوری قومیں اور نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں اس سود اور رباء کے نظام میں۔ پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات!!

علامہ اقبالؒ نے یہاں پر اس صیہونی سرمایہ دارانہ معاشی نظام کہ جو اس وقت پوری دنیا میں رائج ہے، کا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ ہم نے بھی اپنی کتاب ''معاشی دہشت گردی'' میں یہ ساری باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں کہ کس طرح یہ دنیا کی خوراک کی رسد کنٹرول کرتے ہیں، کس طرح دنیا کی دوائیاں کنٹرول کرتے ہیں، کس طرح دنیا کی دولت کی تقسیم کنٹرول کرتے ہیں، کس طرح دنیا میں قحط برپا کرتے ہیں، کس طرح یہ ظاہر میں اپنا چہرہ روشن دکھاتے ہیں، ہمیں مغرب سے جمہوریت سکھانے کیلئے آتے ہیں اور ہماری صفوں میں سے ہی نجس اور پلید ترین لوگ جمہوریت یا آمریت کے ذریعے ہم پر حکمران بنا کر مسلط کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقتاً سب ہمارا لہو پیتے ہیں۔ یہ خون پینے والے ویمپائر ہیں۔ یہ ہمیں مساوات کا کیا درس دینگے؟ ان سود خور، لہو پینے والے ڈریکولوں سے ہمیں کوئی سبق نہیں سیکھنا! اقبالؒ کی اس امت کو یہ سخت تنبیہ ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بیسویں صدی کے اوائل میں جو کچھ بھی کہا تھا، آج آپ وہ ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ وقت آچکا ہے کہ اقبالؒ کے نظریات کو دوبارہ زندہ کیا جائے، کیونکہ اب ابلیس کا براہ راست تصادم اسلامی نظام سے ہے۔

اقبالؒ، خطبہ الٰہ آباد کے موقع پر، پنڈال میں آتے ہوئے

۷

وطن کی فکر کر ناداں ! مصیبت آنے والی ہے

علامہ اقبالؒ اس قدر پراسراراوراتنی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے کہ ناممکنات میں سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص میں اس قدر علمی، فکری اورروحانی صلاحیتیں مجتمع ہوں۔ایک انتہائی پیچیدہ سیاسی ماحول میں مسلمان ملت کوایک نظریہ دے کر بیدار کرنا یقیناً ناممکنات میں سے تھا۔ یہ وہ کام تھا کہ جو اقبالؒ نے کر دکھایا۔

اس وقت خطرات کا عالم یہ تھا کہ اقبالؒ انتہائی بے چینی میں مسلمانوں کو جھنجوڑ کر متنبہ کررہے تھے کہ:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یعنی کیفیت یہ تھی کہ مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹانے کی سازش کی جاچکی تھی۔انگریز سامراج، ہندوؤں کے ساتھ ملکر اپنی جگہ یہ سازش تیار کر چکا تھا کہ جس میں مسلمانوں کی پوری تہذیب کو جڑ سے اکھاڑنا مقصود تھا۔اس ملک میں کہ جہاں مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی، اب وہاں اذان دینے اورنماز پڑھنے تک پر پابندی عائد کی جاناتھی۔ اقبالؒ یہ سب فتنے اپنی فراست سے دیکھ رہے تھےاوران کی بے چینی بجاتھی۔

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

شیطانی قوتیں اور طاقتیں کہ جو دنیا میں، برطانوی سامراج اور ہندو انتہا پسندوں کے روپ میں، ہندوستان میں اس وقت موجود تھیں، ان کا پورا ارادہ تھا کہ انگریزوں کے بعد مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی میں دے دیا جائے۔ ہندو انتہا پسندوں کی اکثریت اگر ہندوستان میں مسلمانوں پر غلبہ پا لیتی تو وہ اپنی ایک ہزار سالہ ذلت کا بدلہ وہ اس طرح لیتے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹا دیا جاتا، اور اس سازش میں انگریز سامراج ان کے ساتھ شریک تھا۔ اس سازش کو سب سے پہلے اقبالؒ کی فراست نے ہی تاڑا تھا۔

ایک طرف تو اقبالؒ کا پہلا کام یہ تھا کہ نئے عالمی نظام کو افشا کریں اور زمانے کے تازہ خداؤں سے مسلمانوں کو آگاہ کریں۔ دوسری طرف کانگریسی ملاؤں کے فتنے کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت ہندوؤں سے اتحاد کی قائل ہو چکی تھی اور متحدہ ہندوستان میں ہندی قومیت کی بنیاد پر زندگی گزارنے پر راضی تھی۔ اس وقت تک یہ تمام فاسد تصورات مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلط کر دیئے گئے تھے، کہ جن میں آج بھی ہمارے اکثر دانشور الجھے ہوئے ہیں اور انہی بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان تمام تازہ خداؤں کی اقبالؒ نے نشاندہی کی اور پھر ایک منتشر قوم کو ایک روحانی، انقلابی نظریے کے تحت یکجا کیا۔ مایوسی کے اس دور میں اقبالؒ نے ان کو یہ حوصلہ دیا کہ تم ایک غیرتمند اور دلیر قوم ہو اور تمہاری تدبیر ہی تمہاری تقدیر ہے۔ ان کے ماضی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ان کے حال کا تجزیہ کیا تاکہ انکے مستقبل کو روشن کیا جا سکے۔

یہ جو ہم قومی ترانے میں کہتے ہیں، ترجمان ماضی، شان حال، جان استقبال، اقبالؒ نے بالکل یہی کیا۔ وہ ترجمان ماضی بھی تھے، شان حال بھی اور جان استقبال بھی۔ انہوں نے آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر امت کو دکھائی اور دو خواب دکھائے۔ ایک یہ کہ ہم نیا ملک بنائیں گے، ایک الگ خطہء زمین حاصل کریں گے، اور دوسرا یہ کہ ہم اسے مسلم امت کے احیاء کا مرکز بنائیں گے۔ وہ خطہء زمین کہ جو تمام امت کا ایک ایسا قلعہ ہوگا کہ جو امت مسلمہ کی عزت وآبرو کا محافظ ہو۔ جب یہ سوال پوچھا گیا کہ یہ سارا معاملہ ہندوستان میں ہی کیوں؟ خصوصاً جبکہ خلافت ترکی میں تھی، تو اقبالؒ نے جواب دیا:

ہے اگر قومیت اسلام کی پابند مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی، نہ فارس ہے نہ شام

کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کوئی قومی ریاست (Nation State) مجبوراً بنانا پڑ بھی جائے (ہم آگے بتائیں گے کہ انہوں نے ''مجبوراً'' کیوں کہا) تو اسکا مقام ہند ہی ہوگا نہ کہ ایران یا شام۔ کیوں؟ اس کی وجہ بتاتے ہیں:

چاک اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں
خانقاہ عظمت اسلام ہے یہ سرزمین

کہتے ہیں، ہندوستان کی سرزمین اسلام کی عظمت کی خانقاہ ہے۔

اقبالؒ نے پہلے تصور دیا، اس کے بعد نظریہ تخلیق کیا، پھر قوم کو بیدار کیا، پھر لیڈر تلاش کیا، پھر اسکی تربیت کی، اور پھر قوم کو اس لیڈر کی اطاعت کا حکم دیا۔ قائداعظمؒ نے اقبالؒ کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

....

یہ تو خطے کی جغرافیائی سیاست کے حوالے سے اقبالؒ کی پراسرار شخصیت کا ایک پہلو تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اقبالؒ کی شخصیت میں ایک غیر معمولی روحانی جہت بھی ہے۔ ایک طرف تو وہ بات کر رہے ہیں جمہوریت، آمریت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف، تو دوسری طرف فقر، روحانیت، اور معرفت کے اعلیٰ ترین مقامات کا بیان جاری ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یہ حکمت قرآنی کی معراج ہے! اس مقام تک اس درویش کی نگاہ کی رسائی اس بات کی دلیل ہے کہ اقبالؒ ایک ولی کامل، فقر غیور کے حامل صاحب حال تھے کہ جس سے قدرت امت مرحوم کی بیداری کا کام بھی لے رہی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبالؒ کی شخصیت کو سمجھنے کیلئے ہمیں برسوں درکار ہوں گے۔ ان کی صرف شاعری کو اٹھا کر دیکھیئے تو ایک طرف تو وہ اس جدید دور کے تمام نام نہاد خداؤں کی اصلیت کھول رہے ہیں کہ جن میں سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکیت، جمہوریت، قوم پرستی، اور اسی قسم کے دیگر فلسفے شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں انہوں نے ایک متبادل نظریہ دیا جو کہ قرآن وسنت سے اخذ کیا گیا، کہ جس کی بنیاد ہمارے اسلاف نے قرون اولیٰ میں رکھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی قوم کو عزت نفس، وقار اور آبرو کی حفاظت کا درس بھی دے رہے ہیں، کہ جس کو انہوں نے ''خودی'' کا نام دیا، ایک ایسا روحانی مقام کہ جب بندۂ مومن تقدیر کا پابند نہیں رہتا بلکہ تقدیر ساز ہوتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک ایسے وقت میں کہ جب مسلمان قوم کا نام ونشان بھی مٹنے کو تھا، اقبالؒ نے اس قوم کو اتنی اعلیٰ وارفع منزل دکھائی کہ جو اس وقت بھی ناقابل یقین لگتی تھی اور شاید آج بھی، کہ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

قیام پاکستان کا جو فعل عملی اور تاریخی اعتبار سے ناممکن لگتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اقبالؒ کے ذریعے کر دکھایا۔ اسی لیے ہم ان کو ''پراسرار'' کہتے ہیں۔ اقبالؒ جن غازی، پراسرار بندوں کی بات کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑے پراسرار بندے یہ خود ہیں، کہ جو اپنا راز چھپائے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کسی کو نہیں بتایا کہ ان کو فیض کہاں سے ملتا تھا، کہاں سے ان پر وہ مضامین نازل ہوتے تھے، کہ جن سے انہوں نے اس امت کو بیدار کرنے کا معجزہ انجام دیا، امت کو اس مقام تک پہنچانے کا راستہ بتایا کہ جو آج بھی ہمارے لیے منتہائے مقصود ہے، اور اسی طرح ہمارے لیے قابل عمل ہے کہ جیسے بیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے آباؤ اجداد کیلئے تھا۔

....

آج آپ دنیا میں وہی عالمی نظام دیکھتے ہیں کہ جس کو اقبالؒ نے افشا کیا تھا۔ آج اللہ کے فضل سے وہ پاکستان، کہ جس کی انہوں نے پیش گوئی کی تھی، کہ جو اس وقت ناممکنات میں سے لگتا تھا، ایک اسلامی ایٹمی قوت کی صورت میں موجود ہے۔ آج اشتراکی نظام ختم ہو چکا ہے۔ وہ جو ابلیس کی مجلس شوریٰ میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کیلئے آنے والے دور میں اصل فتنہ اسلام ہو گا، وہ بھی آج سچ ثابت ہو چکا ہے اور اسلام ان کیلئے سب سے بڑا مد مقابل بن کر آ کھڑا ہوا ہے، اور کفر کا پورا نظام، یعنی مغربی تہذیب اور سرمایہ داری، خود تباہی سے دوچار ہیں۔ اقبالؒ اس وقت کہہ گئے تھے:

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

علامہ اقبالؒ مزید پیش گوئی کرتے ہیں:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

ذرا غور کریں یہ بات اقبالؒ ۲۱-۱۹۲۰ء میں کہہ رہے ہیں۔ یہ اس وقت ناممکنات میں سے لگتا تھا کیونکہ اس وقت تو چینی افیون میں ڈوبے ہوئے تھے اور نہ ہی چین موجودہ شکل میں موجود تھا۔ اس وقت اقبالؒ یہ کہہ رہے تھے کہ خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے چینی بیدار ہونے لگے ہیں اور ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے ہیں، یعنی مشرق کی تہذیبیں اب اٹھ رہی ہے اور آنے والے وقتوں میں یہ مغرب کا مقابلہ کریں گی، اور آج دیکھیئے کہ سو سال بعد چین کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔ اس وقت یہ درویش سو سال آگے دیکھ رہا تھا۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جس قوم نے اقبالؒ سے فیض حاصل نہ کیا، وہ بدنصیب ہو گی۔

ہم مانتے ہیں کہ آج کے دور میں اقبالؒ کی اردو لوگوں کو مشکل لگتی ہے، لیکن ہمیں ہر حال میں اقبالؒ کو اردو میں ہی پڑھنا ہے۔ اردو کو دوبارہ رواج دینا ہو گا۔ عربی میں ہمارا چودہ سو سال کا ادب، تہذیب، تمدن اور دین موجود ہے۔ اسی طرح ہماری تاریخ و تہذیب فارسی میں بھی

موجود ہے اور بدقسمتی سے ہم دونوں زبانوں سے ہی نابلد ہو چکے ہیں۔ تیسری اسلامی زبان اردو ہے کہ جس میں عربی اور فارسی کی طرح کا علمی خزانہ موجود ہے۔ اگر ہم نے اردو کو بھی بھلا دیا، اردو کو بھی گم کر بیٹھے، تو اس کے بعد پھر دنیا کی داستانوں میں ہمارا نام ونشان بھی نہ ہوگا، کہ سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ اقبالؒ کو زندہ کرنا ہماری تہذیب، تمدن اور بقاء کیلئے بھی زندگی اور موت کا سوال ہے۔

ہم یہاں صرف اقبالؒ کے چند اشعار کا حوالہ دیں گے کہ جوان کے پورے نظریے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم یہاں کلام اقبالؒ مکمل کرلیں گے۔ وہ تو ایک بہت بڑی داستان، بہت بڑا مشن، انقلابی نظریہ اور ایک روحانی فلسفہ ہے کہ جسے مجموعی طور پر قوم، ذرائع ابلاغ اور دانشوروں نے ایک بھاری ذمہ داری سمجھ کر زندہ کرنا ہے۔ اقبالؒ کے بارے میں بھی آجکل عوام کو اسی طرح کے ذہنی خلجان میں مبتلا کیا جا رہا ہے کہ جیسے قائداعظمؒ سے متعلق پیدا کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں ہر حال میں اقبالؒ کو از سرِ نو زندہ کرنا ہے۔ ہم علامہ اقبالؒ کی جو تصویر آپ کو دکھا رہے ہیں، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اقبالؒ کے کلام کو پڑھیئے گا، ان شاء اللہ، ناممکن ہے کہ آپ کے وجود میں روحانی تبدیلی نہ آئے اور قلب ونظر میں انقلاب برپا نہ ہو جائے۔

اقبالؒ کا کلام اپنے اندر ایک جادوئی اثر رکھتا ہے کہ جس کو پڑھ کر انسان کا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ اس کی زندگی کے تصورات بدل جاتے ہیں۔ یہ صرف الفاظ ہی نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک خاص تاثیر رکھی ہے۔ اردو میں، ہم کہیں گے کہ قرآن کی سب سے خوبصورت منظوم شرح کلام اقبال ہے، کہ جس طرح مثنوی مولانا روم کو فارسی کا قرآن کہا جاتا ہے۔

مثنوی ء مولوی ء معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

....

قومیت کا تصور بنیادی اعتبار سے اسلام کے ''امت'' کے تصور سے متصادم ہے۔ مسلمان ملت ہمیشہ ایک جسد واحد ہی رہی ہے۔ مغرب نے انسانیت کو عصبیتوں کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے ملکوں اور جغرافیوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ جس میں ہر ایک ملک کا اپنا جھنڈا، الگ پاسپورٹ، الگ کرنسی ہے۔ یہ دین کے تصور سے بالکل متصادم ہے۔ اقبالؒ نے جب اپنی جوانی میں شاعری شروع کی، یعنی ۱۹۰۲ء، ۱۹۰۴ء میں، تو اس وقت ان کا ذہن اتنا پختہ نہیں تھا اور وہ بھی قومیت کے تصور سے متاثر تھے۔ تب انہوں نے کچھ ایسی شاعری بھی کی کہ جو ہندوستانی قومیت سے متعلق تھی:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی بھارت میں یہ ترانہ پڑھا جاتا ہے اور ہندوستانی قوم پرستی کی بنیاد اس پر رکھی جاتی ہے۔ وہی اقبالؒ جب پختہ ہوتے ہیں اور ۱۹۰۶ء میں جب برطانیہ جاتے ہیں، تو وہاں کی اسلامک سوسائٹی کا نام بدل کر ''پین اسلامک سوسائٹی'' (Pan Islamic Society) رکھ دیتے ہیں۔ اس دور میں ان کی فکر اور سوچ بڑی تیزی سے ارتقاء کے عمل سے گزر رہی تھی، اور وہی اقبالؒ واپس آنے کے بعد یہ اشعار کہتے ہیں:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

یعنی ''وطنیت'' سے نکل کر ''امت'' تک کا سفر، یہ ہے اقبالؒ کا فکری ارتقاء! جہاں کہیں اقبالؒ نے وطن کا لفظ استعمال کیا ہے تو وہاں اس سے مراد قومیت کا مغربی تصور نہیں ہے۔ وہ اپنے اس غیر معمولی تصور کو واضح کرتے ہیں:

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

آج کی جدید جغرافیائی سیاست میں، جدید سیاسی نظریات اور سیاسی تصورات میں، جب وطن کی بات کی جاتی ہے تو اس کی بنیاد عصبیت ہے، اور جب نبوت کے الفاظ میں ہم وطن کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد امت کے ایک عضو کی ہوتی ہے کہ جس کا مقصد صرف شناخت ہے۔ لہذا جب اقبالؒ وطن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد قومیت کا جدید تصور نہیں ہوتا، بلکہ قرآنی تصور ہوتا ہے کہ جو انسان کی قومیتوں اور قبائل میں تقسیم کو صرف وجہ شناخت بتاتا ہے، وجہ برتری نہیں، یعنی صہیب رومی، بلال حبشی، سلمان فارسی، اپنی قومیتوں کی وجہ سے پہچانے تو جاتے ہیں مگر یہ باعث عصبیت نہیں ہے۔

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر، فارس و شام سے گزر

علامہؒ کہتے ہیں کہ مسلمان کسی صورت میں بھی نہ تو ایک جغرافیائی مقام پر محدود ہوسکتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کو فارسی، شامی، عربی، عجمی عصبیت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

جب مدینہ کی ریاست قائم ہوئی تو مسلمان مکے سے ہجرت کر کے مدینہ آباد ہو گئے۔ حضور ﷺ کو مکے سے بھی بہت پیار تھا، اور مکے سے محبت کرنا عین ایمان تھا۔ مگر مشن کے تقاضوں کے تحت مدینہ تشریف لے گئے اور مدینے میں اسلامی ریاست قائم کی، کہ جو بعد میں چین سے یورپ تک پھیل گئی۔ ایک نظریاتی ریاست کا بنانا اور اس سے محبت کر کے اس کی حفاظت کرنا اسلام کے تصور کے خلاف نہیں ہے۔ یہ وہ قومیت نہیں ہے کہ جس کو مغرب آج دنیا پر مسلط کرتا ہے۔ مدینے کی ریاست کی طرح، کہ جس کی بنیاد ایک نظریے، ایک تصور، ایک فکر پر تھی، اقبالؒ نے بھی پاکستان کے قیام کا تصور دیا، کہ جس میں مسلمان ہندوستان کے ایک حصے کو جدا کر کے اسلام کے نام پر ایک علیحدہ ریاست کا وجود عمل میں لائیں۔ اسی بنیاد پر ہم نے ہندوستان کے مشرکوں سے الگ ہو کر پاکستان کی جانب ہجرت کی اور ایک ''مدینہء ثانی'' بنایا کہ جہاں ہم امت مسلمہ کے احیاء، اسکے عروج اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد رکھیں گے، ان شاء اللہ۔

آبرو باقی تیری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

اقبالؒ یہاں واضح کر رہے ہیں کہ امت مسلمہ کی عزت اس وقت تک تھی کہ جب تک مسلمان خلافت کی مرکزیت تلے امت کو اکٹھا رکھے ہوئے تھے، اور جب سے یہ امت قومیتوں اور لسانیت کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دی گئی، تو اس کے زوال اور رسوائی کا آغاز ہوا۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

بات چاہے ایک فرد کی ہو یا ایک ملک کی، ہر وہ وجود کہ جو اس امت رسول ﷺ سے وابستہ ہے اس کی بقاء، وقار اور عزت امت سے وابستگی میں ہے۔ پاکستان کی تمام تر آبرو اور مقام امت رسول ﷺ سے وابستہ ہونے میں ہے، گو کہ ''پاکستانیت'' ہماری شناخت ہے، جیسا کہ حضرت بلالؓ کی شناخت حبشہ سے تھی۔

اپنی کتاب "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں اقبالؒ نے مزید تفصیل سے آج کے دور میں قومیت کے مسائل کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق اب امت مسلمہ تقسیم ہو چکی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب امت کو اکٹھا کرنے میں بڑی محنت اور بڑا وقت لگے گا، تو اس کام کیلئے ہمیں زمینی حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک زمانہ تھا کہ جب امت کا اتفاق تھا کہ خلافت صرف قریشی کے پاس ہی ہو سکتی ہے، یعنی خلیفہ صرف عرب قریش ہی ہو سکتے ہیں، چاہے وہ بنو امیہ ہوں یا بنو عباس۔ لیکن ایک دور وہ بھی آیا کہ جب قریش خلافت سنبھالنے کے قابل نہ رہے، یعنی جب عباسی خلافت تباہ و برباد ہو گئی تو اس کے بعد اس وقت کے علماء نے فتویٰ دیا کہ اس وقت حالات کا تقاضا یہ ہے کہ دین کی عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر خلافت کیلئے قریشی ہونے کی شرط کو ہٹا دیا جائے۔ جبھی خلافت عثمانیوں کے حوالے کر دی گئی اور ترک مسلمانوں نے، کہ جو قریشی نہیں تھے، خلافت اسلامیہ کی ذمہ داری اٹھائی اور کئی سو سال تک امت کی عزت و آبرو کے محافظ بنے رہے۔ اُس دور کے علماء نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تشریح کی اور اجتہاد کیا۔ اب بیسویں صدی میں چونکہ امت قومی ریاستوں میں توڑ دی گئی ہے اور ہمارے پاس ابھی اتنی طاقت اور صلاحیت موجود نہیں ہے کہ ہم اسے اکٹھا کر کے دوبارہ خلافت تلے ایک امت بنا سکیں، تو کم از کم ہر مسلمان ملک سیاسی، عسکری اور تعلیمی اعتبار سے اپنے آپ کو ایک مقام تک پہنچائے، اسکے بعد یہ سارے ممالک آپس میں مل کر مختلف اتحاد بنائیں اور آہستہ آہستہ یہ امت دوبارہ خلافت کے مرکز پر جمع ہو۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

ابھی ایسا ہوا نہیں ہے، لیکن یہ اقبالؒ کی دعا بھی ہے اور آنے والے مستقبل کی بشارت بھی۔ اس کے علاوہ اقبالؒ کی ایک خواہش اور بھی ہے:

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

آنے والے دور میں انہوں نے مسلمانوں کو ایک راہ ہدایت بتا دی ہے کہ آپکو اس قومی ریاستوں کے تصور سے نکل کر دوبارہ امت اور ملت کی طرف رجوع کرنا ہے، گو کہ اقبالؒ اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جو خلافت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں پر قومی ریاستوں کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔ چودہ سو سال کی مسلمان تاریخ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان علاقے میں

خلافت عثمانیہ
Fatih Sultan Mehmet
1432 - 1481
II. Abdülhamid
1842 - 1918
I. Osman
1258 - 1326
IV. Murad
1612 - 1640
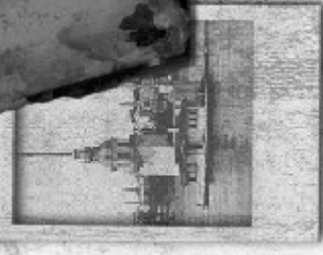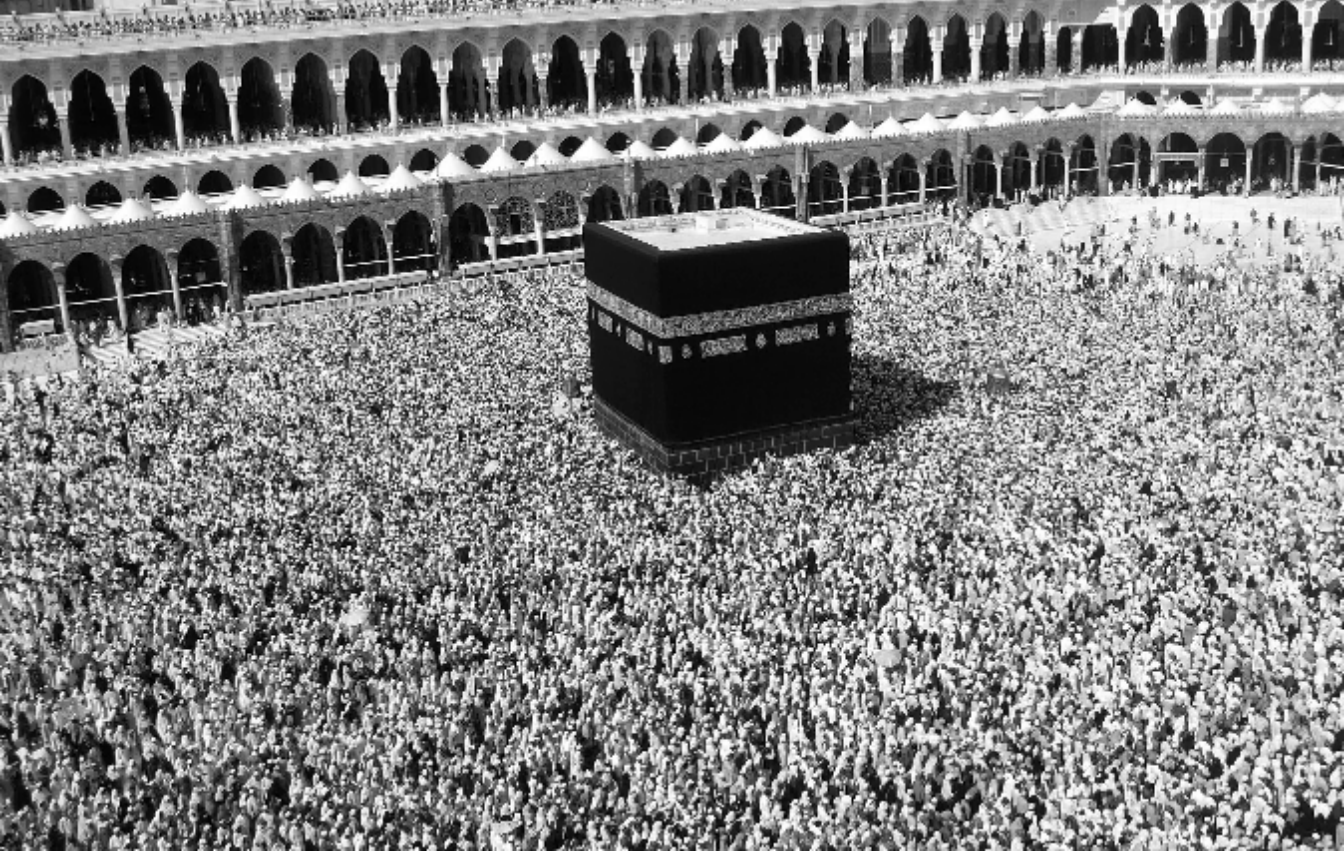
جانے کیلئے ویزہ یا پاسپورٹ کی ضرورت پڑی ہو۔ مسلمان کیلئے صرف یہ کافی ہوتا تھا کہ وہ ایک مسلمان ہے۔ اس کو پوری دنیا کے مسلمان علاقوں میں جانے، تجارت کرنے، رہائش رکھنے، شادیاں کرنے اور خاندانوں کو آباد کرنے کی پوری اجازت ہوا کرتی تھی۔

اب یورپی یونین کے ممالک نے بھی یہی اسلامی تصور اختیار کرلیا ہے، لیکن جب مسلمان یہ بات کرتے ہیں اور اس کیلئے کوشش کرتے ہیں تو ان مغربی طاقتوں کی جان نکلتی ہے۔ اس لیے کہ ان کو ہماری امت اور ملت کے تصور کا اندازہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم ایک عسکری ومعاشی اتحاد بنائیں گے، اپنے درمیان سرحدیں، ویزے اور پاسپورٹ ختم کر دیں گے، اور خلافت کے مرکز کو دوبارہ قائم کریں گے، اور اسی سے یہ خوفزدہ ہیں، لہٰذا الگ بھگ ۵۷ ملکوں میں تقسیم کرنے کے بعد اب وہ امت مسلمہ کو مزید چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، اور نئے جغرافیے اور نئے نقشوں کی بات کی جارہی ہے۔

یہ وہ تصور ہے کہ جس کے بارے میں اقبالؒ نے صاف صاف کہا تھا کہ آج کے دور میں جو مغربی قومیت رائج ہے، وہ دراصل مذہب کا کفن ہے۔ یعنی مسلمان امت اگر قومیت کو اپنائے گی، تو یہ اسکے دین اور تہذیب کا کفن ہوگا۔

لیکن ہم جب پاکستان کی ریاست سے محبت اور پیار کی بات کرتے ہیں، تو یہ اسی نسبت سے کی جاتی ہے کہ جس طرح ہم مدینے کی ریاست سے محبت کرتے ہیں۔ مسلمان ملت کا ایک مرکز تو ہوتا ہے لیکن ہماری فکر وسوچ ایک علاقے میں محدود نہیں ہوتی۔ اپنے مرکز سے عشق ایمان کا حصہ ہے۔ ہمارا مقصد اور مشن یہ ہے کہ کسی ایک جگہ مسلمان خود کو مجتمع کریں، خود کو دوبارہ منظّم کریں اور اس خطے کی اسی

طرح حفاظت کی جائے کہ جیسے مدینہ کی حفاظت کی جاتی تھی، اسی طرح اس پر جان و مال اور عزت وآبرو قربان کی جائے کہ جیسے مدینہ کی ریاست کے دفاع اور حفاظت کیلئے مسلمانوں نے قربانیاں دیں۔

اسلام میں امت کا جو تصور ہے کہ جس کی تشریح اقبالؒ نے کی، مغربی قومیت سے اس قدر مختلف ہے کہ مغربی ذہن اس کا ادراک ہی نہیں کرسکتا۔ ہم مسلمان امت کے تمام تاریخی ورثے کو اپنی مشترکہ میراث سمجھتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کو جتنا مرضی قومی ریاستوں میں تقسیم کرلیں، انہیں امت کے تصور سے دور نہیں کرسکتے۔ یہ ہمارے ایمان اور خون کا حصہ ہے۔ گو کہ اس وقت امت ملکوں میں تقسیم ہے اور مزید تقسیم کی جارہی ہے، لیکن تمام مسلمان کہ جو درد دل رکھتے ہیں، اس حقیقت کا ادراک کرتے ہیں کہ ایک دن مسلمانوں کو دوبارہ خلافت تلے متحد امت کے طور پر ابھرنا ہوگا۔ یہی اقبالؒ کا انقلابی پیغام ہے کہ جو عصر حاضر کے خلاف ان کا اعلان جنگ ہے۔

آج کے دور کے تمام مسلمان حکمرانوں، علماء اور دانشوروں پر یہ واجب ہے کہ وہ امت کو متحد کریں اور خلافت کے قیام کیلئے اپنی بھرپور صلاحیتوں کو کھپادیں۔ اس کا آغاز ''ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ'' سے ہوگا کہ جیسے آج یورپین یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنے ہوئے ہیں۔ مسلمان ممالک کو اکٹھا ہوکر ایک مضبوط اسلامی بلاک بنانا اور پھر خلافت کا دوبارہ احیاء، اقبالؒ کا خواب اور ہمارا مشن ہے۔

مغربی تہذیب کے سیاسی اور معاشی تصورات کے بعد اقبالؒ نے ان کی اخلاقیات پر بھی شدید تنقید کی ہے۔ علامہ اقبالؒ ۱۹۰۶ء میں یورپ گئے کہ جہاں ان کے وجود پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے اس مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا اور اتنے گہرے مشاہدے کے بعد اقبالؒ کو ابکائی آگئی (یہ خود اقبالؒ کے الفاظ ہیں)۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ ماں باپ بچوں کا بیمہ کرواتے تھے، اور پھر بچے کو خود قتل کردیتے کہ بیمے کی رقم حاصل کرسکیں۔ اس کے بعد آنے والے دور میں پہلی جنگ عظیم میں انہوں نے انسانیت کی جو تذلیل دیکھی، جس طرح قتل و غارت گری کو ان نام نہاد تہذیب یافتہ قوموں نے جواز بخشا، اور جہاں کروڑ ہا انسانوں کو اس طرح بے دردی سے قتل کیا گیا کہ تباہ کن آتشیں اسلحہ بے دریغ نہتی آبادی حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں پر بھی استعمال ہوا، اسکو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد اقبالؒ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

کہ جو کچھ تم اس وقت کررہے ہو، چند سال تو تم مزے کرلو گے، تباہی مچالو گے لیکن تمہارا انجام بہت برا ہونے والا ہے۔ وہ معاشرہ کہ جس کی بنیاد دین پر نہ ہو، جس کی اخلاقی بنیادیں ہل چکی ہوں، کہ جہاں فحاشی، برائی، بدکاری، قتل اور سود وربا کا دور دورہ ہو، وہ معاشرہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتا۔ آج یورپ کا حال دیکھ لیجیئے کہ باپ بچوں کو نہیں جانتے، بچے باپ کو نہیں جانتے۔ خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے۔ اب ان کے پاس صرف فوجی طاقت رہ گئی ہے اور تھوڑی سی معاشی قوت کہ جس کی بنیاد پر وہ دنیا میں تباہی تو مچاسکتے ہیں، مگر دنیا کو

ہدایت نہیں دے سکتے۔ اقبالؒ نے مغرب کے بارے میں اس وقت کہا تھا:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں غیر از نوائے قیصری

....

اٹھا کے پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

نجار بڑھئی کو کہتے ہیں کہ جو لکڑی کا کام کرتا ہے۔ اقبالؒ کا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جو یورپ کے تصورات اور نظریات کو اختیار کرے گا وہ خود بھی ہلاک ہوگا۔ یہ الیکشن، کونسل، ممبری، جمہوریت، آزادیٔ افکار، آزادی اظہار رائے، یہ سب تصورات کہ جو مغرب نے دیئے ہیں، دودھاری تلواریں ہیں۔ خصوصاً جوان کا سب سے بڑا تصور آزادیٔ افکار، آزادی اظہار کا ہے، کہ جس کا سب سے بڑا مظہر آزاد

پریس ہے، کہ جس کے ذریعے یہ معاشرے میں طوائف الملو کی اور افراتفری پھیلاتے ہیں۔ فحاشی، برائی، بدکاری، الحاد، کفر، شرک کا پھیلانا اور اخلاقیات کو تباہ و برباد کرنا، یہ سب کچھ آزاد میڈیا اور اظہار رائے کی آزادی کے نام پر کیا جاتا ہے۔

اقبالؒ نے بڑے طنز کے ساتھ ان کو کہا ہے کہ:

آزادیء افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

وہ تمام لوگ تباہ و برباد ہونگے کہ جو آزادیء افکار کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر جن کو فکر و تدبر کا سلیقہ نہ ہو، جن کی عقل سلیم نہ ہو، جن کا دل مودب نہ ہو، جن کو یہ نہ معلوم ہو کہ انسانیت کا ادب، تہذیب، شائستگی، اخلاقیات کیا چیز ہوتی ہے۔ اگر ایسے ناپختہ ذہنوں کو آزادیء اظہار دے دو گے تو یہ قوموں اور معاشروں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیں گے، کیونکہ:

ہو فکر اگر خام تو آزادیء افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

اس سے زیادہ واضح انداز میں اقبالؒ کے علاوہ کسی اور مفکر نے بے لگام آزادیء اظہار پر تنقید نہیں کی۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ اقبالؒ کو اس تہذیب کی کچھ خوبیاں بھی معلوم تھیں۔ وہ اتنے متعصب نہ تھے کہ ہر شے کو مسترد کر دیتے۔ یہ ایک بہت غیر معمولی بات ہے کہ جو اقبالؒ کی غیر معمولی ذہانت، فہم اور فراست کی دلالت کرتی ہے کہ مغربی تہذیب سے شدید نفرت کے باوجود، وہ بغیر تعصب کے اس کی خوبیاں قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ اس دور میں لوگ یا تو مغربی تہذیب کو مکمل طور پر قبول کر کے تباہی کا راستہ اختیار کر لیتے یا تعصب کی بنیاد پر اس کو مکمل طور پر رد کر دیتے۔ اعتدال کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

اقبالؒ نے اس انتہا پسند طرز عمل پر بھی شدید تنقید کی ہے اور پوری قوم کو یہ پیغام دیا ہے کہ جب تم مغرب سے اسکی سائنس، ٹیکنالوجی اور علوم لیتے ہو تو یہ تم کو کس نے کہا ہے کہ ان کی بے حیائی، بے حجابی، شراب نوشی اور بدکاری کو بھی ساتھ قبول کرو؟ ہمارے ہاں جدت پسند ہونے کا مطلب، مغربیت لیا جاتا ہے۔ جبکہ اقبالؒ یہ تصور دے رہے تھے کہ تم اپنی اخلاقیات، کردار اور تہذیب برقرار رکھ کر بھی جدید ہو سکتے ہو۔ تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اپنی شکل وصورت مغرب کے لوگوں جیسی بنانے کی، اگر تم وہاں سے سائنس و ٹیکنالوجی اور فنون لینا چاہتے ہو۔

آج کے دور میں نوجوانوں کو ایک بہت شدید ذہنی خلجان یہ درپیش ہے کہ جب وہ مغرب سے سائنس و ٹیکنالوجی لینے کیلئے جاتے ہیں تو اس کے ساتھ کفر، الحاد اور اس کی وہ تہذیب بھی لیکر آتے ہیں کہ جو ہمارے دین اور ایمان کا بیڑہ غرق کر دیتی ہے۔ یہ نوجوان نسل کا مسئلہ اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اقبالؒ اس وقت بھی رہنما تھے اور آج بھی ہیں۔

۸

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

پچھلے کئی ابواب میں ہم نے بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ کے اس نظریے اور فلسفے کی بات کی ہے کہ جس میں انہوں نے مغربی تہذیب کو بے نقاب کیا ہے۔ اس وقت مغربی تہذیب ایک طوفان کی طرح مسلمانوں پر مسلط تھی، صرف یہی نہیں کہ ان کی فوجوں نے آ کر ہم پر حکومت کی بلکہ انہوں نے مسلمانوں پر ایسے افکار اور نظریات بھی مسلط کرنا شروع کر دیئے کہ جو امت مسلمہ کیلئے زہر قاتل کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ امت کی سوچ اور شناخت کو تباہ کر رہے تھے، اسے مایوسی اور احساس کمتری میں مبتلا کر کے ابدی غلامی میں رکھنا چاہتے تھے۔ مغربی تہذیب کا غلبہ قبول کرنے کیلئے مسلمان بچوں کی ذہن سازی کی گئی کہ اب مسلمانوں کا عروج ممکن نہ ہوگا اور مسلمانوں کی بقاء اس بات میں ہے کہ وہ پوری طرح اس فاسد تہذیب کو قبول کر لیں۔

اُس وقت آجکل کی طرح کے ذرائع ابلاغ بے شک نہیں تھے، لیکن مغربی تہذیب اپنے تعلیمی نظام، اخباروں اور ریڈیو کے ذریعے پوری شدت سے مسلمان نوجوانوں پر اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔ اس وقت جتنے بھی پڑھے لکھے مسلمان اور اشرافیہ تھی، وہ سب کے سب مغرب سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ کسی کیلئے یہ تصور بھی ممکن نہ تھا کہ مغربی نظام کے علاوہ کسی اور نظام میں، اور وہ بھی اسلام میں، مسلمانوں کے مسائل کا کوئی حل موجود ہو سکتا ہے۔ گو کہ ہلکی پھلکی مزاحمت مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی شوکت علی جوہر، حسرت موہانی، عبیداللہ سندھی، الطاف حسین حالی جیسے دانشوروں کی جانب سے ضرور پیش کی گئی، مگر وہ بھی جلد ہی دم توڑ گئی۔ ۱۹۲۴ء تک تحریک

خلافت کے ختم ہونے کے بعد تو سوائے اقبالؒ کے کوئی اور چٹان باقی ہی نہ رہی کہ جو امت کو سہارا دے سکتی۔

اقبالؒ نے امت مسلمہ کو ایک نئی راہ دکھائی، خطے کی جغرافیائی سیاست کا تجزیہ کیا، لیڈر تیار کیا، قوم کو بیدار کیا، نئے ملک کا خواب دیا اور پھر قوم کو یہ بھی بتایا کہ تمہارے مسائل کا حل مغربیت میں نہیں، بلکہ شریعت کی بنیاد پر اجتہاد میں ہے۔

آج ہمیں بھی جو بہت بڑا بحران درپیش ہے، وہ یہی ہے کہ ہم جدید دور کے تقاضوں اور مغربیت کے درمیان فرق نہیں کر پا رہے۔ قوم اسی مخمصے میں ہے کہ جدید ہونے کیلئے مغربی تہذیب بھی اپنانا پڑے گی یا مغرب کے علوم کو اپناتے ہوئے ہم اپنی اقدار، اخلاق، کردار، دین، اپنی مشرقی عادات واطوار کی کس طرح حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہ بحران سو سال پہلے کی طرح آج بھی جوں کا توں موجود ہے، گو کہ اقبالؒ اسکا حل بتا چکے ہیں مگر افسوس کہ قوم نے ان کی نصیحت پر عمل نہ کیا۔

مغربی تہذیب کے تمام مادّی پہلوؤں پر ہم بات کر چکے ہیں۔ اب اس تہذیب کی روحانی اساس کی طرف آتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنے اشعار میں مغربی تہذیب کی بڑی گہری تصویر کشی کی ہے۔ پہلے تو ہم نے اس تہذیب کے مختلف نظریات یعنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظریے کی بات کی تھی۔ اب بحیثیت مجموعی مغربی تہذیب کے بارے میں اقبالؒ سے رائے لیتے ہیں:

آدمیت زار نالہ است فرنگ
زندگی ہنگامہ برچیدہ است فرنگ

انسانیت مغربی تہذیب کی وجہ سے دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ ظلم وجبر اور مادّہ پرستی پر مبنی اس تہذیب نے انسانیت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے اور انسانی تہذیب سے مذہب اور روحانیت کی جڑ تک اکھاڑ دی گئی ہے۔ مغربی معاشرے میں مذہب کو سیاست سے الگ کر کے جس طرح انہوں نے اخلاق، کردار، حیاء اور خاندانی اقدار کو توڑا ہے، کہ جس کی بنیاد پر انسانی معاشرے اور خاندان قائم ہوتے تھے، آج اس پر انسانیت ماتم کناں ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق
باز روشن می شود ایام شرق

مغربی تہذیب نے تو انسانیت کا بیڑہ غرق کر دیا، اب مشرقی قومیں کیا کریں؟ مغربی تہذیب کے مقابلے میں اقبالؒ نے مشرقی تہذیب کی بات کی ہے، صرف مسلمانوں کا ہی ذکر نہیں کیا، کیونکہ تہذیبی اساس، اخلاقیات، خاندان، حفظ مراتب، بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، وقار اور عزت نفس، یہ تمام اقدار اسلامی بھی ہیں اور مشرقی بھی۔ یہ مشرق وسطیٰ میں بھی ہیں، مسلمان ممالک میں بھی، چین میں بھی اور خراسان میں بھی۔ جتنی بھی مشرقی تہذیبیں ہیں، وہ انسانی اخلاق اور اقدار کا مغرب سے الگ معیار رکھتی ہیں۔

در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گزشت و آفتاب آمد پدید

علامہؒ کہہ رہے ہیں کہ اب مشرقی قوموں کے ضمیر میں بھی آہستہ آہستہ ایک انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ مایوسی کی اندھیری رات گزر چکی ہے، اور اب ایک نیا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ جس وقت اقبالؒ مستقبل کی یہ دھندلی سی تصویر دکھا رہے تھے، اس وقت یہ بات انتہائی ناقابل یقین لگتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب کسی مشرقی تہذیب کا کہیں سے بھی اٹھنا ممکن ہی نہ لگتا تھا۔ چینی افیون میں ڈوبے ہوئے تھے، بیشتر مشرقی اور مسلمان ممالک مغربی طاقتوں کے نوآبادیاتی علاقے تھے، افغانستان، ایران اور پاکستان کے اندر تہذیب زوال کی پستیوں کو چھو رہی تھی، نہ ان کے پاس حکومت تھی، نہ سیاست اور نہ ہی معیشت۔

اس وقت کہ جب یورپ اپنے عروج پر تھا، اقبالؒ یہ حیرت انگیز تجزیہ کر رہے تھے:

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد

یورپ کا حال یہ ہے کہ اپنی ہی تلوار سے کٹ چکا ہے، یعنی یہ تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کر چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے لادینیت کو فروغ دیا، اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیا، لبرل ازم اور آزادیءنسواں کے نام پر دینی اور معاشرتی اقدار کا بیڑہ غرق کر دیا۔

مشکلات حضرت انساں ازو است
آدمیت زخم پنہاں ازو است

آج انسانوں کی تمام تر مشکلات، غم، دکھ اور تکلیف مغربی تہذیب کے اس پہلو کی وجہ سے ہے کہ یہ لادین اور اخلاق باختہ تہذیب ہے۔ اس کے اندر دین کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اخلاقیات دین کی وجہ سے آتی ہیں۔ اخلاقیات اور انسانیت تو تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ جس معاشرے نے دین کو ترک کر دیا، اس نے انسانیت کو بھی ترک کر دیا۔

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بی منزل است

مغربی تہذیب کا حال یہ ہے کہ یہ انسان کو صرف مٹی اور پانی کا ایک بت ہی سمجھتی ہے۔ اس کی زندگی کے قافلے کی نہ کوئی سمت ہے، نہ کوئی رہبر اور نہ ہی کوئی منزل۔ اقبالؒ نے اس شعر میں مغربی تہذیب کا بحیثیت مجموعی تجزیہ کر دیا ہے۔ ایک بات تو اب بالکل واضح ہو چکی ہے کہ مغربی تہذیب کی تباہی کی وجہ مذہب اور ریاست کا الگ ہونا ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مغربی تہذیب کی ایک جھلک

اقبالؒ نے مغربی نظام اور تہذیب کو چنگیزی کہا ہے کہ جس نے انسانیت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں، اور اب مشرقی اقوام کو چاہیے کہ اپنے آپ کو منظّم کر کے انسانیت کی قیادت سنبھالیں۔ لیکن پھر یہ سوال اٹھتا ہے، جو کہ جائز ہے، کہ مشرقی اقوام تو علوم وفنون میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں، وہ کیونکر انسانیت کی قیادت سنبھال سکتی ہیں؟ سو سال پہلے بھی یہی مسئلہ تھا، آج بھی یہی مسئلہ ہے۔ چنانچہ جب لوگ مغرب کی تہذیب سے کچھ سیکھنے جاتے ہیں تو صرف سائنس وٹیکنالوجی سیکھ کر ہی نہیں آتے، اس کے ساتھ ساتھ مغرب کی پوری تہذیب بھی چلی آتی ہے۔

ہماری اشرافیہ کیلئے یہ آج بھی ایک بہت بڑا ابحران ہے کہ مغربی تہذیب کے فتنوں سے بچتے ہوئے، کیسے اس کی مثبت چیزیں لی جائیں۔ آج بھی ہمارے معاشرے، حکمرانوں اور اشرافیہ کا یہ حال ہے کہ یورپ اور امریکہ کی تہذیب سے ان کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں اور احساس کمتری کے زیر اثر وہ اپنی مشرقی اور اسلامی اقدار سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔

اقبالؒ نے ان مسائل پر بڑا غیر معمولی تجزیہ کیا ہے۔ جب وہ جدیدیت اور مغربیت کا فرق نوجوانوں کو سمجھاتے ہیں تو کہتے ہیں:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نہ از رقص دختران بے حجاب

مغربی تہذیب، کہ جو اس وقت پوری دنیا پر غالب ہے، اس کے غلبے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہاں ناچ گانا اور موسیقی بہت زیادہ ہے، نہ وہ اس لیے عروج پر ہیں کہ ان کی عورتیں بے حجاب رقص کرتی ہیں۔

نے ز سحر ساحراں لالہ روس
نے ز عریاں ساق و نے از قطع موست

اور نہ ہی مغرب کی ترقی اور عروج ان کے لوگوں کے ظاہری حسن و جمال کی وجہ سے ہے، اور نہ ہی اس وجہ سے کہ وہ بے لباس پھرتے ہیں اور نہ ہی اس وجہ سے کہ ان کے مرد بغیر داڑھی اور مونچھ کے ہوتے ہیں۔

محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش خط لاطینی است

نہ ہی یورپ اس وجہ سے محکم اور مضبوط ہے کہ وہ لادین ہو گیا ہے، نہ ہی اس کی مضبوطی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دین اور ریاست کو الگ الگ کر دیا ہے۔ ان کی طاقت کی وجہ سیکولرازم نہیں ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب فساد کی جڑ ہے اور ریاست کو لادین ہونا چاہیے اور مذہب ذاتی معاملہ ہے، تو یہ بھی تمہاری غلط فہمی ہے۔ اور نہ ہی یورپ کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ لاطینی رسم الخط میں لکھتے ہیں (یہاں اقبالؒ نے مصطفیٰ کمال پر بھی بھرپور طنز کیا ہے کہ جس نے ترکی زبان کے عربی رسم الخط کو تبدیل کر کے لاطینی حروف میں کر دیا تھا)۔

مصطفیٰ کمال ترکی کا نیا رسم الخط متعارف کرواتے ہوئے

صرف انگریزی سیکھنے سے یا اپنا رسم الخط تبدیل کرنے سے، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جدید ہو جاؤ گے تو یہ تمہاری حماقت ہے۔ یہ عبرت کا مقام ہے کہ آج لوگ اپنے آپ کو جدید ظاہر کرنے کیلئے اردو کو بھی لاطینی رسم الخط میں لکھنے لگے ہیں۔ آج ہمارے سارے بچے اور بڑے، اشتہاری ادارے حتیٰ کہ حکومت بھی، اردو کو لاطینی میں لکھتے ہیں، یعنی انگریزی حروف میں اردو لکھی جاتی ہے۔ اقبالؒ یہی سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ تم اپنے عربی رسم الخط میں، اپنی اردو میں، اپنی فارسی میں، اپنی ترکی زبان میں بھی ترقی کر سکتے ہو۔

قوت افرنگ از علم و فن است
از ہمی آتش چراغ روشن است

اگر یورپ طاقتور ہے تو وہ صرف علوم وفنون کی وجہ سے ہے، اپنے بہتر نظم ونسق اور انتظامی صلاحیت کی وجہ سے ہے۔ اسکی طاقت کا راز اپنے نظام اور اداروں کو مضبوط اور بہتر بنانے میں ہے، نہ کہ اس کی لادینیت میں، اسکی بے حیائی میں اور نہ ہی اس کی زبان میں۔

حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانع علم و ہنر امامہ نیست

سب سے کمال کا نکتہ اقبالؒ یہاں بتاتے ہیں کہ حکمت اور سائنس وٹیکنالوجی کا تعلق کپڑوں کی تراش خراش سے نہیں ہے۔علم وحکمت کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ تم کس قسم کا لباس، شلوار قمیض یا عبا پہنتے ہو۔لباس سے فرق نہیں پڑتا، سائنس وٹیکنالوجی کی راہ میں تمہارا عمامہ رکاوٹ نہیں ہے۔تم اپنا عمامہ پہن کر بھی، عورتیں اپنا حجاب لیکر بھی، اپنے برقعے اور نقاب کے ساتھ بھی، جدید علوم اور سائنس و ٹیکنالوجی، ڈاکٹری اور انجینئرنگ پڑھ سکتے ہو۔تم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو، کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارا حجاب، ہمارا لباس، ہمارا عمامہ، ہماری داڑھی، ہماری ٹوپی اور ہماری مشرقی وضع قطع، ہماری ثقافت، ہماری تہذیب، ہماری زبان، یہ سب سائنس وٹیکنالوجی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔یورپ کی ترقی کا راز اس کی سائنس وٹیکنالوجی، نظم ونسق اور انتظامی قوت میں ہے، اسے ضرور سیکھو، مگر اپنے لباس، اپنی زبان، اپنی تہذیب کو قائم رکھ کر۔اگر کسی بھی صورت تم نے اپنی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اختیار کیا، اور یہ سمجھے کہ اسی میں ترقی کا راز ہے، تو جان لو کہ تم اپنے دین سے بھی جاؤ گے، عزت وآبرو سے بھی جاؤ گے اور دنیا سے بھی۔

اس زمانے میں امت اور ملت کا یہی سب سے بڑا بحران تھا۔ایک طرف دین کی تعلیم تھی کہ جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی، کہ جس میں سائنس وٹیکنالوجی کا تصور تک نہ تھا۔جدید سائنسی علوم میں سے کوئی بھی علم مسلمان مدارس میں نہیں پڑھایا جاتا۔جدید سائنسی علوم انگریزی سکولوں اور کالجوں میں پڑھائے جاتے کہ جہاں دین کی تعلیم کا فقدان ہوتا۔نتیجتاً ان علوم کو حاصل کرنے والے مسلمان دینی علوم سے بالکل نابلد ہوتے۔یہ بحران آج بھی قائم ہے۔

آج پاکستان میں بھی کئی تعلیمی نظام قائم ہیں۔ایک طرف مدرسوں کا نظام ہے، دوسری طرف سرکاری اردو اور انگریزی میڈیم سکولوں کا نظام الگ ہے، اور اس کے علاوہ نجی انگریزی سکولوں کا ایک الگ سلسلہ ہے۔اقبالؒ کے زمانے میں ان جدید تعلیمی اداروں میں جنہوں

خلافت عثمانیہ کے تاریخی ورثے سے لی گئی ایک تصویر

نے تعلیم پائی، ان میں سے اکثر بالکل مغرب پرست ہوگئے اور انہوں نے اپنے آپ کو مغرب کی اقدار کے مطابق ڈھال لیا۔ جنہوں نے اپنی اقدار کو قائم رکھا، وہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ یہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا، خاص طور پر نوجوان نسل کیلئے۔ بزرگوں نے تو پھر بھی کسی حد تک اپنی اقدار سنبھال رکھی تھیں، لیکن اس دور کے طوفان میں کہ جب مغربی تہذیب اور انگریزوں کی حکومت تھی، نوجوان نسل کیلئے اپنی اقدار پر قائم رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ آج پاکستان میں انگریزوں کی حکومت تو نہیں، مگر انگریزوں کا وہی استعماری تعلیمی نظام آج بھی ہم پر مسلط ہے۔ ہماری نئی نسلیں آج بھی آکسفورڈ اور کیمبرج کے بنائے ہوئے نظام تعلیم میں پڑھتی ہیں اور مکمل طور پر اپنی تہذیب، دین، زبان اور تمدن سے نابلد ہیں۔

اسی تعلیم کے حوالے سے اقبالؒ فرماتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خندان سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم بھی نوجوانوں کی ترقی سے خوش تو ہیں مگر ساتھ ساتھ ہمارے لبوں سے ایک فریاد بھی نکلتی ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

ہم تو سمجھتے تھے کہ بچے تعلیم حاصل کر کے آئیں گے تو خوشحالی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کردار کے مالک ہونگے، اعلیٰ اخلاق کے حامل ہونگے، بڑوں کا ادب جانتے ہونگے، چھوٹوں پر شفقت کریں گے، اپنے دین کے حوالے سے علم رکھنے والے ہونگے، شعور بیدار ہوگا، کفر کے جتنے بھی خرافات ہیں، ان کو سمجھیں گے، اپنے دین کو سمجھنے کا شعور پیدا کریں گے، انکی اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق اور محبت بڑھے گی، اللہ کے حضور عاجز ہونگے، لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ اس مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ کفر اور الحاد بھی چلا آئیگا۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ بچے آکر بات کریں گے کہ اسلام اور شریعت کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہمیں کیا پتہ تھا کہ بچے آنے کے بعد اشتراکیت، سرمایہ دارانہ نظام اور جمہوریت کی بات کریں گے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ بچے واپس آنے کے بعد یہ کہیں گے کہ دین کو سیاست سے جدا ہونا چاہیے، مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے، ہم نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، عبادات کریں یا نہ کریں، اچھائی کریں یا نہ کریں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ دنیا کی چند دن کی زندگی عیاشی کیلئے بنائی گئی ہے اور آخرت کس نے دیکھی ہے۔

اسی المیے پر اکبر آلہ آبادی نے بھی بڑے طنز سے تبصرہ کیا تھا:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

یہی ہوتا تھا اس زمانے میں، اور آج کے دور میں بھی یہی حال ہے۔ جدید نظام تعلیم میں بچوں کی خودی کو مغربی تہذیب کے تیزاب میں ڈبو کر مسخ کر دیا جاتا ہے، کہ جہاں پر اسلامیات کی کتابیں بھی یورپ سے لکھی ہوئی آتی ہیں، جہاں مطالعہ پاکستان کی کتابوں میں پاکستان کا ذکر تک نہیں ہوتا اور چندر گپت موریا، اشوکا، بدھا اور موہنجوداڑو کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ ہر سکول اپنی مرضی کا نصاب لے کر چل رہا ہے، کوئی سنگاپور کا چھپا ہے، تو کوئی آکسفورڈ کا، کہ جسے بڑے فخر سے پڑھایا جاتا ہے۔ اس تعلیمی نظام میں، نہ اس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ میں، نہ اسلامیت کی کوئی جھلک ہے نہ پاکستانیت کی محض فاسد مغربی تہذیب سے آلودہ، راہ گم کردہ نسل۔

انگریزی پڑھنے میں مضائقہ نہیں، لیکن انگریزی کن شرائط پر؟

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

اقبالؒ نے یہاں اس تصور پر بہت تیز طنز کیا ہے کہ جو یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی ترقی کیلئے عورتوں کو انگریزی کی تعلیم دلانا اور گھروں سے نکالنا لازمی ہے۔ اقبالؒ کی نظر میں ہر وہ تعلیم کہ جس سے مسلمان عورت اپنی نسوانی ذمہ داریوں سے دور ہوتی ہو یا اسلام سے دور ہوتی ہو، اس قوم کیلئے زہر قاتل ہے۔

۱۹۲۰ء سے ۴۰ء تک کے عشروں میں، امریکہ میں بھی ۹۰ فیصد خواتین House Makers (گھریلو خواتین) ہی ہوا کرتی تھیں۔ وہ گھروں پر رہ کر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کرتیں اور گھر آباد کرتیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد روتھس چائلڈز نے آزادیٔ نسواں (Women Liberty) کے نام پر عورتوں کو بھی گھروں سے نکالا۔ اب چونکہ اس صورت میں گھر پر بچوں کی تربیت کرنے والا کوئی نہ ہوتا، لہٰذا ڈے کیئر سینٹر سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک بچوں کی تمام تر تربیت اور ذہن سازی کی ذمہ داری انہی لادین سکولوں، کالجوں اور جامعات کو دے دی گئی۔ وہ تربیت کہ جو پہلے ماں باپ کیا کرتے تھے، اب لادین، اخلاق باختہ اساتذہ کے پاس چلی گئی۔ اسی منصوبے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مغرب کا معاشرہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اب یہ سب کچھ ہمارے معاشرے میں بھی کیا جا رہا ہے۔ اقبالؒ تعلیم کے خلاف نہیں ہیں، اگر خلاف ہیں تو ایسی تعلیم کے کہ جس کے ساتھ الحاد بھی چلا آئے۔

روش مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ

حقیقت یہ ہے کہ جب انگریزی پڑھائی جاتی ہے تو اس کا مقصد مغربیت کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا نہیں، مغرب زدہ کرنا مقصود ہے، مسلمانوں کو مغرب کی اخلاقیات سے مرعوب کرنا ہے۔ نتیجتاً اس تعلیم کے بعد مسلمان اپنی مشرقی اور اسلامی وضع کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔
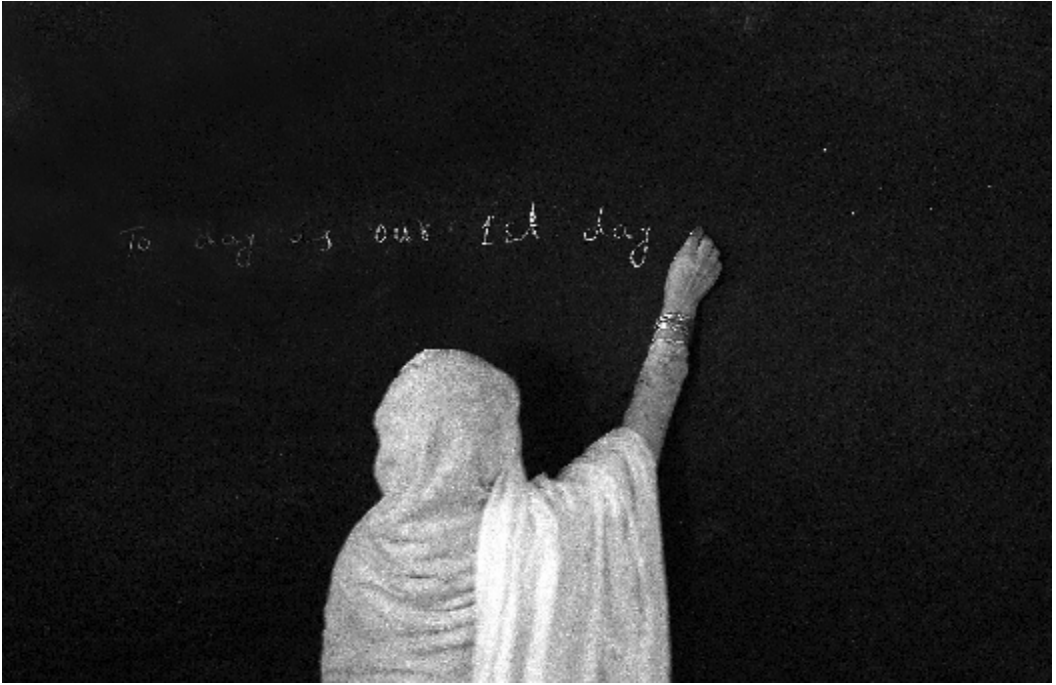
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس تعلیم کے بعد معاشرے میں کیا فساد برپا ہوگا، وہ جلد ہی اس قوم کو نظر آ جائے گا۔ دیکھتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کا اس تعلیم سے کیا حشر ہوتا ہے۔ جس طرح مغرب نے اپنا بیڑہ غرق کیا ہے، اسی طرح یہ ہماری نوجوان نسلوں کا بھی بیڑہ غرق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ تعلیم ہے کہ جس میں الحاد بھی ہے، مغربیت بھی اور بے ادبی بھی۔ اس تعلیم کے حوالے سے ایک اور شعر جو کہ ہمارے لیے انتہائی عبرت آموز ہے:

ہے مداواء جنون، نشتر تعلیم جدید
میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

کہ مسلمانوں کے جذبہء ایمانی اور انکی قومی غیرت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو جدید مغربی تعلیم دلائی جائے، کہ اس تعلیم کے نتیجے میں مسلمانوں کے وجود سے غیرت کا لہو نکال لیا جاتا ہے۔

مداواء جنون کیا ہے؟ مسلمان بنیادی طور پر اپنی اقدار کے حوالے سے جنونی اور دیوانہ ہوتا ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیلیئے، اپنے اخلاق کیلیئے، اقدار کیلیئے، انسانیت کی فلاح کے معاملے میں رومانوی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا محور یہ ہوتا ہے کہ وہ اس زمین پر اللہ کا نظام قائم کرے، عدل وانصاف قائم کرے اور ظلم وستم کے خلاف کھڑا ہو۔ اس کو آجکل کی اصطلاح میں جنون اور دیوانگی ہی کہا جائے گا۔

آجکل کے دور میں اگر کوئی شخص کروڑوں روپے کی رشوت اور حرام لینا ترک کر دے، تو لوگ اسے پاگل کہیں گے۔ کوئی شخص اپنے دین اور عزت و آبرو کا سودا نہ کرے، تو لوگ اسکو دیوانہ کہتے ہیں۔ کوئی شخص اگر اپنے اخلاق اور دین کی خاطر کروڑوں لاکھوں کا نقصان برداشت کر لے، سر کٹوا لے، تو اسے جنونی کہا جائے گا۔ یہ اللہ کے بندوں کا جنون ہی ہوتا ہے کہ جس کے باعث وہ کفر اور ظلم کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔ تاریخ میں جو بھی مسلمان اللہ کے دین کی خاطر کھڑا ہوا ہے، وہ اپنے وقت میں دیوانہ اور پاگل ہی کہلایا۔ ایسے ہی ''جنونی'' اور ''پاگل'' لوگوں، کہ جو اپنے مقصد کی خاطر، اخلاق حسنہ کی خاطر، اقدار کی خاطر، اپنے دین اور ایمان کی خاطر، کٹ مرنے کیلئے تیار رہتے ہیں، کے متعلق اقبالؒ کہتے ہیں:

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

اس قسم کی مخلوق کو توڑنے اور شکست دینے کا، آجکل کے دور میں، کفار نے علاج ایجاد کیا ہے کہ اس کو جدید تعلیم دلواؤ۔ اس کو اے لیول، او لیول کرانے والے جدید سکولوں میں بھجوا دو، اس کو یورپ اور امریکہ کی سیر کراؤ، اس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے نام پر ایسے ماحول میں بھیج دو، کہ جہاں اس کی اخلاقیات، دین، تہذیب و تمدن اور اس کی اقدار کا بیڑہ ہی غرق ہو جائے۔

میرا سرجن رگ ملت سے لہو لیتا ہے

سرجن کا کام علاج کرنا ہوتا ہے، لیکن اگر وہ سرجن مریض کے جسم سے خون نچوڑنا شروع کر دے تو مریض کا کیا حال ہوگا! یہ سرجن، یہ مغربی تہذیب، یہ مغربی تعلیم، جس کو ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہماری قوم اور ملت کا علاج کرے گی، کہ جس سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہو تو مغربی تہذیب قبول کر لو، یہ ایسا علاج ہے کہ جو اس ملت کے وجود سے خون چوس رہا ہے، اس ملت کی شرم و حیاء، عزت و آبرو اور غیرت کا جنازہ نکال رہا ہے۔ آج ہمارے ذہین ترین بچوں کا حال یہ ہے کہ جب پڑھنے کیلئے مغربی تعلیمی نظام میں جاتے ہیں، تو وہ صرف سائنس ہی نہیں پڑھتے، بلکہ ان سکولوں میں سکھائی جانیوالی تہذیب کو بھی اپنا لیتے ہیں۔

خود پاکستان میں موجود تعلیمی اداروں کا حال یہ ہے کہ دارالکفر سے بڑھ کر کفر کا ماحول ہے۔ ہر قسم کی خرافات کہ جو مغرب کی تہذیب سے آتی ہیں، جیسے ویلنٹائن ڈے، بسنت، نیو ایئر نائٹ، کرسمس وغیرہ اسے جوں کا توں قبول کیا جاتا ہے۔ یہ تعلیم تو نہیں ہے! سائنس و ٹیکنالوجی تو نہیں ہے! یہ تو مغرب کی تہذیب ہے کہ جو یہاں لا کر مسلط کر دی گئی ہے۔ ان سکولوں میں پڑھنے والے ہمارے ۹۹ فیصد بچے ٹھیک سے اردو بھی نہیں جانتے۔ انگریزی میں بات کرنے سے نہیں روکا ہم نے، لیکن کس نے کہا ہے کہ اردو بھول جاؤ، کس نے کہا ہے کہ اردو لکھنا اور پڑھنا ترک کر دو۔ اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں۔ سکول، حکومت اور والدین اس بات کے ذمہ دار ہیں۔ ان بچوں کو تو کچھ نہیں معلوم، یہ تو معصوم ہیں، ان کو تو جہاں ماں باپ داخل کرا دیں گے، یہ چلے جائیں گے۔

خلافت عثمانیہ کے دور میں ایک مسلمان سکول
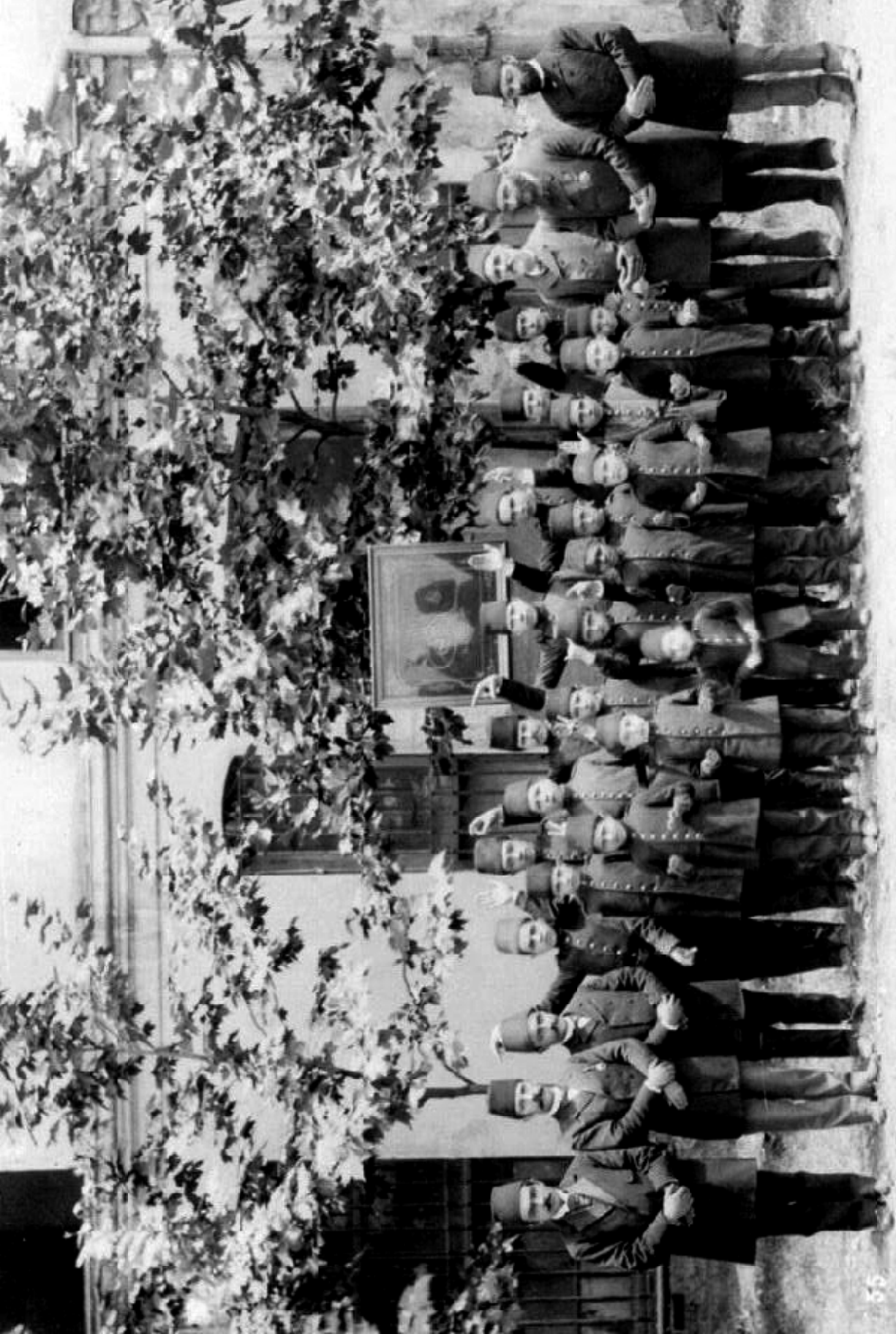
پاکستان کا اور امت مسلمہ کا آج سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ ترین پڑھے لکھے بچے، جو اس تعلیمی نظام میں جاتے ہیں، وہ امت اور ملت کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن اب اس قوم و نسل پر اللہ کا خاص کرم اور احسان ہو رہا ہے کہ نوجوان نسل بیدار ہو رہی ہے۔ ان میں پاکستان سے محبت کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہے، یہ اپنے دین کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔ اور یہ سب اللہ کے فضل سے ہو رہا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ مغرب کا تعلیمی نظام انکو دین کی طرف موڑ رہا ہے۔ یہ جو پوری دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا ہے، جس طرح غزہ میں فلسطینیوں کو ذبح اور شہید کیا جا رہا ہے، جس طرح کشمیر میں انہیں ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے، جس طرح عراق میں مسلمان مارے جا رہے ہیں، اسی کا ردعمل ہے کہ مسلمان بچوں میں مغربی تہذیب کے خلاف بیزاری پیدا ہو رہی ہے اور وہ اپنے دین کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفان مغرب نے

مغربی تہذیب کی یہ کوشش نہیں تھی۔ مغربی تہذیب کا تو خیال یہی تھا کہ ان تمام بچوں کو ہم اپنے رنگ میں ڈھال کر دین سے عاری کر دیں گے، لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے بچے اب اس نظام میں پڑھنے کے باوجود بیدار ہو رہے ہیں۔

اقبالؒ نے مغربی تہذیب کے حوالے سے جو بات کہی تھی، وہ تقریباً ہم مکمل کر چکے ہیں۔ آنے والے ابواب میں ہم اقبالؒ کے اس پیغام کی بات کریں گے، کہ جو براہ راست انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو مخاطب کر کے دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مرحلہ وار ایک مومن کی صفات کا نقشہ کھینچا اور پھر اللہ کے اس ولی اور فقیر کی تصویر کشی کی کہ جس کا کردار ایک مسلمان کی معراج ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے پورے

کلام میں کوئی ایسا شعبہء زندگی نہیں چھوڑا کہ جس میں امت کو رہنمائی کی ضرورت تھی۔

انہوں نے مغرب کی طرف سے آنے والے تمام فتنوں کے تجزیے کے ساتھ ساتھ، بندۂ مومن کی صفات بھی بتائیں۔ یہ بھی بتایا کہ بندۂ مومن جب اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کرتا ہے تو بندہ ءمولا صفات بن جاتا ہے۔ جب وہ قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت بنتا ہے، تو پھر وہ زمین و آسمان کو اپنے رب کی مرضی سے ہلا دیتا ہے اور اس کے بعد انہوں نے اللہ کے ایک ایسے ولی کی تصویر کھینچی کہ جو انسان کی اصل روحانی اور حقیقی معراج ہے کہ جس کو انہوں نے اپنے فلسفہء خودی میں بیان کیا ہے۔

اب ہم مغربی تہذیب کے حوالے سے اپنے دلائل کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ اقبالؒ نے جن سارے ''ازموں'' کی بات کی، مغربی تہذیب، ان کے نظام کا اور ان کی تعلیم کا جو تجزیہ کیا، ان میں اکثر وہ باتیں ہیں کہ جو یہودیوں کی کتاب Protocols of the Learned Elders of Zion میں بھی یہود نے لکھی ہوئی ہیں۔ اقبالؒ نے کبھی protocols کا ذکر تو نہیں کیا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اقبالؒ یہودیوں کی سازشوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہودیوں کا پورا کھیل کہ جو انیسویں صدی کے آخر میں انہوں نے تحریر کیا، اور جس کے مطابق بیسویں صدی میں انہوں نے پوری دنیا میں جنگیں برپا کر کے اسرائیل کی ریاست کا قیام وجود میں لانا تھا، اور دنیا پر غلبہ حاصل کرنا تھا، اس کتاب میں درج ہے۔

یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں پہلی دفعہ منظر عام پر آئی کہ جسے روس کے اچھے عیسائیوں نے چھاپا تھا، اور یہ ''وسائق یہودیت'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہودیوں نے بیٹھ کر فیصلہ کیا تھا کہ ہم کیسے اسرائیلی ریاست بنائیں گے؟ دنیا پر کس طرح قبضہ کریں گے؟ کس طرح انسانیت کے کردار اور اخلاق کو تباہ و برباد کریں گے؟ تعلیمی نظام کو کیسے کنٹرول کریں گے؟ کس طرح سیکولرازم پھیلائیں گے؟ یہ سب سازشیں انہوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں۔ اقبالؒ کے دور میں، اس کتاب تک مسلمان امت کی رسائی نہیں تھی، مگر اقبالؒ نے اپنی پوری شاعری میں جن سازشوں کو آشکار کیا ہے، وہ تمام کی تمام اس کتاب میں درج ہیں۔

اللہ کے جو بندے ایمان لاتے ہیں اور دین پر قائم ہو جاتے ہیں، ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جو ابلیس کے نمائندے ہوتے ہیں، ان پر شیاطین کا نزول ہوتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن میں

پوری آیت موجود ہے۔کفار کے پیچھے ایک شیطانی طاقت ہوتی ہے اوراس طاقت کا مقابلہ کرنے کیلئے ایسے بندے درکار ہوتے ہیں کہ جواللہ کے ولی ہوں، کہ جن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہو، کہ جن کواللہ اپنی خاص الخاص ہدایت اور رہنمائی عطا کرتا ہو۔اقبالؒ اسی درجے سے تعلق رکھتے تھے۔اللہ نے جوان کوفہم اور فراست عطا کی ہوئی تھی ،وہ صرف اولیاء اللہ ہی کونصیب ہوتی ہے۔اقبالؒ نے جس طرح مغرب کی شیطانی سازشوں کوآشکار کیا، وہ فقط فضل الٰہی ہی سے ممکن ہے۔

ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

فرنگیوں نے یعنی مغربی تہذیب نے مذہب کوسیاست سے الگ کر دیا ہے،لہٰذا اب ان کی سیاست ایک ایسی بے قابوعفریت بن چکی ہے کہ جو پوری دنیا میں تباہی مچاتی پھر رہی ہے۔مسلم امت میں آج تک کسی مفکراور دانشور نے مغربی تہذیب کا اتنا بے باکانہ تجزیہ نہیں کیا۔

اسی طرح تعلیم کے حوالے سے وسائق یہودیت میں یہ صاف صاف لکھا ہے کہ ہم ایسی تعلیم کا اجراء کریں گے کہ جوبچوں کو دہریہ بنائے گی ،الحاداور کفر پھیلائے گی۔اقبالؒ نے جس سطح پہ جا کر صیہونیوں کے راز کھولے ہیں اوراسکی جڑ اکھاڑی ہے،اس کیلئے صرف ہم ایک ہی لفظ کہیں گے! Incredible یعنی ناقابل یقین! یہی منصوبہ تھا کفر کا، کہ جو وہ عالم اسلام پر نافذ کرنا چاہتے تھے، کہ جو اقبالؒ نے امت مسلمہ کے سامنے بہت آسان زبان میں کھول کر رکھ دیا۔اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ کفر کیلئے سب سے خطرناک شخص علامہ اقبالؒ ہیں۔

۹

جاتا ہے جدھر بندۂ حق، تو بھی ادھر جا!

اس سے پہلے کہ ہم علامہ اقبالؒ کی فکر کے ان پہلوؤں کی طرف جائیں، کہ جہاں وہ ایک مردمومن کی تعریف بیان کرتے ہیں، کہ جہاں وہ علم اور عشق کی حدود کا تعین کرتے ہیں، کہ جہاں وہ فقر کو واضح کرتے ہیں، کہ جہاں وہ مرد آزاد کو مرد غلام سے جدا کرتے ہیں، ایسے مرد کامل کی تیاری سے پہلے یقینی طور پر ضروری ہے کہ امت کے مسائل کی تشخیص کی جائے۔ حل سے پہلے ہم تشخیص کی بات کریں گے۔ امت مسلمہ کے وہ مسائل، خصوصاً وہ کہ جو نوجوانوں کو درپیش ہیں، انکا ذکر ضروری ہے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

آپ اگر معاشرے کے مختلف طبقات کے، چاہے وہ علماء ہوں، امراء ہوں، غرباء ہوں، معاشرے کے نوجوان ہوں یا دانشور، مجموعی طور پر مسائل کی تشخیص اور تجزیہ کرتے ہیں، تو اس کے بعد ہی آپ حل دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ گو کہ پورا کلام اقبالؒ ہی غیر معمولی ہے، جیسے ہم نے عرض کیا، کہ وہ تو انسان کے ہوش اڑا دینے والا کلام ہے اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی انسان کلام اقبالؒ کو پڑھے اور اس کے وجود میں طوفان نہ برپا ہو جائے، مگر ایک بہت مشہور نظم ہے کہ جسے تاریخ میں ''جواب شکوہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ وہ نظم ہے کہ جس میں اقبالؒ نے امت کی نبض شناسی کی ہے۔ حیرت انگیز طور پر تقریباً سو سال پہلے لکھی جانے والی یہ نظم، آج بھی اسی طرح قابل اطلاق ہے، اور ہمیں یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ آج ہی کیلئے لکھی گئی ہو۔

....

اب ہم ''جواب شکوہ'' کی بات کریں گے، کہ جو ایک فرضی کلام ہے ایک مسلمان اور اسکے رب کے درمیان۔ پہلے اقبالؒ نے ''شکوہ'' کے نام سے نظم لکھی، کہ جس میں علامہؒ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرتے ہیں کہ اے مالک! کیا وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان ذلیل و رسوا ہو رہے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ کفار ہم پر اس طرح حملے کر رہے ہیں کہ جیسے دستر خوان پر کھانا لگا ہو اور بھوکے اس پر ٹوٹ پڑیں؟ کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے خلافت، حکومت، عزت، معاشرت، معیشت اور فوجی طاقت، سب کچھ چلا گیا؟ وہ شکوہ کرتے ہیں، کہ مالک یہ سارا معاملہ تیرے غلاموں کے ساتھ، تیرے فقیروں کے ساتھ ہی کیوں ہے؟ یہ تو تیرے ہی نام لیوا ہیں۔ یہ امت رسول ﷺ کیوں دنیا میں ذلیل و رسوا ہو رہی ہے؟ اقبالؒ ایک قلندرانہ انداز میں اللہ سے شکوہ کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ، ہم سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ نے ہمیں اس حال تک کیوں پہنچنے دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ آج اکثر مسلمان یہ سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اللہ کو ماننے والے ہیں اور امت رسول ﷺ میں سے ہیں، تو آج اتنے ذلیل و خوار کیوں ہو رہے ہیں، ہم میں کیا خرابی ہے؟

ایک فقیر کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور بے تکلفی کا اپنا ہی ایک منفرد انداز ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہر کوئی بے تکلف ہونے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس جرأت کیلئے بھی اللہ تعالیٰ سے ایک خاص تعلق اور اس کا اذن چاہیے۔ وہ ملّا کہ جو اللہ سے خاص تعلق نہیں رکھتے تھے، اقبالؒ کے اس قلندرانہ انداز کو نہ سمجھ سکے، اور کفر کے فتوؤں کی بوچھاڑ کر دی، کہ انہیں اللہ سے شکوہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی! ان اعتراضات کے جواب میں ہی اقبالؒ نے ''جواب شکوہ'' لکھی۔ اس معرکتہ الآراء نظم میں اقبالؒ نے اللہ کی طرف سے ''شکوہ'' کا جواب دیا ہے، کہ جس میں اللہ امت سے مخاطب ہو کر ان تمام اسباب کا ذکر کرتا ہے کہ جن کہ وجہ سے امت آج زوال پذیر ہے، ذلیل خوار ہے، محکوم اور راہ گم کردہ ہے۔

''جواب شکوہ'' ایک بہت طویل نظم ہے۔ ہم نے اس میں سے کچھ ایسے حصوں کا انتخاب کیا ہے کہ جو آج کے حالات سے نسبتاً زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ براہ راست پاکستانی قوم سے ہی مخاطب ہیں:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی، یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں پر اللہ تعالیٰ جواباً امت سے شکوہ کر رہا ہے کہ اس کے فضل اور کرم میں تو کوئی کمی نہیں، مگر تم میں کوئی اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کرم

سے فیض لے سکے۔ ہمارا کرم شیروں اور دلیروں پر ہوتا ہے، بزدلوں اور بے غیرتوں پر نہیں۔تم جب عزت کے طالب ہی نہیں ہو،تو ہم تمھیں عزت کیوں اور کیسے عطا کریں!تم سے پہلے جو دنیا و آخرت میں سعادت کی زندگی کے طلبگار تھے،ان کو ہم نے دنیا و آخرت میں نوازا اور یہی ہماری سنت ہے۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ایک شخص دنیا میں اس لیے عمل کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اسے دنیا میں عزت ملے گی،تو اسکا اجر اسکی نیت کے مطابق ہی ہوگا۔اسی طرح کوئی شخص اگر نیک اعمال کرتے ہوئے آخرت کی نیت کرتا ہے تو اسکا اجر بھی اسکی نیت کے مطابق ہی ہوگا۔سب سے پہلے سوال انسان کی نیت کا ہی آتا ہے۔

''جواب شکوہ'' میں اللہ یہ کہتا ہے کہ تم میں سے کون ہے کہ جو عزت کا طلبگار ہے، کہ جو رب کا طلبگار ہے، کہ جو اس دنیا سے آگے نکل کر آخرت کے ان مقامات پر نگاہ رکھتا ہے کہ جو خاص طور پر ایک بندہ ءمومن کی شان ہوتے ہیں۔ ہر مسلمان یہاں پر اپنا محاسبہ کرے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا میں اسی لیے زندہ ہوں کہ بقول اکبر آلہ آبادی:

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

زندگی کا مقصد کیا ہے؟ بغیر مقصد حیات،انسان،''انسان''نہیں بنتا۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

ہر انسان جب تک شعوری طور پر یکسو نہ ہو جائے کہ اس کا جینا، مرنا، اٹھنا بیٹھنا، دین کے واسطے ہے،تو اس کی زندگی بے مقصد و بیکار ہے۔اللہ تو بے چین ہے کہ وہ کس کو عطا کرے، کس کو دے؟ امت میں کوئی طلبگار اور قابل ہی نہیں۔

عروج کی جانب سفر کا آغاز ہی نیت کی درستگی سے ہوتا ہے، اپنے مشن کی جانب یکسوئی سے ہوتا ہے۔اقبالؒ نے بھی جب امت کا تجزیہ کیا،تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ امت کی نیت و مقصود درست نہیں ہے۔فرماتے ہیں،تمہارا محبوب،تمہارا مطلوب،تمہارا معبود، درست نہیں ہے، نتیجتاً تم راہ گم کردہ ہو۔جب تم لا الہ الا اللہ کہتے ہو،تو اسکا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ تم زمانے کے تمام خداؤں کو رد کرتے ہو، کہ جس میں سب سے بڑا بت خود تمہاری خواہش نفس ہے۔ جب تم آج کے دور کے ان ''لات ومنات'' کو اپنے وجود میں پاش پاش کرتے ہو اور تمہارا ''لا الہ'' درست ہوتا ہے،تب ہی تم اس قابل ہوتے ہو کہ ''الا اللہ'' کہہ سکو۔

اللہ تعالیٰ جب کرم کرتا ہے،تو جوہر قابل پر ہی کرتا ہے، کمینے اور گھٹیا انسان پر نہیں کرتا۔اللہ کو بھی وہ شخص سخت ناپسند ہے کہ جو رب کا ناشکرا ہو، احسان فراموش ہو، جھگڑالو ہو، حاسد ہو، بخیل ہو، حریص ہو، کینہ پرور ہو، بدزبان ہو، ناپاک و پلید ہو، اللہ کی مخلوق پر ظلم کرتا ہو،

اور جس کے سامنے بار بار اللہ کی نشانیاں آتی ہوں اور وہ ٹھکرا کر انہیں نظر انداز کر دے، جو زمانے کا ابوجہل اور ابولہب ہو، زمانے کا قارون ہو۔

اللہ کے کرم کے قابل ہونے کیلئے اس کرم کو طلب کرنا شرط ہے۔ ہر کوئی اپنے ظرف کے مطابق ہی رب سے طلب کرتا ہے:

ایمان سلامت ہر کوئی منگے
عشق سلامت کوئی ہُو

آج کل تو ایمان سلامتی کی دعا بھی کوئی نہیں کرتا۔ اپنی دعاؤں کو ہی دیکھ لیجیئے کہ کہاں تک محدود ہیں۔کوئی صرف صحت طلب کر رہا ہے، تو کوئی مقدمات کے جیتنے کی دعائیں اور کوئی مال و دولت میں اضافے کی۔''**لیس الانسان الا ما سعی**''، بے شک انسان کو وہی کچھ ملتا ہے کہ جس کی وہ کوشش وطلب کرتا ہے۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا ابراہیمؑ پدر اور پسر آزر ہیں

یہ انتہائی غیر معمولی بات ہے۔ یہاں اقبالؒ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ کر رہے ہیں۔نہ مسلمانوں کے پاس فوجی و سیاسی قوت رہی اور نہ ہی ان کے قلب و فکر میں توحید کی طاقت۔ان کے دلوں میں مغربی تعلیم وتہذیب کی وجہ سے کفر والحاد نے گھر کر لیا ہے،ان کی معیشت سود و رباء پر مبنی ہے،اوران کی طاقت انکی جمعیت کے ٹوٹنے کی وجہ سے منتشر و پارہ پارہ ہے۔آج امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں، حب الدنیا میں غرق،موت سے خائف،مسلکوں اور فرقوں میں تقسیم، بے علم و بے ہنر،فکر ونظر آلودہ،سرگردہ و پریشاں۔جیسی امت، ویسے ہی حکمران۔

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں

حضرت ابراہیمؑ سے لیکر محمود غزنویؒ تک،مسلمان ہمیشہ ہی بت شکن رہے ہیں۔حضورﷺ نے بھی خانہ کعبہ میں اپنے دست مبارک سے تین سو ساٹھ بتوں کو پاش پاش کیا تھا۔مسلمان کی شان ہی بت شکن ہونا ہے، بت گر و بت فروش ہونا نہیں۔ بت صرف لکڑی یا پتھر کے ہی نہیں ہوتے۔شرک یہ بھی ہے کہ انسان اپنی انا کو، دولت کو،عہدے کو،قومیت کو،لسانیت کو،معبود بنا لے۔تین سو ساٹھ بت کہ جو خانہ کعبہ میں رکھے گئے تھے،آج ہمارے معاشرے میں،شکل بدل بدل کر موجود ہیں۔ ہر انسان کے نفس میں یہ تین سو ساٹھ ''بت'' چھپے ہیں۔ ہر وہ تصور،نظریہ یا عمل کہ جو اللہ اور اسکے رسولﷺ کے مقابلے میں کھڑا ہو،آج کے دور کا بت ہے۔وطن بھی بت ہے،نیشنلزم،

سوشلزم اور جمہوریت بھی بت ہیں۔ جو یہ کہتا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ جمہور کے پاس ہے، یا کسی آمر کے پاس ہے، یا کسی جماعت کے پاس ہے، یا پارلیمان کے پاس ہے، تو وہ بھی شرک کرتا ہے، کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اور صرف اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی ہے۔ آج کے دور کے مسلمانوں کا المیہ ہی یہی ہے کہ وہ توحید کے علمبردار اور بت شکن ہونے کے بجائے ان جدید دور کے بتوں کے پجاری بن چکے ہیں۔

کس قدر تم پر گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے
طبع آزاد پہ قید رمضاں بھاری ہے
تمہی کہہ دو کیا یہی آئین وفاداری ہے
قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تو تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفل انجمن بھی نہیں

شریعت پر عمل کے بغیر امت کا عروج ممکن نہیں، چاہے انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی۔ قوموں کی اجتماعی تربیت کا آغاز انفرادی تزکیے سے ہوتا ہے۔ مکارم اخلاق کا آغاز ارکان اسلام پر عمل سے ہوتا ہے۔ امت کے زوال کا آغاز وہاں شروع ہوتا ہے کہ جب ارکان اسلام سے غفلت برتی جائے۔ توحید و بت شکنی کے بعد، بندۂ مومن پر لازم ہے کہ شریعت کو مضبوطی سے تھامے۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد روحانی درجات کی ترقی کا دارومدار شریعت مطہرہ کی حدود میں رہنے پر ہے۔ ہر مسلمان، مومن، متقی، محسن، صالح، شہید، صدیق، خواہ ایمان کے کسی بھی درجے پر ہو، شریعت کا پابند ہوتا ہے۔

نیت کی درستگی، توحید کی مضبوطی اور شریعت کی پیروی کی تاکید کے بعد، اقبالؒ بندۂ مومن کی منزل و مقام کا تعین کرتے ہیں۔ جنت کی خواہش کوئی ناجائز نہیں، مگر شاہین شہہ لولاک ﷺ کی منزل اس سے بھی آگے ہے۔ اقبالؒ کا مرد مومن، فقر غیور کا حامل، وہ شاہین ہوتا ہے کہ جس کیلئے دنیا کی طلب، حتیٰ کہ جنت کی طلب بھی حرام ہوتی ہے۔ وہ رب کی ذات کا طالب ہوتا ہے، قرب رسول ﷺ کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس کا عمل بے غرض، اس کے ارادے جلیل اور خواہشات قلیل ہوتی ہیں۔

جس کا عمل ہے بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

اب یہاں اقبالؒ ایک اور اہم نقطے کی طرف آتے ہیں۔ اسلام میں دین اور دنیا الگ الگ نہیں، بلکہ دنیا گزارنے کا نام ہی دین ہے۔ توحید و شریعت کے ساتھ ساتھ مردان خود آگاہ و خدا مست کا ایک اور وصف یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے معاملات کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ مومن کبھی احمق نہیں ہوتا۔ فرمایا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے بچو، کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ تاریخ اسلام میں اللہ نے جس شاہین سے بھی قوموں کی تقدیریں اور تاریخ تبدیل کرنے کا کام لیا ہے، وہ اپنے دور کا اعلیٰ ترین، ذہین ترین، صاحب بصیرت،

صاحب فہم اور ذیرک وجود تھا۔ علم و ہنر وفن، مسلمانوں کے گھر کی میراث تھی۔ پوری دنیا صدیوں تک مسلمانوں کے علوم وفنون، سائنس وٹیکنالوجی، ایجادات وتعمیرات کے جلائے ہوئے چراغوں سے روشن رہی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک فرد بندۂ مومن بھی ہو اور ساتھ ہی احمق بھی، بے ہنر بھی، بے نظر بھی اور بدسلیقہ بھی۔ دنیاوی علوم میں عروج حاصل کرنا بھی ہر مومن کی ذمہ داری ہے کہ اس کے بغیر دنیا میں ترقی وکمال ممکن نہیں۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو

اقبالؒ اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ ہم مسلمانوں نے جہاں شریعت ترک کر دی، وہاں دنیا بھی ترک کر دی۔ نہ ہم سائنس وٹیکنالوجی میں آگے ہیں، نہ ہمیں کوئی فن آتا ہے۔ پچھلے ایک سو سال میں دنیا میں جتنی بھی ایجادات ہوئیں، اگر ان کی تعداد گنی جائے، تو ان میں سے ایک فیصد بھی مسلمانوں کی ایجادیں نہیں ہیں۔ دنیا کی پہلی پانچ سو جامعات میں شاید ہی کوئی ایک آدھ مسلمانوں کی ہو۔ یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک کی صنعتی پیداوار، پچاس سے زائد مسلمان ملکوں سے زیادہ ہے۔ پوری دنیا میں سب سے کم تعلیم یافتہ امت آج ہم مسلمان ہیں۔ دنیا کے اعلیٰ ترین قدرتی وسائل رکھنے کے باوجود، مسلمان ممالک دنیا کے غریب ترین ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ کوئی مسلمان ملک جدید لڑاکا طیارے، آبدوزیں، بحری جہاز اور ٹینک تیار نہیں کرتا۔ کوئی مسلمان ملک خلاء میں مصنوعی سیارے نہیں چھوڑ سکتا۔ مسلمان دنیا کا کوئی ذرائع ابلاغ کا ایسا ادارہ نہیں ہے کہ جو مغرب کے پراپیگنڈے کا مقابلہ کر سکے۔ تمام مسلمان ملکوں کی دولت، یہودیوں کے مالیاتی نظام میں پھنسی ہوئی ہے، حتیٰ کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مسلمان کے حج اور عمرہ سے بھی یہودی اربوں ڈالر کا نفع کماتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ زوال گزشتہ تین صدیوں سے جاری ہے۔ ۱۵۶۰ء میں، یورپ میں پرنٹنگ پریس کا آغاز ہو چکا تھا، اور امت مسلمہ میں اگلے تین سو سال تک، یعنی ۱۸۴۰ء تک بھی کوئی پرنٹنگ پریس موجود ہی نہ تھا۔ مغلوں کی تقریباً تین سو سالہ تاریخ اٹھا کر ہی دیکھ لیجیئے، انہوں نے سائنس وٹیکنالوجی اور جدید علوم وفنون سے متعلق کوئی ایک ادارہ بھی نہیں بنایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہو رہی تھی، اور ہندوستان پر ایک ہزار سال حکومت کرنے کے باوجود، مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے پاس بحری فوج تک موجود نہ تھی۔ ٹیپوؒ کے والد سلطان حیدر علی نے اس بات پر بڑے دکھ کا اظہار کیا تھا، کہ وہ زمین پر تو انگریزوں سے لڑ سکتے ہیں، مگر انگریزوں کی سمندری طاقت کا ان کے پاس کوئی توڑ نہیں ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب یورپ میں احیائے علوم کی تحریک (Renaissance) کے بعد ایک صنعتی انقلاب آ چکا تھا اور مسلمان دنیا کا یہ حال تھا کہ تاریکی میں ہی ڈوبی ہوئی تھی۔ خلافت عثمانیہ اور مغلوں کا زوال ایک ہی دور میں جاری تھا۔ اقبالؒ نے تقریباً سو سال قبل، جواب شکوہ میں مسلمانوں کے اس المیے کا ذکر کیا تھا۔ سچ پوچھیں تو آج ایک صدی بعد بھی، مسلمانوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔

یورپ میں صنعتی انقلاب
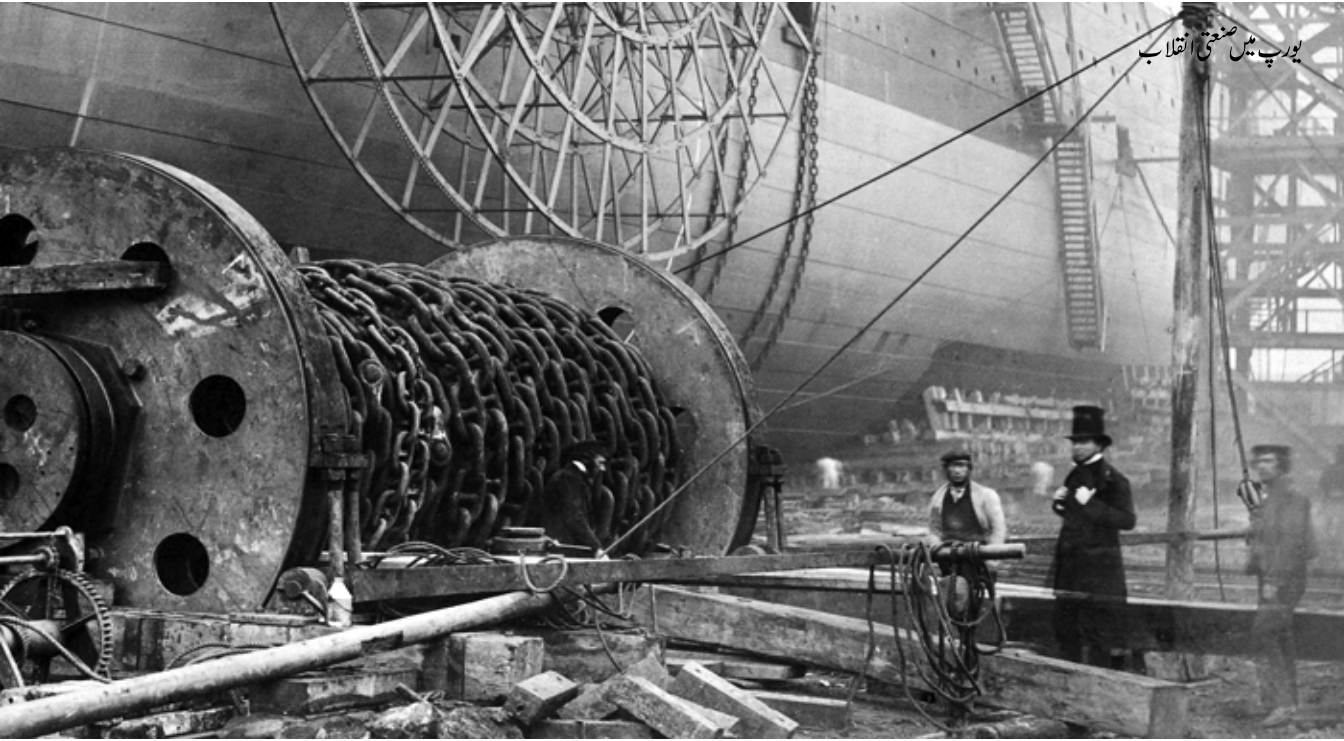
صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآں کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو؟

یہاں اقبالؒ، اللہ کی جانب سے جواب دیتے ہوئے، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرون اولیٰ میں یہ مسلمان تہذیب ہی تھی کہ جس نے مشرق اور مغرب میں فلسفہء توحید کو فروغ اور عروج دیا اور انسانیت کو مساوات، عدل، علم، تمدن اور تہذیب سکھائی۔ اقبالؒ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس شاندار عروج کے پیچھے ان کی وہ روحانی اساس تھی کہ جس کی بنیاد فلسفہء توحید اور قرآن پر رکھی ہوئی تھی، مگر آج کے مسلمانوں کی قرون اولیٰ کے مسلمانوں سے کوئی نسبت نظر نہیں آتی۔ وہ باکردار و باعمل انسان تھے، اور یہ بدکردار اور بےعمل۔ وہ خود تقدیر یزداں تھے، اور یہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظر فردا۔ اُن کی ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے ہوتے تھے، اور یہ مجبور و بےکس و محکوم کہ اِن کی قسمتوں کے فیصلے دشمنوں کے ایوانوں میں ہوتے ہیں۔

آگے جا کر اقبالؒ یہ بھی بتائیں گے کہ تقدیر کس طرح تبدیل ہوتی ہے، کس طرح لکھی جاتی ہے۔ یہ امت کیلئے ٹھہر کر غور کرنے کا مقام

عثمانی توپخانہ

ہے، اس بات سے قطع نظر کہ حالات کیسے بھی ہوں، آپ کو اپنے ماضی سے سیکھ کر، اپنے حال کو خود بنانا ہے، کہ جو بندۂ مومن کی خواہش کے مطابق، اس کے مستقبل کو ترتیب دے۔ اسی لیے معرفت کی زبان میں اللہ کے بندے کو ''صاحب حال'' کہتے ہیں۔ وہ ''حال'' میں رہتا ہے، اور اپنے رب سے ایک خاص تعلق کے باعث، مستقبل اپنی مرضی کا بناتا ہے۔

دقتیں کیا ہیں؟ کیوں مسلمان یہ سب کچھ نہیں کر سکے؟ اقبالؒ نے اسکا بھی ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی ﷺ، دین بھی ایک، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبالؒ یہاں پوری مسلمان امت کیلئے فرماتے ہیں کہ یہ ایک جسد واحد کی طرح ہے، کہ جس کا عروج وزوال، ترقی وکمال، منفعت و نقصان، ایک ہی ہے۔ آج کے دور میں مسلمان امت کی سیاسی، معاشی، عسکری، نظریاتی اور قومی تقسیم پر یہ ایک دل گداز مرثیہ ہے۔ آج مسلمان جس قدر تقسیم ہیں، چودہ سو سال کی مسلم تاریخ میں ایسا المیہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ پہلے امت ملکوں میں تقسیم ہوئی، پھر سیاسی، مذہبی، فرقہ وارانہ اور لسانی گروہوں میں تقسیم در تقسیم ہوگئی۔ خلافت کا مرکز ختم ہونے کے بعد، یہ امت مرحوم اب ایک امت یتیم بھی ہے۔
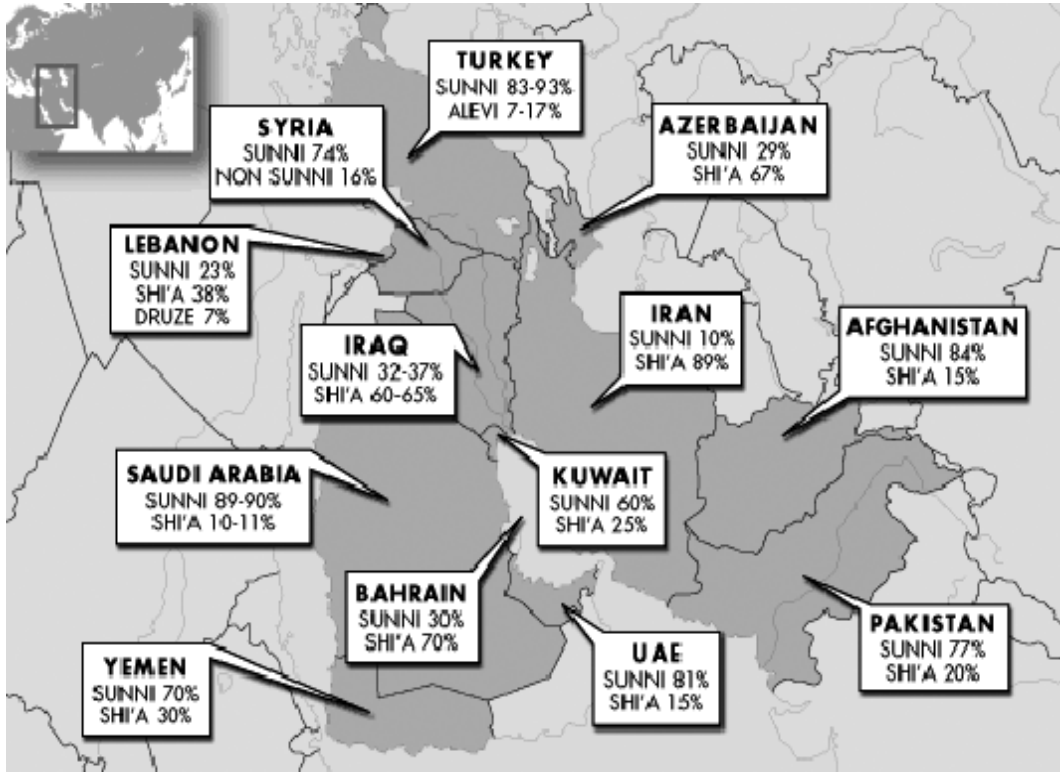
اقبالؒ سختی سے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اگر کسی مسلمان ملک یا جماعت نے اپنے آپکو امت رسول ﷺ سے علیحدہ کر کے عروج حاصل کرنے کی کوشش کی، تو اس کے نصیب میں صرف رسوائی ہوگی۔ اگر کوئی مسلمان ملک یہ سمجھے کہ دوسرے مسلمان ملک پر آنے والی تباہی سے اسکا کوئی تعلق نہیں، تو یہ ایک مہلک غلطی ہوگی۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ امت کا ایک عضو تکلیف میں ہو اور اس کا اثر باقی وجود تک نہ پہنچے۔ ایک مسلمان ملک کا دفاع، پوری امت کا دفاع ہے۔ ایک مسلمان ملک کی چوٹ، پوری امت مسلمہ کا زخم ہے۔

آج پاکستان میں بھی، ''سب سے پہلے پاکستان'' کا تصور یہ نہیں ہونا چاہیے کہ چاہے پوری مسلم امہ تباہ و برباد ہو جائے، ہم غیر جانبدار رہتے ہوئے، اپنے آپ کو بچائے رکھیں گے۔ اقبالؒ کے تصور کے مطابق، سب سے پہلے پاکستان کا مطلب تو یہ ہے، کہ پاکستان آگے بڑھ کر امت مسلمہ کی قیادت سنبھالے اور پوری مسلمان امت کو اپنے پروں تلے ایسے چھپا لے، کہ جیسے ماں اپنے بچوں کو سنبھالتی ہے۔ نظریے کے اعتبار سے ہم صرف مسلمان ہیں، اور شناخت کے اعتبار سے صرف پاکستانی۔ ہمیں مسلمان اور پاکستانی ہونے کے علاوہ، نہ تو کوئی نظریہ چاہیے، اور نہ ہی کوئی شناخت۔ اس کے علاوہ اگر کسی نے کوئی اور نظریہ اور شناخت، چاہے قومیت پر ہو، لسانیت پر، فرقہ واریت پر، یا سیاست پر، نافذ کرنے کی کوشش کی، تو وہ امت رسول ﷺ کی جڑیں کاٹنے کا مجرم ہوگا۔

حکیم الامت، مرض کی تشخیص یہ کرتے ہیں کہ پہلے نیت درست کرو، شریعت پر عمل کرو، صرف بیٹھ کر انتظار نہ کرو کہ کوئی آ کر ہماری قسمت تبدیل کرے گا، حالات کا جائزہ لو، اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو پہچانو۔ تم فرقوں میں بٹے ہوئے ہو، قومیتوں میں تقسیم ہو، عصبیتوں سے آلودہ ہو، لیکن اس بات کو سمجھو کہ تم امت مسلمہ کا جزو ہو، تمہارا نفع ونقصان ایک ہے، اس امت کا جینا، مرنا ایک ساتھ ہے۔

کون ہے تارک آئین رسول مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار
ہوگئی کس کی نگاہ طرز سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد ﷺ کا تمہیں پاس نہیں

یہاں بھی امت کی رسوائی اور زوال کا تجزیہ اور تشخیص ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ آج خود مسلمانوں نے شریعت کو ترک کر دیا ہے، اور قرآن وسنت ان کا آئین وقانون نہیں ہے۔ اس کا الزام کفار پر نہیں دیا جا سکتا، کہ خود مسلمانوں نے ہی شرع پیغمبری کو ترک کر دیا ہے۔ آج مسلمان شریعت نافذ کرنے پر اس لیے شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ انکے دل و دماغ پر مغربی تہذیب کے بت حاوی ہیں، اور اپنے دین وایمان، عزت وآبرو، غیرت و وقار کا سودا کرتے انہیں کوئی عار نہیں۔ مسلمان تہذیب، دیگر مادّی تہذیبوں کی طرح، دنیا پرست، مال پرست، اور اخلاقی اقدار سے خالی ہو چکی ہے۔

اگر آج پاکستان میں بھی دیکھا جائے، تو یہاں قانون سازی تو کی جاتی ہے کہ اس ملک میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائیگا، مگر منافقت کا یہ عالم ہے کہ ہر قانون یہاں قرآن وسنت کے خلاف نافذ ہے۔ یہاں پر سود اور رباء کو ختم کرنے کی باتیں تو کی جاتی ہیں، مگر نہ تو عدالتیں اس میں سنجیدہ ہیں، نہ ہی دانشور اس پر بات کرتے ہیں، اور نہ ہی سیاستدان اس پر قانون سازی۔ سب دل سے یہ چاہتے ہیں کہ یہ سود اور رباء کا نظام قائم رہے۔ سب دل سے یہ چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کو مذاق بنایا جائے، دولت کی تقسیم شریعت کے مطابق نہ ہو، وراثت تقسیم نہ کرنی پڑے، فحاشی اور برائی اسی طرح جاری رہے، نظام عدل شریعت کے بجائے انگریزوں کے قوانین پر ہی قائم ہو، نظام سیاست خلافت کے بجائے مغربی جمہوریت پر ہو۔

مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار

یہی بہانے تراشے جاتے ہیں کہ اگر ہم نے سود اور رباء کا معاشی نظام ختم کر دیا، تو ہم پر پابندیاں لگ جائیں گی، ہماری برآمدات ختم ہو جائیں گی، ہم بھوکے مر جائیں گے۔ اگر ہم اپنی عزت وغیرت کیلئے، فلسطین وکشمیر کے مسلمانوں کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو دنیا ہم پر اقتصادی پابندیاں لگا دے گی۔ تمام حکمران، دانشور، اور علماء خوف میں مبتلا ہیں، کہ اگر ہم نے شریعت وخلافت کا نظام قائم کیا، تو دنیا کیا کہے گی؟ یہ ایک عام جملہ ہے کہ جو آپ روزان بے غیرتوں اور بزدلوں سے سنتے ہیں، کہ جب انہیں عزت وغیرت ووقار کا راستہ اختیار کرنے کا کہا جاتا ہے۔

یہی مسلمان ہیں کہ جو مغربی تہذیب، کفر اور طاغوت کے نظام کو قبول کرنے کا درس دیتے ہیں۔ کوئی شرم اور لحاظ باقی نہیں رہ گیا، حکمرانوں سے لیکر تمام فیصلہ کرنے والوں اور دانشوروں تک، ڈھٹائی سے مغرب کی غلامی قبول کرتے ہیں، اور دینی حمیت کا جنازہ نکالتے ہیں۔ یہ بات اقبالؒ نے پوری امت سے مخاطب ہو کر کی ہے کہ ایک طرف تم عزت چاہتے ہو، مگر دوسری جانب پیغام رسول ﷺ کی توہین کرتے ہو، یہ ممکن نہیں!

جا کے مساجد میں صف آراء تو غریب
رحمت روزہ جو گوارا کرتے ہیں تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب
پردہ رکھتا ہے اگر تمہارا تو غریب
امراء ہیں نشہء دولت میں غافل ہم سے
زندہ ہے ملت بیضا غرباء کے دم سے

ہمارا معاشرہ خوفناک حدتک طبقات میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک طرف تو وہ حکمران اور مالدار طبقہ ہے کہ جو اشرافیہ کہلاتے ہیں، اور دوسری جانب غریب اور متوسط، کہ جو سفید پوش ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کے بچے انگریزی میڈیم سکولوں میں جاتے ہیں اور دوسرے وہ کہ جن کی اولادیں اردو میڈیم سکولوں یا مدرسوں میں جاتی ہیں۔ یہاں پر ایک بات نوٹ کیجیئے گا کہ ہم اپنے مدرسے کے طالبعلموں کو، مسجدوں کے اماموں کو، اس معاشرے میں عزت نہیں دیتے۔ معاشرے کا کمزور ترین طبقہ مدرسوں میں جاتا ہے اور پھر مسجد کا امام بن جاتا ہے۔ معاشرے کی اشرافیہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، لیکن لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ملک کی ہزاروں مسجدوں میں، پانچ وقت خود بخود اذان کیسے ہو جاتی ہے؟ چاہے برف پڑ رہی ہو یا بارش ہو رہی ہو، سردی کی شدت ہو یا لُو چل رہی ہو، کون صبح چار بجے اٹھ کر اذان دیتا ہے؟ اس فرض کی ادائیگی نہ حکمران کرتے ہیں، نہ صاحب ثروت، نہ عدالتوں کے جج، نہ دفاتر کے سرکاری افسر، اور نہ ہی دانشور۔ یاد رکھیئے اگر یہ غریب طبقہ، اگر یہ مساکین، کہ جن کی معاشرے میں توہین کی جاتی ہے، یہ خدمت بند کر دیں تو یہاں لوگ نہ روزے رکھ سکیں، نہ اذان ان کے کانوں تک پہنچے، نہ جنازہ پڑھایا جا سکے، نہ جمعے کی نماز ہو۔

اگر یہاں پر دین کی آبرو کچھ باقی ہے، تو مساکین اور غرباء کی وجہ سے۔ حکمران طبقہ، حکمرانی تو کرتا ہے مگر دین سے نابلد ہے۔ مساجد میں جا کر دیکھ لیجیئے کہ پانچ وقت کی نمازوں میں کون موجود ہوتا ہے؟ وہاں حکمران کتنے ہوتے ہیں؟ کروڑ پتی اور ارب پتی کتنے ہوتے ہیں؟ الا ماشاء اللہ، شاید ہی کوئی وہاں موجود ہو، کہ جس کو اللہ نے خاص توفیق عطا کی ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس دین کی عزت و آبرو مساکین نے ہی رکھی ہوئی ہے۔ مساکین نے ہی ہمارا پردہ رکھا ہوا ہے۔ زندہ ہے ملت بیضا غرباء کے دم سے۔ بڑی بڑی امیر کبیر محفلوں میں بھی نکاح پڑھانے کیلئے، نماز جنازہ کیلئے اسی مسجد کے امام کو لے کر آتے ہیں کہ جس کو معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہیں ہے۔ حکیم الامت یہاں بالکل واضح کر دیتے ہیں کہ جب تک طبقات کی یہ تقسیم باقی رہے گی، امت کا زوال قائم رہے گا۔ جب تک

حکمران اوراشرافیہ دین سے نابلد رہیں گے، نہ دین نافذ ہوگا، نہ امت کے عروج کا آغاز۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مکالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مگر ساتھ ہی ساتھ اقبالؒ وقت کے علماء پر تنقید بھی کرتے ہیں، کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ قوم تباہ ہوجائے اور علماء ٹھیک ہوں۔ خیانت ہمیشہ پہلے علماء سے ہی شروع ہوتی ہے۔ جب علماء کمزور ہوجائیں، سچ بات کہنے سے ڈرنے لگیں، جب انکا رزق مشکوک ہوجائے، جب علمائے سُو، علمائے حق سے زیادہ ہوجائیں، جب دین کو تجارت بنا لیا جائے، جب علماء حکمرانوں کے درباری بن جائیں، جب امت کے بجائے فرقوں کو ترجیح دی جائے، تو یہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ اس امت سے علم وحکمت اٹھالی گئی ہے، اور اس کے زوال کا آغاز ہوگیا ہے۔ مچھلی ہمیشہ سر کی جانب سے سڑنا شروع ہوتی ہے۔ پہلے زمانے کے علماء، بادشاہ وقت کے پاس جا کر بیٹھتے تک نہ تھے، بادشاہ کا رزق نہ کھاتے، اگر کوئی ان کے پاس تحفہ بھیجتا، تو پہلے سو دفعہ تحقیق کرتے کہ بھیجنے والے کا رزق حلال ہے یا حرام۔ اس کے بعد ان کے کلام میں ایسی تاثیر ہوتی کہ ظالم و جابر بادشاہ پر بھی سکتہ طاری ہوجاتا۔ ہر فتنے کے دور میں امت کو ایسے علمائے حق نے ہی سنبھالا ہے کہ جنہوں نے اپنے سر کٹوا لیے، اپنی کھالیں اتروالیں، زندان میں زندگیاں گزار دیں، مگر آبروئے امت رسول ﷺ پر آنچ نہ آنے دی۔

امام مالکؒ کو بادشاہ کے دربار میں کوڑے لگتے تھے، ایسے کوڑے کہ اگر ہاتھی کو بھی پڑتے تو وہ زندہ نہ رہتا، لیکن اس کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی، اور اپنے فتوے پر قائم رہے۔ انہیں جب بھی کوڑے پڑتے تو وہ ایک ڈاکو کو دعا دیتے۔ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ جب آپکو کوڑے پڑتے ہیں، تو آپ اس ڈاکو کو دعا کیوں دیتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ جب مجھے زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے دربار میں لایا جارہا تھا، تو سامنے سے وہ ڈاکو آرہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا کہ امام! میں ایک ڈاکو ہوں، اتنے کوڑے پڑنے کے باوجود بھی میں چوری سے باز نہیں آیا، آج دیکھتے ہیں کہ وقت کا امام کوڑے پڑنے پر اپنے فتوے کو بدلتا ہے یا نہیں۔ امام مالکؒ کا انہی کوڑوں کی ضربوں سے انتقال ہوگیا، مگر آپ نے باطل کے سامنے سر نہ جھکایا، اور پوری امت رسول ﷺ کو بچا گئے۔

امام ابوحنیفہؒ ایک مرتبہ بارش میں جارہے تھے تو کچھ بچے بارش میں کھیل رہے تھے۔ امامؒ نے ایک بچے سے کہا کہ بیٹا! دھیان کرنا، کہیں پھسل نہ جانا۔ وہ بچہ مڑ کر بولا کہ امام ہماری فکر نہ کریں، آپ نہ پھسلیئے گا، آپ پھسل گئے تو امت پھسل جائے گی! امام ابوحنیفہؒ پر یہ سن کر سکتہ طاری ہوگیا اور بعد میں فرماتے ہیں کہ یہ ایک غیبی آواز تھی کہ جس نے انکو حق پر قائم رہنے کی نصیحت کی۔

یہ وہ علماء تھے کہ جو امت کو سنبھال کے رکھتے تھے۔ جب امت کا زوال آیا تو ایسے علماء کو بھی اٹھالیا گیا، نیتجتاً امت فتنوں میں بٹ گئی، اور کوئی اسکو سنبھالنے والا نہ رہا۔ فلسفہ تو شاید رہ گیا، مگر غزالی کی تلقین اور اخلاص نہ رہا۔ جب انسان اپنی زبان سے وہ بات نکالتا ہے کہ جو اس کے دل میں نہ ہو، کہ جس پر وہ خود عمل نہ کرتا ہو، اس کے رزق میں حرام شامل ہو جائے، تو اسکا سب سے بڑا عذاب یہ ہوتا ہے کہ اس کی زبان سے برکت نکال لی جاتی ہے، اس کے بیان کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے، پھر چاہے وہ جتنی مرضی تقریریں کرے، نہ لوگوں کے دلوں پر اثر ہوتا ہے، نہ لوگوں کے قلب و نگاہ تبدیل ہوتے ہیں۔ بات بے اثر اور بے فیض ہو جاتی ہے۔ رسم اذاں رہ جاتی ہے، روح بلالی نکل جاتی ہے۔

....

جواب شکوہ ایک بہت گہری دستاویز ہے اور اس پر تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبالؒ معاشرے کے ایک ایک طبقے کا تجزیہ کرتے ہیں، اور حل بھی بتاتے ہیں۔ پہلے انہوں نے مجموعی طور پر امت کا تجزیہ کیا کہ تم لوگ ذاتوں اور قوموں میں تقسیم ہو چکے ہو، ہاتھ پہ ہاتھ رکھے منتظر فردا ہو، شریعت پر عمل نہیں کرتے، فرقوں میں تقسیم ہو۔ اس کے بعد تمہارا حال یہ ہے کہ تمہارے حکمران اور امراء اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے احکامات کا کوئی پاس نہیں رکھتے، اپنی دولت غرباء میں تقسیم نہیں کرتے، تم نے دین اور شریعت کو ترک کر دیا ہے۔ مساکین ہی ہیں کہ جو دین کی لاج رکھے ہوئے ہیں، لیکن اس کے بعد مساجد میں علماء اور خطیبوں کا حال یہ ہے کہ:

تکبر زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگان خدا پہ زباں دراز کرے

ایک فقیر، ایک عالم، ایک درویش میں وہ نور کہاں سے آتا ہے کہ اسکی زبان میں تاثیر پیدا ہو؟ جب تک مؤذن کی زبان میں وہ تاثیر نہ ہو، اسکی اذان بے برکت ہی رہتی ہے۔ جب کوئی شخص تقریروں پہ تقریریں کر رہا ہو، لیکن وہ لوگوں کے دلوں پر اثر نہ کر رہی ہوں، تو اس کو چاہیے کہ غور کرے کہ خرابی کہاں ہے؟ کیا میرا رزق حرام تو نہیں، کیا میری نیت میں کھوٹ تو نہیں، کیا مجھے اللہ کی طرف سے اس بات کی اجازت بھی ہے کہ نہیں؟ آج ہمارے ہاں جو فتنے پھیل رہے ہیں، چاہے وہ سیاست میں ہوں یا مذہب میں، وہ اس وجہ سے ہیں کہ نا اہل اور منافق لوگ وہ کام کرنا چاہ رہے ہیں، کہ جس کی ان کو اللہ کی طرف سے اجازت نہیں۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

جس طرح زبان سے تاثیر نکل جائے، تو الفاظ اثر نہیں کرتے، اسی طرح اقبالؒ کہتے ہیں کہ مسجدوں میں نمازی تو موجود ہیں، مگر انکے وجود تزکیہ و روحانیت سے عاری ہیں، یعنی ایسے اللہ کے بندے کہ جو حجازی صفات رکھتے ہوں، ناپید ہو چکے ہیں۔ لاکھوں مسلمان ہر سال

حج اور عمرے کرتے ہیں، لیکن امت زوال میں دھنستی چلی جارہی ہے، مسلمانوں کی دعائیں قبول نہیں ہورہیں۔

مسلمانوں کی حالت کیوں نہیں بدلتی؟ کیوں اللہ کہتا ہے کہ ایک آدمی میرے پاس حج کرنے کیلئے آتا ہے، خانہ کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر دعائیں کرتا ہے، تکلیف اٹھا کر آتا ہے، لیکن میں اس کی دعا قبول نہیں کرتا، کیونکہ اس کا پورا وجود حرام میں پلا ہوتا ہے، رباء کے پیسے سے، رشوت کے پیسے سے، کسی کا مال ہڑپ کرکے، وہ عمرہ کرنے آتا ہے، میں کیسے اس کی دعائیں قبول کروں؟ دعائیں قبول ہونے کی پہلی شرط ہی رزق حلال ہے۔

شور ہے کہ دنیا سے ہوگئے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو سہی مسلمان بھی ہو؟

آج یہ کہا جارہا ہے کہ دنیا میں مسلمان تباہ ہورہے ہیں۔ اقبالؒ کے دور میں بھی یہی المیہ تھا۔ اقبالؒ یہاں ایک انتہائی تکلیف دہ حقیقت کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ جب کوئی قوم ہدایت کے قابل ہی نہیں رہتی، توبہ ہی نہیں کرتی، نصیحت ہی قبول نہیں کرتی، تو پھر قدرت ایسی قوموں کو ہلاک کرکے دوسری قوموں سے تبدیل کردیتی ہے، چاہے وہ ہلاک ہونے والی بدنصیب قوم مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ہورہا ہے، وہ قدرت کے اسی قاعدے کے تحت ہے۔ مسلمانوں کا حال دیکھ لیجیئے۔ ایک طرف امت تباہ ہورہی ہے، مگر دوسری جانب نہ توبہ کررہی ہے، نہ شریعت کی طرف لوٹتی ہے۔ ان کے حکمرانوں اور اشرافیہ، حتیٰ کہ عوام الناس کا بھی، یہ عالم ہے کہ ان کی عیاشیاں، فضول خرچیاں اور بدکاریاں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ ظاہر میں یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ یہ مسلمان ہیں یا یہود ونصاریٰ۔ وضع میں تم ہو نصاریٰ، تمدن میں ہنود۔

آج پاکستان میں بھی ہمارا سارا معاشرہ بھارتی مشرک تہذیب سے متاثر ہے۔ ہندو تہذیب وتمدن اس ملک پر اس طرح مسلط ہورہا ہے کہ ایک طرف تو ہندوستان پاکستان کے خلاف مسلح کارروائیوں سے باز نہیں آتا، تو دوسری جانب ان کی فحش فلمیں وڈرامے ہماری نوجوان نسل کے دل ودماغ پر مسلط کیے جارہے ہیں۔ ہمارے گھرانوں میں، ہمارے بچے وہی زبان استعمال کرنے لگے ہیں کہ جو ہندی فلموں میں ہوتی ہے۔ اگر کیبل ٹی وی والے ہندوستانی ڈرامے اور فلمیں بند نہیں کرتے، تو کیا اس قوم کو بھی شرم وحیاء نہیں ہے کہ خود دیکھنا چھوڑ دے؟ وضع میں نصاریٰ، ظاہراً ہماری ساری تہذیب مغرب سے آرہی ہے، اور تمدن میں ہنود، کہ جو بھارت سے درآمد کیا

خائن حکمرانوں کے ہاتھوں، امت مرحوم کی بے بسی کی ایک تصویر

جا رہا ہے، اور یہ سارا معاملہ اس وقت ہو رہا ہے، کہ جب دشمن ہمیں تباہ کرنے کیلئے جنگی تیاریاں کر رہا ہے۔ اللہ کو کیا پڑی ہے کہ ایسی قوم کو بچائے؟

مسلمان تو اپنے کردار کی وجہ سے مشہور تھے، اور یہ ہیں کہ جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عزت تو مانگتے ہیں، مگر لباس، کردار و تمدن وہ اختیار کیا ہوا ہے کہ جو مغضوب علیہ یہودیوں کا ہے۔ مسلمان باہم دست و گریباں بھی ہیں، خونریزی بھی جاری ہے، فرقوں اور قومیتوں میں بھی تقسیم ہیں، اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ بھی نہیں کرتے، غرضیکہ وہ تمام گناہ کہ جن کی وجہ سے قومِ یہود کو اللہ نے تباہ کیا تھا، آج ہم مسلمانوں میں موجود ہیں اور پھر بھی یہ تکبر کہ ہم جنتی ہیں۔

آپ سعودی عرب چلے جائیں، امت مسلمہ کا امیر ترین ملک ہے اور وہاں دیکھیئے کہ غریب مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ مسجد نبوی میں آپکو ایسے لوگ بھی ملیں گے کہ جنہیں دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں، جبکہ حکمران قارون جیسی دولت کے مالک ہیں۔ تقریباً تمام مسلمان ممالک کا یہی حال ہے۔

مسلمانوں کو اپنا احتساب خود کرنا ہے۔ ''جواب شکوہ'' میں اللہ کی جانب سے علامہ اقبالؒ جو پیغام ہمیں دے رہے ہیں، اس امت کی بیداری کا آغاز، اسی تجزیے سے ہوگا، اسی تشخیص سے ہوگا۔ اس کے بعد ہم بتائیں گے کہ بندۂ مومن کیسے بنتا ہے، اور یہ کہ امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیونکر ہوگا۔

۱۰

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

''جوابِ شکوہ'' کے حوالے سے اب ہم وہاں آ چکے ہیں، کہ جہاں اقبالؒ مسلمان قوم کی تربیت کی بات کرتے ہیں۔ ''جوابِ شکوہ'' ان کا ایک مسحور کن کلام ہے، اللہ سبحان وتعالیٰ اور آج کی زوال پذیر امت کے درمیان ایک مکالمہ۔ اقبالؒ نے یہ مکالمہ کس طرح ترتیب دیا ہے، ہم اس پر بات کر چکے ہیں، پہلے نیت کی صفائی، قبلے کی درستی، مقصدِ حیات کی تکمیل اور پھر بلند مقاصد کی طرف سفر کا آغاز۔ علامہؒ نے نیت اور شریعت سے آغاز کر کے، امت کو درپیش مسائل کا تجزیہ کیا۔

گزشتہ باب میں ہم نے بات یہاں ختم کی تھی، کہ اقبالؒ آج کے جدید دور کے مسائل اور ان کا حل، سو سال پہلے ہی ان اشعار میں بتا گئے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھیں تو یوں لگتا ہے، کہ گویا یہ آج لکھے گئے ہوں۔ اسی جوابِ شکوہ میں، کہ جہاں اقبالؒ امت کے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں، وہیں مردِ مومن کی تربیت کے تمام تر مراحل بھی بیان کرتے ہیں۔

اقبالؒ جب ہمارے ماضی کی، ہمارے بزرگوں اور آباؤ اجداد کی بات کرتے ہیں، اور اپنے دور کے مسلمانوں پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو انہیں ایک بحران نظر آتا ہے، قحط الرجال نظر آتا ہے۔ کوئی اللہ کا سچا بندہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ آج ہمارے بچے سوال کرتے ہیں کہ کیا کوئی صلاح الدین ایوبیؒ، سلطان فاتحؒ، محمود غزنویؒ، ٹیپو سلطانؒ یا قائد اعظمؒ جیسا لیڈر رہے کہ جو ہماری قیادت کر سکے! ہم تلاش کرتے پھرتے ہیں کہ کوئی دانشور ملے، کہ جو امت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر سچی اور سُچی بات کر سکے! کوئی ایسا عالم، کہ جو احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ کے مقام پر کھڑا ہو کر حق اور صداقت کی اذان دے!

واللہ، قحط الرجال کا دور ہے! اللہ کے بندے معاشی قحط سے نہیں گھبراتے، وہ اس بات سے نہیں پریشان ہوتے کہ ملک غریب ہے یا نہیں، وہ اس بات سے گھبراتے ہیں کہ کہیں اللہ کے سچے بندے نہ ختم ہوجائیں۔ اسی کو قحط الرجال کہتے ہیں۔ جس قوم پر قحط الرجال کا عذاب نازل کردیا جائے، تو یہ اس کے زوال کی، اور اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو بڑی سخت مار پڑنے والی ہے۔ پھر بھی اگر وہ قوم بیدار نہ ہو، تو پھر اس کو کسی دوسری قوم سے تبدیل کردیا جاتا ہے۔ یہی اللہ کی سنت ہے، یہی قرآن کا بیان ہے، یہی انسانی تاریخ کا خلاصہ ہے، اور یہی ساری جہتیں اقبالؒ نے جواب شکوہ میں بھی بیان کی ہیں۔

اسی طرح اللہ جب کسی قوم کو عزت دینا چاہتا ہے، تو اس میں ایسے شیر اور دلیر پیدا کرتا ہے کہ جو تاریخ ساز بھی ہوتے ہیں اور تقدیر ساز بھی، خودی کے ترجماں بھی ہوتے ہیں، اور خدا کے راز دار بھی۔ ایسے ہی پراسرار بندوں کو اقبالؒ مردِ مومن یا شاہین کہتے ہیں۔ اقبالؒ کا مردِ مومن اتنا حیرت انگیز وجود ہے کہ اکثر دانشور تو یہ کہنے پر بھی مجبور ہوگئے کہ شاید یہ صرف ایک تخیلاتی وجود ہے، اور حقیقی دنیا میں اس کا ظہور ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ سے لیکر آج تک، جب بھی مسلمانوں نے تاریخ و تقدیر تبدیل کی ہے، اقبالؒ کے شاہین موجود رہے ہیں، اور مستقبل میں بھی، جب بھی مسلمانوں کے عروج کی بات کی جائے گی، تو سب سے پہلے ایسے ہی شاہینوں کی تربیت لازم قرار پائے گی۔

دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک
عدل اس کا تھا قوی، لوثِ مراعات سے پاک
شجرِ فطرتِ مسلم تھا حیاء سے نمناک
تھا شجاعت میں وہ اک ہستیِ فوق الادراک

یہاں اقبالؒ نے بندۂ مومن کی، ہمارے بزرگوں کی، چار غیر معمولی خصوصیات بتائی ہیں۔ دمِ تقریر تھی مسلم کی صداقت بے باک۔ جب مسلمان بات کرتا تھا، تو یہ حق اور صداقت کی ایسی اذان ہوتی تھی، کہ جس سے شبستان وجود لرزتا تھا۔ صداقت و جرأت کا ایسا پیکر کہ جو اس بات کی بھی پرواہ نہ کرے کہ آگے وقت کا فرعون ہے، قیصر ہے، کسریٰ ہے یا نمرود۔ یہ مومنین کا جمال اور جلال تھا کہ جب وہ بات کرتے، تو اس جرأت اور دلیری سے کہ بڑے بڑے ظالم و جابر بادشاہ بھی سکتے میں آجاتے۔ یہی مومن کی شان ہے۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔ مسلمان چاہے علماء ہوں، مفکرین ہوں یا مجاہدین، ظلم کے سامنے سینہ تان کر اذانِ حق دینا ہی ہماری میراث ہے۔

ہزار خوف ہوں لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

بندۂ مومن کیلئے اس بات پر سمجھوتہ کرنا ممکن نہیں ہے کہ سچ بولا جائے یا مصلحتوں کا شکار ہوکر دوغلی بات کی جائے۔ جیسے مسلمان جب بات کرتے تھے، تو ان کی تقریر صداقت کی معراج ہوا کرتی تھی، اسی طرح انکے عدل میں بھی کسی بھی قسم کے سمجھوتے یا سفارش کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مثال دیکھیئے، حضرت علیؓ کی ایک زرہ چوری ہوجاتی ہے، کہ جو بعد میں ایک یہودی کے پاس سے برآمد ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ اس کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ خلیفۃ الوقت تھے، دو سپاہی بھیج کر بھی اپنی زرہ منگوا سکتے تھے، لیکن نہیں! آپؓ عدالت جاتے ہیں۔ یہودی کو بلایا جاتا ہے۔ قاضی، خلیفہ سے کہتا ہے کہ اپنی گواہی پیش کیجیئے۔ وہ گواہی میں اپنے بیٹے سیدنا حسنؓ اور اپنے غلام کو پیش کرتے ہیں۔ قاضی کہتا ہے کہ آپ امیر المومنین ہیں، لیکن بیٹے اور غلام کی گواہی قبول نہیں کی جاسکتی، آپ کے پاس کوئی گواہی نہیں ہے اور پھر زرہ یہودی کو دے دی جاتی ہے۔ یہودی خود ہکا بکا رہ جاتا ہے، کہ یہ کونسی مملکت ہے کہ جس میں انصاف کا یہ عالم ہے کہ قاضی، خلیفہء وقت کے خلاف فیصلہ دیتا ہے! یہودی یہ دیکھ کر ہی مسلمان ہوجاتا ہے۔

سیدنا عمرؓ کا عدل دیکھیئے۔ یہ وہ عمرؓ ہیں کہ جن کے خوف سے شیطان بھی راستہ بدل لیتا تھا۔ جب پورے مدینہ کے مسلمانوں میں ایک ایک چادر تقسیم ہوتی ہے، تو آپؓ کو بھی ایک ہی چادر ملتی ہے۔ دوسری چادر آپکو، آپکے بیٹے اپنے حصے میں سے دے دیتے ہیں۔ عدل واحتساب کا عالم دیکھیئے، کہ عمرؓ کے جلال کے باوجود، ایک بڑھیا مجمعے میں کھڑے ہوکر ان سے سوال کرلیتی ہے کہ آپؓ کے وجود پر یہ دو چادریں کہاں سے آئیں، اور امیر وقت کو وضاحت دینی پڑتی ہے۔ یہ تھا مسلمانوں کا عدل کہ جو لوث مراعات سے پاک تھا۔ کسی بھی قسم کی سفارش، رشوت یا ناجائز رعایت دینے کا تصور ہی ناممکن تھا۔ جب بڑے اپنے آپکو احتساب کیلئے اس سختی سے پیش کرتے ہوں، جب قاضی انصاف کے لیے خلیفہء وقت کو بھی رعایت نہ دیں، تو پھر ممکن نہیں ہے کہ سلطنت میں کسی ایک فرد، حتیٰ کہ غیر مسلموں اور جانوروں کے ساتھ بھی کوئی ظلم کرسکے۔

شجر فطرت مسلم تھا حیاء سے نمناک

یہ بہت غیر معمولی بات ہے۔ حیاء ایمان کا جزو ہے۔ شرم وحیاء، خودداری، غیرت، یعنی یہ کہ انسان کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے، اپنی عزت نفس کو رسوا نہ کرے، چاہے بھوکا مر رہا ہو، مگر کسی سے سوال نہ کرے، اور پھر بھی عطا کرنے والا ہو، یہ مومن کی حیاء ہوتی ہے۔

امام مالکؒ مدینے کے بہت بڑے امام تھے۔ امت مسلمہ کے بڑے اماموں میں آپکا شمار ہوتا ہے۔ آپکے جلال کا یہ عالم تھا کہ خلیفہء وقت بھی آپؒ کے سامنے کانپتا تھا۔ کسی کی جرأت نہیں تھی کہ امام کے سامنے سفارش کرسکے۔ خود امام مالکؒ کا حال یہ تھا، کہ گھر میں تین تین دن فاقے ہوتے تھے، چھوٹی بچی معصومیت سے باپ کی طرف دیکھتی کہ شاید کچھ کھانے کو مل جائے۔ امام فاقے میں ہی مسجد نبوی میں آکر اپنی کتاب موطا امام مالک کا درس دیا کرتے، کہ جو آپکا احادیث کا مجموعہ ہے۔ کسی کو آپؒ کے چہرے سے یہ پتہ تک نہ لگتا کہ آپ تین دن کے فاقے سے ہیں۔ سفید پوشی اور حیاء کا یہ عالم تھا کہ کسی سے بھی کہنا گوارا نہ کرتے کہ مجھے ایک وقت کا کھانا کھلا دو۔ نوبت

یہاں تک آ گئی کہ گھر کی چھت کے شہتیر (لکڑی) اور کتابیں بھی بک گئیں، مگر کسی سے سوال نہ کیا، اس بات کے باوجود کہ خلیفہء وقت بھی آپ کے دربار میں ادب سے بیٹھا کرتا۔ یہ ہوتے ہیں وہ عالم دین کہ جو اپنے کاندھوں پر، پوری امت کا بوجھ اٹھا لیتے ہیں، اور رہتی دنیا تک ان کا فیض جاری رہتا ہے۔ آج چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی امت کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے، ان میں ایسے ہی علماء، فقراء، مجاہدین اور شاہینوں کا خون شامل ہے۔

آج پوری دنیا میں ہمیں طعنے دیئے جاتے ہیں، کہ ہمارے حکمران کشکول لیے پھرتے ہیں، بھیک مانگنے کیلئے۔ جب ملک کے سربراہان کا حال یہ ہے کہ ہر کام قرض لیکر اور بھیک مانگ کر کرتے ہیں، تو پھر باقی قوم کا کیا حال ہوگا؟ مسلمان کی پہچان اسکی غیرت تھی۔ وہ بھوکا مرنا پسند کرتا تھا، لیکن بھیک مانگنا نہیں۔ یہ ہماری میراث تھی کہ جواب کہیں گم ہوگئی۔ یہ تصور ہی ناممکن تھا کہ مسلمان رزق حرام کمائے، رشوت لے یا سود کھائے۔ آج پورے معاشرے میں حرام اور حلال ایسا خلط ملط ہوگیا ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس کا رزق حلال ہے اور کس کا حرام۔

تھا شجاعت میں وہ ایک ہستی فوق الادراک

جرأت اور دلیری میں بندۂ مومن، ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ گویا جنات میں سے ہوں۔ وہ اس دنیا کے انسان ہی نہیں لگتے تھے۔ جنگ یرموک کا وہ واقعہ یاد کیجیئے، کہ جب سیدنا خالد بن ولیدؓ نے ایک منصوبہ بنایا، ساٹھ ہزار رومیوں پر تیس مجاہدین کے ساتھ حملہ کرنے کا۔ اس وقت جو حربی شوریٰ بیٹھی تھی، کہ جس میں بڑے بڑے صحابہؓ، کہ جن میں حضرت ضرارؓ، حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور خود حضرت خالد بن ولیدؓ شامل تھے، نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو مشورہ دیا کہ آپکا منصوبہ ٹھیک نہیں ہے، تیس آدمیوں سے ساٹھ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ خالدؓ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، آپ بہتر منصوبہ بتا دیجیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ تیس کے بجائے، ساٹھ آدمی لے جایئے! آپ یقین کریں گے کہ ساٹھ آدمی لے جانے کا مشورہ دیا جارہا ہے، ساٹھ ہزار سے مقابلے کیلئے! اور پھر تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ سیدنا خالدؓ ساٹھ مجاہدین کے ساتھ، ساٹھ ہزار کے لشکر پر حملہ آور ہوتے ہیں اور انہیں پسپا بھی کر دیتے ہیں۔

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

مسلمانوں کی جنگی مہموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیئے، کہ جس پر اقبالؒ کا مندرجہ بالا شعر ہے، انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ چاہے وقت کی عالمی طاقتوں کے خلاف صحرا کی مہم ہو، یا بپھرے ہوئے دریاؤں میں فوجیں اتارنے کی، یا وسیع وعریض سمندروں کے پار کشتیاں جلانے کی، یا خشکی پر سے بحری جہاز گزارنے کی، تاریخ کے ہر موقع پر مسلمانوں نے جرأت و بہادری کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں، کہ انسانی تاریخ میں ان کی مثال ناممکن ہے۔

ہر مسلمان رگ باطل کیلئے نشتر تھا
اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوت بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر ، اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

ہر مسلمان رگ باطل کیلئے نشتر تھا۔ایک ایک مسلمان اپنی ذات میں ایک پورا ادارہ ہوا کرتا تھا۔ایک مرتبہ عراق میں مسلمان فوجوں کو کمک کی ضرورت پڑی،تو مدینہ درخواست بھیجی گئی کہ ہمیں مزید فوج بھیجی جائے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مجاہد،حضرت قعقاعؓ کو بھیج دیا،اور فرمایا کہ یہ ایک مجاہد ہی فوجوں پر بھاری ہے۔بعد میں حضرت قعقاعؓ کی عسکری حکمت عملی اور جنگی چالوں نے ثابت کر دیا، کہ دشمن کی فوجوں کو تگنی کا ناچ نچانے کیلئے وہ اکیلے ہی کافی تھے۔ہر مسلمان دشمن کیلئے ایک کاری نشتر تھا۔اس کے آئینہ ہستی میں عمل کا جوہر تھا۔مسلمانوں کا کمال ہی یہ تھا کہ وہ اپنے عمل سے اپنی زندگی اور تقدیر خود بناتے تھے۔ایسے باعمل کہ کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا نہ ہوں،اس بات کا انتظار نہ کرتے،کہ شاید کل کوئی آ کر انکی تقدیر بدل دے،خود اپنی تقدیر بدلتے،خود ہی تقدیر ساز ہوتے،خود ہی کارساز۔اتنا بھروسہ تھا انہیں،اپنے قوت بازو پر!

وہ آج کے مسلمانوں کی طرح،بے عمل،خوف میں مبتلا،امریکہ،اسرائیل یا اقوام متحدہ پر بھروسہ کرنے والے نہ تھے۔حجاج بن یوسف، کہ جو تاریخ میں ایک ظالم آدمی تصور کیا جاتا ہے،اسکا بھی کردار یہ تھا کہ جب ایک مسلمان عورت نے اسے ہندوستان کے راجہ داہر کی جیل سے پکارا،تو اس نے غیرت میں آ کر فوراً لبیک کہا اور اپنی فوجیں ہندوستان روانہ کر دیں اور پورا سندھ فتح کر لیا۔آج فلسطین اور کشمیر میں مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو رہا،لیکن پوری امت مسلمہ کے تمام بے غیرت حکمران،کہ جن کے نام تاریخ میں فرعون اور ہامان کے ساتھ لکھے جائیں گے،خاموشی سے بیٹھ کر امت کے قتل عام کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔

اقبالؒ نے یہ بات سو سال پہلے لکھی ہے۔اسوقت بھی حکمران ایسے ہی تھے،اور دین کی عزت اور آبرو بیچ رہے تھے۔آج بھی حکمران ویسے ہی ہیں۔اس امت کا المیہ ابھی تک یہی ہے،گو کہ اب اس کے اندر،اللہ کے فضل سے شعور بیدار ہو رہا ہے،لیکن قوموں کے عروج و زوال راتوں رات نہیں ہوتے۔اس میں وقت لگتا ہے۔اس کے لیے کچھ خصوصیات چاہیے ہوتی ہیں۔ہم سے پہلے والوں کو اللہ کا ڈر تھا،اور ہمیں موت کا ڈر ہے۔

اقبالؒ یہاں واضح کرتے ہیں، کہ اگر آج کی نسلوں کو وہ مقام، وہ عزت، وہ عروج چاہیے کہ جو قرون اولیٰ کے لوگوں کو حاصل تھا، تو پھر آج کی نسلوں کو بھی تزکیہ وتربیت کے انہی مراحل سے گزرنا ہوگا، عزت وغیرت کا وہی درس پڑھنا ہوگا، جرأت وشجاعت کی وہی مثالیں قائم کرنا ہونگی۔ بیٹے کو اگر باپ کا علم ازبر نہ ہو، تو وہ باپ کی میراث کا اہل نہیں ہوسکتا۔ وہ شاندار عروج، انسانیت کی قیادت، علم و حکمت کا فروغ، صرف انہی کے نصیب میں ہے کہ جو خود آگاہ بھی ہوں اور خدا مست بھی، وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل بھی دیں اور جن کی اذان سے شبستان وجود بھی لرزے۔

کیا آج کے دور میں، ہم اپنے کردار سے، اپنے آباؤاجداد کی مثالیں پیش کرسکتے ہیں؟ اگر آپکو اختیار دیا جائے، آپ کو کسی جگہ وزیر لگا دیا جائے، آپکو کسی دفاعی پراجیکٹ کا انچارج بنایا جائے یا آپکو کسی تعمیراتی ٹھیکے کا منیجر بنایا جائے، اور آپکو کروڑوں روپے رشوت کی پیشکش کی جائے، تو کیا آپ اپنے اندر اس قدر جرأت کردار رکھتے ہیں کہ اس حرام کمائی کو جوتے کی ٹھوکر پر رد کردیں، کہ میں مسلمانوں کے مال میں خیانت نہیں کرونگا؟ تو یہ ہوتی ہے حیاء، یہ ہے غیرت، یہ ہے وقار!

ہم جو صادق اور امین نبی ﷺ کے ماننے والے ہیں، آج کیوں ہمارے دشمن ہمیں یہ طعنہ دیتے ہیں کہ پاکستانی چند ڈالروں کی خاطر اپنی ماں بھی بیچ ڈالتے ہیں؟ ہمارے باپ دادا کو تو کبھی کسی نے ایسے طعنے دینے کی جرأت نہیں کی۔ ہمارے حکمران ہی صرف کیوں ہماری قومی و دینی غیرت کا جنازہ نکالتے ہیں؟ اقبالؒ اسکی وجہ بھی بتاتے ہیں:

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ انداز مسلمانی ہے!

حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کی ہلاکت دو وجوہات کی بناء پر ہوگی، حب الدنیا، کراہیت الموت۔ یعنی دنیا سے محبت اور موت کا خوف۔ آج پوری مسلمان امت انہی دو فتنوں میں ڈوبی ہوئی ہے، کیا حکمران اور کیا عوام الناس! حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ جس کا مفہوم ہے کہ، زیادہ جاگیریں اور جائیدادیں نہ بناؤ، ورنہ تم دنیا ہی کے ہوکر رہ جاؤ گے۔ آج پاکستانی معاشرے میں آپکو ان فتنوں کی واضح مثالیں ہر طرف بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ نہ حرام کی پرواہ ہے نہ حلال کی۔ ہر کوئی دنیاوی آسائشوں، پلاٹوں، جائیدادوں، مال و دولت، جاہ ومنصب کے پیچھے دنیا وآخرت تباہ کررہا ہے۔ کیا یہی انداز مسلمانی ہے! تو پھر کیوں اللہ ایسی قوم کو ہلاک نہ کردے، اور اسکی جگہ ایسی قوم لے آئے کہ جو اللہ سے پیار کرتے ہوں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہو!

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

اس ایک شعر میں اقبالؒ نے ،صدیوں میں بیتنے والی ،قوموں کے عروج وزوال کی داستان کوسمیٹ دیا ہے۔انسانیت کی تاریخ گواہ ہے کہ نئی تہذیبوں کا آغاز ان کے شہداء کے خون سے ہوتا ہے، کہ جو اپنی تلواروں کی نوک سے اپنی تقدیر لکھتے ہیں۔اور انہی تہذیبوں کا زوال اس وقت ہوتا ہے، کہ جب آنے والی نسلیں،اپنے آباؤ اجداد کی روایتوں کوترک کر کے،عیاشیوں، بدکاریوں اورتن آسانیوں میں پڑ جاتی ہیں۔ بابر جب ہندوستان میں داخل ہوتا ہے،تو برف کے طوفانوں میں کھلے آسمان تلے،شب بسر کرتا ہے،اور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر میدان جنگ میں اترتا ہے۔تین صدیوں بعد مغل شہزادوں کا حال یہ ہو چکا تھا، کہ ہیجڑوں کی فوج بناتے ہیں اور خود پالکیوں میں بیٹھ کر میدان جنگ میں جاتے ہیں،اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ جوتی بھی خود پہن سکیں، کجا یہ کہ تلوار چلائیں۔اب تقدیر کا یہ راز سمجھ آتا ہے کہ کیوں اللہ نے مغلیہ سلطنت کو نیست و نابود کر دیا۔

حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے

تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

قوموں کے عروج کیلیئے یہ لازم ہوتا ہے کہ اس کے پاس روحانی اور اخلاقی اساس بھی ہو،اور ساتھ ہی حلال معیشت کے ذرائع بھی، کہ جو ایک معاشرے کو مستحکم کرتے ہیں۔قرون اولیٰ میں، ہمارے بزرگوں نے وہ شاندار مثالیں قائم کر کے دکھائی ہیں کہ جن میں مضبوط روحانی اقدار کے ساتھ، امور سلطنت کو بھی چلا کر دکھایا گیا۔حکمران، وقت کے فقراء بھی تھے،اور اغنیاء بھی،اردشیر بھی تھے،اور جنیدی

بھی، حیدر کرارؓ بھی تھے، اور عثمان غنیؓ بھی۔ آج اس امت کے پاس نہ تو روحانی اساس موجود ہے اور نہ ہی معاشی۔ نہ تو زورِ حیدرؓ ہے، نہ فقر بوذرؓ، نہ صدق سلمانیؓ، نہ دولت عثمانیؓ۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

یہ شعر اس اعتراض کا جواب ہے کہ جو آج جدید دور کے مغرب زدہ دانشور اسلام پر اٹھاتے ہیں، کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ شریعت کے نفاذ میں ہی امت کی خیر ہے، تو وہ سوال کرتے ہیں کہ آج اکیسویں صدی میں، چودہ سو سال پرانے قوانین کیسے نافذ کیے جاسکتے ہیں؟ مسلمانوں کو اگر ترقی کرنا ہے تو ان کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق، لادین اور سیکولر ہونا پڑے گا، ریاست کو دین سے جدا کرنا پڑے گا، معیشت کو سود اور رباء پر قائم کرنا ہوگا، اور سیاست کو مادر پدر آزاد جمہوریت پر۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا میں عظیم ترین سلطنتیں اس وقت قائم کیں کہ جب وہ اپنے دین، قرآن اور سنت سے قریب تر تھے۔ جب مسلمانوں نے اپنی روحانی اور دینی اساس کو ترک کر دیا اور لادین اخلاق باختہ تہذیب کو اختیار کیا، تبھی سے ان کا زوال شروع ہوا۔ مسلمانوں کا زوال قرآن نافذ کرنے سے نہیں، قرآن ترک کرنے سے ہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب پورا یورپ اور صلیبی حکمران، مسلمانوں کی دہشت سے کانپا کرتے تھے، اور کیفیت یہ تھی کہ یورپ میں مائیں کئی سو سال تک اپنے بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی رہیں کہ صلاح الدین ایوبیؒ آجائیگا۔ خلافت عثمانیہ کو جب یورپیوں اور روسیوں کے ساتھ مذاکرات کرنے ہوتے، تو وہ صرف ان کو لاکر بٹھاتے اور حکم دیتے کہ کیا کرنا ہے، اور دشمنوں کی یہ جرأت نہ ہوتی کہ انکار کرسکتے۔ مسلمانوں کو مذاکرات کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، صرف ان کا جلال ہی کافی ہوتا، کفار کو زیر کرنے کیلئے۔ اللہ کے فضل سے، مسلمانوں کی قوت بازو ہی اتنی تھی۔ مذاکرات تو وہاں کرنے پڑتے ہیں کہ جہاں آپ کمزور ہوں۔

عثمانی مسلمانوں کے بحری بیڑے کا عالم یہ تھا کہ جب امیر البحر خیر الدین باربروسا، بحیرہ روم میں گشت کرتے، تو کسی یورپی طاقت کی جرأت نہ ہوتی کہ ان کے سامنے آسکے۔ بحیرہ روم کو تو ''مسلمان جھیل'' (Muslim Lake) کہا جاتا تھا۔ یورپین اور وقت کی جتنی بڑی بڑی طاقتیں تھیں، مسلمانوں سے مدد کی بھیک مانگا کرتی تھیں، خراج ادا کرتیں۔ مسلمانوں کی اجازت کے بغیر یورپی ممالک کے جہاز بحیرہ روم میں سفر بھی نہیں کرسکتے تھے۔ یورپ میں قحط پڑتا، تو خلافت عثمانیہ امداد روانہ کرتی۔ یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلمان عیسائی طاقتوں سے امداد لیں، یورپ میں جا کر آباد ہوں یا مغربی تہذیب اختیار کریں۔ کئی سو سال تک تہذیب وتمدن کا مرکز بغداد، دمشق اور اندلسیہ رہے۔ پورے یورپ سے عیسائی طالب علم غرناطہ اور قرطبہ پہنچتے، اور عربی زبان میں علوم حاصل کرتے۔ سائنس وٹیکنالوجی کی زبان عربی تھی۔ چھ سو سال تک، بوعلی سینا کی کتاب ''القانون فی الطب''، یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہی۔

خلافت عثمانیہ کا بحری بیڑہ

یہ وہ دور تھا کہ جب ہم نے قرآن کو سینوں سے لگایا ہوا تھا۔ آج ہم نے قرآن کو ترک کر دیا ہے۔ قرآن کو پڑھتے بھی ہیں، تو صرف ان ترجموں کے ذریعے، تفاسیر کے ذریعے، کہ جو امت کو مزید فرقوں اور مسلکوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ جو قرآن کا اصل جوہر ہے، اس سے ہم نابلد ہیں۔ اقبالؒ بھی قرآن فہمی کے اس ناقص انداز پر چیخ اٹھے تھے، کہ یا اللہ تیرا قرآن تو برحق ہے، مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے کہ میرا!

ترجمے تو لوگوں نے اپنے اپنے فہم کے مطابق کیے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی اصل حکمت، عربی زبان میں نازل کی ہے۔ اس ایک ہی قرآن میں، ایمان، فہم، معرفت کے مختلف چشمے نکلتے ہیں۔ یہ غیر معمولی حکمت ترجموں میں آ ہی نہیں سکتی۔ آپ شیکسپیئر کا پنجابی میں ترجمہ کیجیئے، پھر دیکھیئے کہ شیکسپیئر کا کیا حشر ہوتا ہے۔ آپ مرزا غالب کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ کر دیجیئے، پھر دیکھیئے غالب کا کیسے بیڑہ غرق ہوتا ہے۔ عربی زبان کی اپنی ایک خاص طاقت ہے، حیرت انگیز وسعت ہے، کہ جس کو کسی بھی زبان کے ترجمے میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔ جب ہم نے قرآن کی زبان ترک کر دی، اور ترجموں کے محتاج ہوئے، وہیں سے امت مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات میں الجھتی چلی گئی، اور حکمت قرآن گم کر بیٹھی۔

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطابیں، وہ خطاپوش و کریم
چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

اقبالؒ یہاں پر بھی حیرت انگیز انداز میں حکمت قرآن بیان کررہے ہیں۔قرآن میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آپس میں نہایت رحیم ہوتے ہیں،اور کفار پرانتہائی شدید۔قرونِ اولیٰ میں ہمارے آباؤاجداد بڑے دل کےلوگ تھے، درگزر کرنے والے تھے، برداشت کرنے والے تھے، معاف کرنے والے تھے،تقسیم کرنے والے تھے،حسد نہ کرنے والے تھے،بغض نہ رکھنے والے تھے،عدل کرنے والے تھے،اورغلطیوں پر پردہ ڈالنے والے تھے۔آج کے مسلمان آپس میں باہم دست وگریباں ،فرقوں اورمسلکوں میں تقسیم،ایک دوسرے سے حاسد،بخیل،کینہ پرور،معاف نہ کرنے والے،تقسیم نہ کرنے والے،اورلوگوں کی غلطیوں پر پردہ نہ ڈالنے والے بن چکے ہیں۔اقبالؒ ایک اورمقام پرقرآن کی آیت کےمفہوم کوجوں کاتوں اپنے شعرمیں بیان کرتے ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آج ہمارے ہاں معاملہ یہ ہے، کہ ایک انسان کہ جوخودناپاک اور پلید ہوتا ہے،حرام میں پلا ہوتا ہے، وہ دوسروں پرفتوے لگا کراورکبھی سیاسی اعتراضات کے ذریعے، دوسروں کی ٹانگیں کھینچ کر،ان کا بیڑہ غرق کردیتا ہے،مگر کبھی اپنے گریبان میں نہیں جھانکتا۔یہ منافقت اوراخلاقی زبوں حالی ان قوموں میں ہوتی ہے کہ جن کو مار پڑنے والی ہو۔

چاہتے تو سب ہیں کہ ہوں اوجِ ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

اللہ کی یہ سنت ہے کہ اپنا کرم بھی شیروں اوردلیروں پر ہی کرتا ہے، بے غیرتوں اور بے شرموں پرنہیں۔آسمان کی بلندیوں پرتو سب ہی جانا چاہتے ہیں،لیکن اس عروج کیلئے جس قلب وجگر کی ضرورت ہے، وہ شاذ ہی کسی کے پاس ہو۔کم ظرف اورگھٹیا انسان کو اگر اختیاراور طاقت دے دی جائے تو وہ اپنا بھی بیڑہ غرق کرے گا اورقوم وملت کا بھی۔ ہمارے حکمرانوں کا بھی یہی عالم ہے۔غالباً سیدنا علیؓ کا قول ہے کہ، دولت روپیہ پیسہ، اختیار اور اقتدار ملنے سے لوگ بدلتے نہیں ہیں، بلکہ ظاہر ہوجاتے ہیں۔ جو اصلیت ہوتی ہے، وہ سامنے

آجاتی ہے۔ایک انسان کے اندر جو ناپا کی اور کمینگی چھپی ہوتی ہے، وہ اختیار، طاقت اور دولت ملنے سے ابل کر سامنے آجاتی ہے۔

انسان کے روحانی وجود کے بھی بہت سارے حصے ہیں، کہ جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔قلب منیب بھی ہے، قلب سلیم بھی، قلب شہید بھی، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ بھی۔انسان کے روحانی وجود کا بھی ایک ارتقاء ہے۔اگر انسان اپنے نفس کی تربیت کر کے اس کو نفس مطمئنہ تک، اور قلب کی اصلاح کر کے اسے قلب شہید تک نہ لے جا سکے، اور اس کو دنیا کا اختیار دے دیا جائے، تو یہ طاقت اسکو فتنے میں مبتلا کر کے تباہ و برباد کر دے گی۔اسی لیے سیدی رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل عرصے تک، صحابہ کرامؓ کی روحانی تربیت فرمائی، تزکیہ فرمایا اور ان کو اس قابل بنایا کہ جب مسلمان سلطنت خلافت راشدہ میں چین سے لیکر یورپ تک پھیلی ہوئی تھی، تب بھی ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ جو آج ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے۔

حضور ﷺ نے ایک صحابیؓ سے فرمایا کہ جس کا مفہوم کچھ یوں ہے، کہ میں آپکو ایک مہم پر بھیجتا ہوں کہ جہاں پر آپکو کامیابی بھی ملے گی اور اللہ آپکو بڑی دولت بھی دے گا۔ان صحابیؓ نے فرمایا، یا رسول اللہ ﷺ، میں دولت کیلئے تو جہاد نہیں کرتا۔حضور ﷺ نے فرمایا، کہ مرد صالح کو اگر مال صالح بھی مل جائے تو برا نہیں ہے۔بہت بڑی حکمت بیان فرمائی سیدی رسول ﷺ نے! مرد صالح کیلئے مال صالح برا نہیں ہے۔اگر مرد خبیث کو مال و اختیار دے دیا جائے، تو پھر وہ قارون اور فرعون ہی بنے گا، اور آپے سے باہر ہو جائے گا۔اسی لیے اختیار، طاقت اور مال و دولت کے حصول سے پہلے تربیت اور تزکیہ لازمی ہے، ورنہ ہلاکت ہے۔

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار
تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو وہ گلستاں بے کنار
اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

خودکشی صرف ایک فرد کی نہیں ہوتی، قومیں بھی اجتماعی خودکشی کرتی ہیں کہ جب وہ اخلاقی اور روحانی اقدار کو ترک کر کے، عیاشیوں اور بدکاریوں میں پڑ جائیں، جب ان کے حکمران ناپاک ترین اور خائن ترین منافق ہوں، جب ذاتی منفعت کیلئے، قوم کے اجتماعی مفاد کو قربان کیا جائے، جب بیت المال کو ذاتی مال سمجھا جائے، جب امانتیں نہ لوٹائی جائیں، جب یتیم، بیوہ اور مساکین کے مال ہڑپ کیے جائیں، عدالتیں انصاف فروخت کریں، علماء دین فروش ہوں، تاجر جھوٹی قسمیں کھائیں، سود اور رباء کا رواج ہو اور معاشرے میں

لوگوں کی عزت ان کی مال و دولت اور شر کے خوف سے کی جائے۔

یہ خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس وقت ہمارے ملک کا سب سے بڑا المیہ خیانت ہے۔ نیچے کلرک سے لیکر اوپر بادشاہ وقت تک، ہر کوئی خیانت اور رزق حرام میں ملوث ہے۔ ہر کوئی اپنی استطاعت کے مطابق خیانت کر رہا ہے۔''قومے فروختن و چہ ارزاں فروختن'' (وطن کو بیچا اور بڑا سستا بیچا)۔

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحہ ہستی پہ صداقت ان کی

آج دنیا میں اگر کوئی خیر قائم ہے، کہیں کوئی فلاحی ریاست کی شکل باقی ہے، کہیں کوئی عدل و انصاف کا نظام نظر آتا ہے، کہیں کوئی انسانی حقوق کی بات ہوتی ہے، تو اس کی بنیاد خلافت راشدہ میں ہی رکھی گئی تھی۔ آج بھی دنیا کے تمام دانشور اور تاریخ دان، خلافت راشدہ میں قائم کی گئی اسلامی فلاحی ریاست کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے، کہ جس کی بنیاد پر صدیوں تک مسلم تہذیب قائم ہوئی۔

سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا علیؓ کی انتظامی صلاحیت، ان کے نظم حکومت اور عدل و انصاف کو آج تک دنیا اپنے لیے نمونے کے طور پر دیکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی بنائی ہوئی فلاحی ریاست کا خاکہ، آج پوری دنیا میں استعمال ہو رہا ہے۔ دنیا یہ مانتی ہے کہ دنیا کو انسانیت سکھانے والے حضور ﷺ کے امتی تھے۔ انہوں نے ہی پوری دنیا کو اس وقت تہذیب سکھائی کہ جب یورپ اپنے تاریک دور سے گزر رہا تھا۔ آج بھی کفار، مسلمانوں سے تمام تر نفرت کے باوجود، صلاح الدین ایوبیؒ کی عزت کرنے پر مجبور ہیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی اور زوال کا نقشہ کھینچا جائے گا، تو ہر صاحب دل، دل شکستہ بھی ہوگا اور خون کے آنسو بھی روئے گا، اور اس پر قدرے مایوسی بھی چھائے گی۔ اقبالؒ کو اس بات کا ادراک تھا، اسی لیے تمام تر تکلیف دہ تشخیص کے بعد، اقبالؒ اس قوم کا حوصلہ بھی بڑھاتے ہیں، امید بھی دلاتے ہیں، خوشخبریاں بھی سناتے ہیں، اور آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل برانداز ہے، خون شہدا کی لالی

رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

اقبالؒ پورے اعتماد سے قوم کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ ان شاء اللہ خیر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے تقدیر لکھ دی ہے۔ اس قوم کو عروج ملنا ہے۔ یہ انسانیت کی خوش نصیبی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تقدیر کی تکمیل کیلئے اس امت کو اب اپنا آلہ کار بنائے گا۔ اگر ہم یہ کام نہیں کریں گے، تو اللہ اور لوگ لے آئے گا، لیکن یہ تقدیر پوری ہو کے رہے گی۔ ہم خوش نصیب ہونگے، اگر یہ فرض ہمارے نصیب میں ہو، ورنہ ہماری آگے آنے والی نسلیں یہ کام کریں گی۔ اقبالؒ خدا کے راز دار ہیں، فطرت کے اشارے سمجھتے ہیں، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و اوقات کو جانتے ہیں۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ اب امت مسلمہ کے عروج کے آغاز کا وقت آ پہنچا ہے، اور وہ یہ خوشخبری اپنی قوم تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

یہ مسلمانوں کا عروج اور آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔

اقبالؒ بتا چکے ہیں کہ آگے مسلمانوں کا ایک شاندار عروج آنے والا ہے۔ پاکستان نے بننا بھی ہے، یہاں خلافت راشدہ کا نظام بھی قائم ہونا ہے، غزوۂ ہند بھی ہونا ہے، اور پھر اس پاکستان نے امت مسلمہ کی قیادت بھی کرنی ہے۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو قوم پرستی کے فتنے سے خبردار بھی کرتے ہیں۔

پاک ہے گرد وطن سے سر داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

دیکھو! قومیت کے چکر میں نہ پھنس جانا۔ تم مسلمان ہو۔ تمہیں امت کی خدمت کرنی ہے۔ جہاں بھی اللہ تمہیں لے جائے، اور جو بھی ذمہ داری دنیا میں تمہارے ذمے لگائی جائے، وہ ادا کرو۔

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

آگے فرماتے ہیں:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشّہء مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

مسلمان اور اس کے نظریے کا تعلق کسی خاص خطہء زمین سے نہیں ہے۔ اگر کوئی خطہء زمین، کفار کے ظلم کی وجہ سے، مسلمان کیلئے تنگ پڑ جائے، تو وہ ہجرت کر کے اللہ کی زمین میں کہیں اور جا بستا ہے۔ اسلام ایک روحانی نظریے کا نام ہے۔ اسی لیے قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ پاکستان اسی وقت بن گیا تھا، کہ جب ہندوستان میں پہلا ہندو، مسلمان ہوا تھا۔ اسی بات پہ اقبالؒ بھی زور دیتے ہیں۔

تاتاریوں کی مثال سے اقبالؒ، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں میں کسی قوم کو تباہ یا تبدیل کر دیا جائے، تو اللہ اس بات پر اختیار رکھتا ہے کہ کفار کو مسلمان کر کے ان سے اپنے دین کا کام لے، اور وہ اللہ کے دین کی حفاظت کا کام کریں۔

یہی بات اقبالؒ کہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ نے تو اپنا کام لینا ہے، نئی شاخیں پھوٹ رہی ہیں، نیا سورج نکل رہا ہے، مسلمانوں کا عروج قطعی طور پر لکھا ہے۔ تم اگر نہیں کرو گے تو تاتاریوں کی مثال سے سبق سیکھ لو، کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تبدیل کر کے کافروں کو لے آئیگا، اور وہ کافر مسلمان ہو کر وہ فرض ادا کریں گے کہ جو تمہارے نصیب میں لکھا تھا۔ اللہ کا کام تو ہو کر رہے گا، بشارت میں تمہیں دے رہا ہوں۔

آگے فرماتے ہیں، اور یہ بات آج کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق کے بحران کے حوالے سے بھی غیر معمولی طور پر اہمیت کی حامل ہے۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا
غافلوں کیلئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا

امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے

نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

یہاں پر بھی اقبالؒ مسلمان قوم کو بیدار کرنے کیلئے ، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی حکمت بیان کررہے ہیں۔ظاہر میں تو یہ نظر آتا ہے کہ کفار مسلمانوں پر ظلم کررہے ہیں، مگر حقیقت میں اس میں بھی خیر چھپی ہے کہ اس آزمائش سے خواب غفلت میں مدہوش امت بیدار ہونے لگی ہے۔

اس زمانے میں خلافت عثمانیہ کے خلاف بلغاریہ نے بغاوت کردی تھی۔ ترک مسلمانوں کو یہ لوگ مار رہے تھے۔ بالکل اسی طرح ظلم ہورہا تھا کہ جس طرح آج فلسطین، کشمیر، عراق یا افغانستان میں ہورہا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ جو بلغاری حملہ ہو چکا ہے، یہ غافلوں کیلئے بیداری کا پیغام ہے۔اس ہنگامے کے نتیجے میں، دشمنوں کے حملے کے نتیجے میں، ہم مسلمان جو غافل تھے، وہ بیدار ہوجائیں گے۔

عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یعنی عثمانیوں پر اگر تباہی آ گئی ہے، ترک مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے، تو اس میں بھی خیر کا ایک پہلو ہے۔ بنجر قومیں زندہ ہونے کیلئے شہداء کا خون مانگتی ہیں۔ لاکھوں ستارے ہلاک ہوتے ہیں، تو ہی صبح ہوتی ہے۔ یعنی لاکھوں مسلمانوں کا خون بہے گا، تو اللہ ان شہیدوں کی برکت سے، غافل امت کو بیدار کردے گا۔ اقبالؒ کے یہ اشعار، قرآن پاک کی اس آیت کا مفہوم ہیں کہ، ''ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے......''

تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ تمہیں عذاب میں مبتلا کرنے کیلئے ہورہا ہے، ہرگز نہیں! یہ قربانیاں تمہیں بیدار کرنے کیلئے لی جارہی ہیں، امت کی صدیوں کی غفلت کا کفارہ بن رہی ہیں۔ جو مارے جارہے ہیں، شہید ہیں اور جو مزاحمت کررہے ہیں وہ غازی ہیں اور جو غافل ہیں وہ منافق ہیں۔ ان کو بے نقاب کرکے دکھایا جارہا ہے کہ تمہارے حکمران کیسے ناپاک اور پلید لوگ ہیں۔ جب تم پر مصیبت پڑے گی، تو یہ تمہاری عزت کی حفاظت نہیں کریں گے، ان سے امیدیں مت لگانا۔ سارا کھیل کھول کر سامنے رکھا جارہا ہے۔ جب امتحان ہوتا ہے، تو ہر انسان کی اچھائی اور برائی کھل کر سامنے آجاتی ہے، قوموں کی خوبیاں اور خامیاں واضح ہوجاتی ہیں۔

امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

جواب شکوہ میں جو کچھ لکھا جارہا ہے، وہ آج ہم پر اسی طرح منطبق ہورہا ہے، کہ جیسے آج پاکستانی قوم کو مخاطب کرکے یہ بات کہی جارہی

پہلی جنگ عظیم کے دوران خلافت عثمانیہ کا توپ خانہ
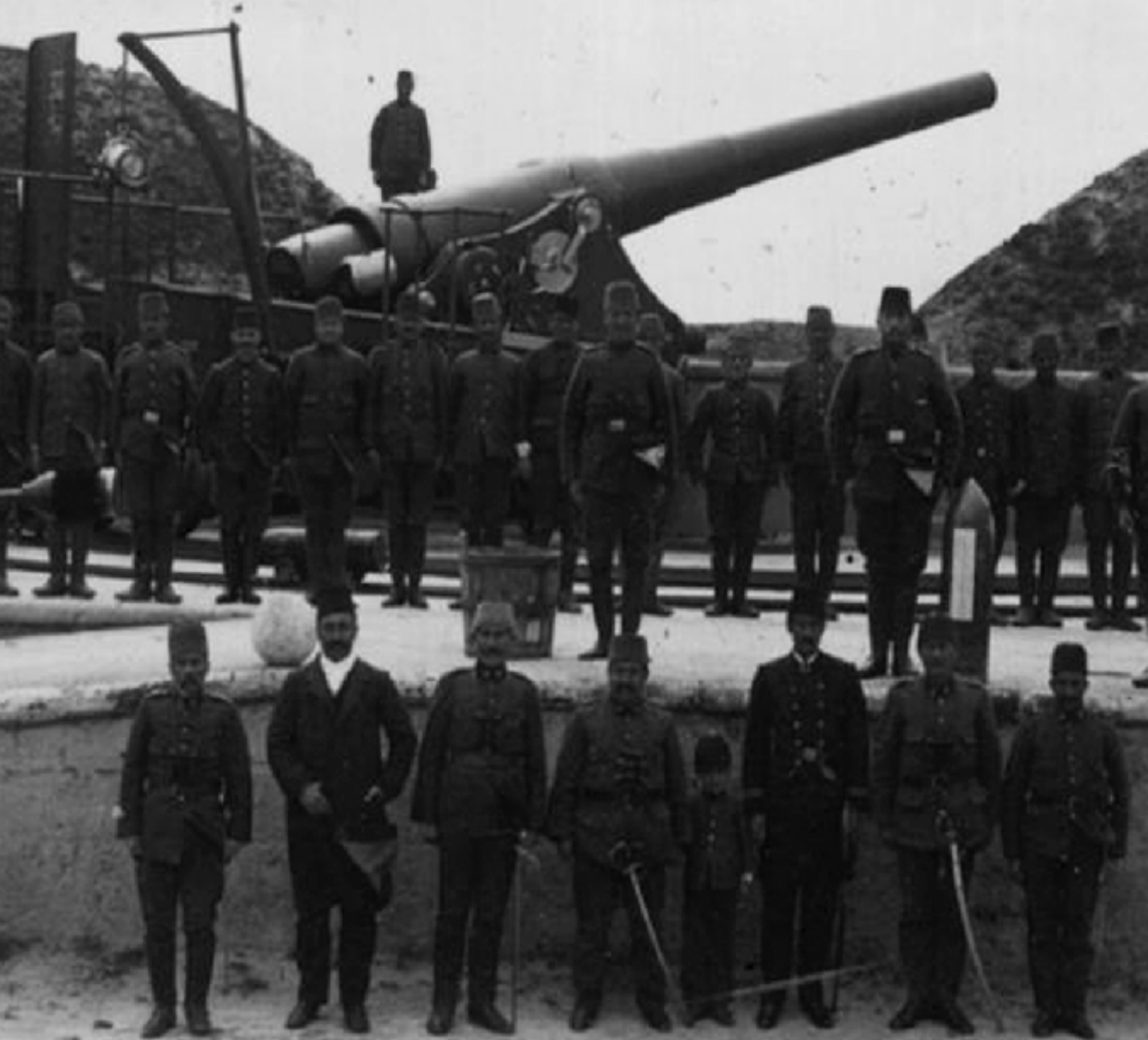
ہو۔ یہ کلام اردو میں ہے۔ اس راز کو بھی سمجھیئے گا، کہ اردو بولنے والی قوم ہم ہی ہیں۔ اس کلام کے مخاطب پاکستانی ہیں۔

کیوں ہراساں ہیں صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

کیوں اس بات سے خوفزدہ ہو کہ دشمن کے پاس عسکری قوت زیادہ ہے، اس کے ہتھیار جدید ہیں، زیادہ مہلک ہیں؟ ان کے ہتھیار تو جدید ہو سکتے ہیں، مگر اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی تائید ان کے پاس نہیں ہے۔ تم امت رسول ﷺ سے ہو، مارے جاؤ گے تو شہید، کامیاب ہو گے تو غازی، دونوں صورتوں میں تمہارے نصیب میں سعادت ہی ہے۔ یہ شعر بھی قرآن پاک کی ایک اور آیت کا مفہوم ہے کہ "یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں، یہ لوگ کبھی بھی اللہ کے نور کو نہیں بجھا سکیں گے، چاہے کافر جو مرضی کر لیں۔"

اقبالؒ اسی جواب شکوہ میں آگے بتاتے ہیں۔

چشم اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری
وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہاں اقبالؒ ایک بہت بڑی حقیقت کھول رہے ہیں کہ آنے والے دور میں مسلمانوں کو دوبارہ انسانیت کی قیادت سنبھالنی ہے، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام ہونا ہے، انسانیت کو ایک مرتبہ پھر نور توحید سے روشن کرنا ہے۔ گو کہ آج انسان اس حقیقت کا ادراک نہیں رکھتا، اسلام کی حقیقت اس پر آشکار نہیں ہے، وہ غفلت، کفر اور ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے، مگر کل یہ راز آشکار ہو کر رہے گا۔

وہ مسلمانوں کو امید دلاتے ہیں کہ زمانے کو تمہاری ضرورت ہے۔ دنیا پچھلے سو، دو سو سال سے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت میں تقسیم ہے۔ مادیت کا دور ہے۔ روحانیت ختم ہو چکی ہے۔ کروڑ ہا انسان قتل اور تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اس وقت انسانیت کو اسلام اور مسلمانوں کی ضرورت ہے۔

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری! ابھی تو قوموں کو پتہ ہی نہیں لگا کہ اسلام لانے میں، اسلام نافذ کرنے میں، اسلام کا نظام عدل، نظام معیشت اور نظام حکومت نافذ کرنے میں کیا خیر ہے۔

ابھی محفل ہستی کو ہے ضرورت تیری! ابھی اس دنیا کو تمہاری ضرورت ہے۔ مسلمانو! اپنی ذمہ داری کو سمجھو، صرف اپنے لیے زندہ مت رہو، انسانیت کو تمہاری ضرورت ہے، صرف اس لیے زندہ نہ رہو کہ بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے۔ تمہیں دنیا میں ابھی بہت کام کرنے ہیں۔

زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری! اگر دنیا یا زمانے میں کوئی خیر باقی ہے، تو امت مسلمہ کی وجہ سے، اس قرآن، سنت اور شریعت کی وجہ سے کہ جو اس امت کے پاس ہے۔

کوکب قسمت امکاں ہے خلافت تیری! ابھی تو تمہیں سارے جہانوں پر حکومت کرنی ہے، تم خلیفۃ اللہ فی الارض ہو، اپنے مقام کو سمجھو۔

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے! کہاں تم آرام سے بیٹھے ہو، ابھی تو کرنے والا بہت سا کام باقی ہے۔ امت کو دیکھو، دنیا کو دیکھو۔ امت تکلیف میں ہے، انسانیت تباہی کے کنارے پر ہے، اور تم اس زمین پر خدا کا آخری پیغام ہو۔

نورتوحید کا اتمام ابھی باقی ہے! ابھی تو ہم نے دنیا کو بتانا ہے کہ لا الہ الا اللہ کا مطلب کیا ہے، انسانوں کو، انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانا ہے، حضور ﷺ کی رحمت میں لانا ہے، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو قائم کرنا ہے، ہندوستان کو ایک مرتبہ پھر نورتوحید سے روشن کرنا ہے۔

اسکے بعد اقبالؒ حل کی طرف آتے ہیں۔ حاصل کلام بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں، کہ دیکھو تمہیں ڈیوٹی معلوم ہوگئی، تمہیں بشارت بھی دے دی گئی، تمہیں طریقہء کار بھی بتا دیا گیا، اور تمہاری غلطیوں کی تشخیص بھی کر دی گئی۔ اگلا سوال یہ آتا ہے کہ اب ہم کیا کریں؟ اسکا جواب وہ انتہائی غیر معمولی دیتے ہیں۔ یہاں سے وہ رومانوی پہلو شروع ہو رہا ہے کہ:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے

ہمارے پاکستان میں اس شعر کا بہت زیادہ حوالہ دیا جاتا ہے، لیکن یہ شعر یہاں ختم نہیں ہوتا۔ جواب شکوہ میں اس کے بعد اس کی وضاحت بھی موجود ہے، اور اسلامی روحانیت میں، دین کے اس تصور میں کہ جہاں تزکیہ اور احسان کی بات کی جاتی ہے، وہاں یہ بیان ہوتا ہے۔ یہ اتنی نازک جہت ہے، کہ جس کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی مسلمان اس مقام کو حاصل کر سکے، کہ جو ایک بندہء مومن کی معراج ہے۔ حضور ﷺ سے براہ راست تعلق ہر بندہء مومن کا منتہائے مقصود ہے۔

حضور ﷺ کے مقام کے حوالے سے اقبالؒ جواب شکوہ میں کیا فرماتے ہیں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو، تو پھرمے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے

اقبالؒ نے حضور ﷺ کو شہنشاہ لولاک کہا ہے۔ لولاک اس حدیث کے حوالے سے ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

اے نبی ﷺ! اگر آپ نہ ہوتے تو میں کائنات کو نہ بناتا۔اس حدیث شریف میں ''لولاک'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی ''اگر آپ نہ ہوتے''۔

اقبالؒ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ شہنشاہ لولاک ہیں، اور بندہ ءمومن کو کہا ہے کہ تم شہہ لولاک کے شاہین ہو۔تم نبی اکرم ﷺ کے شاہین ہو۔ پھر فرماتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ نہ ہوتے، اگر یہ پھول نہ ہوتا، اگر یہ وجہ تخلیق کائنات نہ ہوتی، تو نہ کسی بلبل کا ترنم ہوتا، نہ اس کی صدا۔ اگر حضور ﷺ نہ ہوتے ،تو کسی کلی، کسی پودے، کسی پھول میں، پوری دنیا میں کوئی خیر نہ ہوتی، کوئی خوبصورتی نہ ہوتی۔ اگر حضور ﷺ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا، توحید بھی نہ ہوتی، دنیا بھی نہ ہوتی، تم بھی نہ ہوتے۔

تصور کیجیئے ،اقبالؒ یہاں صاف صاف یہ بات لکھ رہے ہیں۔

خیمہ افلاک کا ایستادہ اسی نام سے ہے

اگر یہ کائنات، زمین وآسمان کھڑے ہیں، تو حضور ﷺ کے اسم مبارک سے ہی کھڑے ہیں اور نبض ہستی، یعنی زندگی اگر چل رہی ہے، تو حضور ﷺ کے اسم مبارک سے ہی چل رہی ہے۔

یہاں پہ حضور ﷺ کے عشق کے حوالے سے، اقبالؒ نے جو بات کہی ہے، اسکو سمجھنا ضروری ہے کہ اسم محمد ﷺ سے اجالا کس طرح ہوتا ہے؟ پہلے اسم محمد ﷺ کا مقام تو سمجھو۔ پوری کائنات اسی نام کی برکت سے چل رہی ہے۔مقام مصطفیٰ کو سمجھنا کوئی آسان بات نہیں۔ ادب اور عشق رسول ﷺ کا تقاضا،صرف درود شریف پڑھنے پر ہی موقوف نہیں۔ یہ کائنات کا سب سے بڑا راز ہے، کہ جس کا راز دار رب خود ہے، یا وہ کہ جس کو رب خود عطا فرمائے۔شہنشاہ لولاک ﷺ سے، شاہین شہنشاہ لولاک ﷺ کا جو خاص تعلق ہے، وہی بندۂ مومن کی معراج ہے، وہی ہر پستی کا علاج ہے، وہی ہر عروج کا زینہ ہے، وہی محبّ اور محبوب کا راز ہے، یہی قوت عشق ہے!

۱۱

بہ مصطفیٰ برساں خویش کہ دین ہمہ اوست

پچھلے باب میں ہم نے بندۂ مومن کی قوت عشق کی بات کی تھی، اس کے شہہ لولاک ﷺ سے تعلق کی بات کی تھی، یہ واضح کیا تھا کہ مرد مومن کی قوت کا اصل جوہر، عشق اور ادب رسول ﷺ ہے، کہ جس سے وہ کائنات کی تسخیر کرتا ہے، تقدیر لکھتا ہے، تاریخ مرتب کرتا ہے، اور وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل دیتا ہے۔ اس قوت عشق کے بغیر، مسلمان صرف راکھ کا ایک ڈھیر ہے، اس قوت کے ہوتے ہوئے وہ ایک ہستی فوق الادراک ہے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کردے

یہ معرفت، حقیقت، عرفان اور نور بصیرت کی معراج ہے۔ یہ نازک معاملات ہیں۔ یہ وہ معاملات ہیں کہ جن کا تعلق بندہ ءمومن کی حقیقت سے بھی ہے اور اسکی معراج سے بھی۔ یہی وہ راز ہیں، یہی وہ دین کی لطافتیں ہیں کہ جن کی معرفت ایک مسلمان کو مومن، پھر متقی، پھر محسن، پھر صالح، پھر شہید اور پھر صدیق کے درجے پر فائز کرتی ہیں۔ یہی وہ روحانی درجات ہیں کہ جو مقربون کو اصحاب الیمین سے جدا کرتے ہیں، درجہ ءانعام والوں کو اہل جنت میں ممتاز کرتے ہیں۔

زندگی تو سبھی گزارتے ہیں، مگر زمین آسمان کا فرق ہے، ایک عام مسلمان میں، اور اس بندہ ءمومن میں، کہ جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا کارساز

بھی ہو، اور راز دار بھی، اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی کا آلہ ءکار بھی ہو، اور مئوذن بھی، کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے احکامات کی تکمیل کرواتا ہو۔ یہ فرق اسی روحانی جہت کی بدولت ہے کہ جس کا اب ہم ذکر کریں گے۔

اقبالؒ جب علم اور عشق کی بات کرتے ہیں، جب اسم محمد ﷺ کی بات کرتے ہیں، جب لوح وقلم کی بات کرتے ہیں، جب تقدیر کی بات کرتے ہیں، تو یہ تمام واقعات، یہ تمام معاملات، محض فلسفیانہ باتیں نہیں، بلکہ معرفت کی زندہ و جاوید حقیقتیں ہیں، کہ جن کی بنیاد پر ہمارے بڑوں نے تاریخیں رقم کیں، دنیا کو فتح کیا۔

فرد ہو یا ملت، اس انقلاب کا آغاز شریعت سے ہوتا ہے۔ جواب شکوہ میں اقبالؒ شریعت سے شروع کرتے ہوئے روحانی معراج تک پہنچتے ہیں۔ ہم اسی کلام کو جاری رکھتے ہیں۔

دشت میں، دامن کوہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے

اللہ رب العالمین ہے، اور اسکے رسول ﷺ رحمت اللعالمین! جہاں جہاں کا وہ رب ہے، جہاں جہاں اسکی رحمت پہنچ رہی ہے، اسکا وسیلہ اللہ کے نبی اور رسول ﷺ ہیں۔ چاہے یہ بات عقل میں آئے یا نہیں، فکر میں سمائے یا نہیں، حقیقت ازلی اور ابدی ہے کہ آپ ﷺ اس وقت بھی نبی تھے کہ جب آدمؑ مٹی اور پانی کے درمیان ایک وجود تھے، جب ان کی تخلیق بھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے نور سے ہی پوری کائنات کی تخلیق ہوئی، ''کنت کنزن مخفی'' کا راز ظاہر ہوا، اور یہ حقیقت بھی، کہ حقیقت ایک ہے ہر شے کی، نوری ہو کہ ناری، لہو خورشید کا ٹپکے، اگر ذرے کا دل چیریں۔

یہی اقبالؒ کا حیرت انگیز کمال ہے کہ جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ معرفت کی ایسی انتہا کہ جو نہ کبھی اس سے پہلے، اس انداز میں، لکھی گئی، نہ بیان ہوئی۔ حقیقت مصطفیٰ ﷺ کی ایسی تعریف، تعریف کرنے والے کا خود اپنا تعارف بھی کراتی ہے۔ کائنات میں جو بھی خیر ہے، چاہے وہ انفس میں ہو یا آفاق میں، اس کا جوہر نور مصطفیٰ ﷺ ہے، اسکی معرفت معراج مومن ہے، اور اس تک پہنچنے کا زینہ قوت عشق ہے۔

اس سفر کا آغاز اطاعت رسول ﷺ سے ہوتا ہے، پھر اتباع رسول ﷺ ہے، اور پھر عشق رسول ﷺ، کہ جس کے بعد بندۂ مومن اس قابل ہوتا ہے کہ دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کرے، اور قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے۔

یہ بات ہم نے آپ سے کہی تھی کہ یہ معرفت کے راز کہ جو اقبالؒ نے بیان کیے ہیں، صرف تخیلاتی تصورات نہیں ہیں۔ تاریخ اسلام میں

ہمیں ہزاروں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں مسلمان سپہ سالاروں، حکمرانوں، علماء، دانشوروں اور مجاہدین نے اسی قوت عشق رسول ﷺ کی بنیاد پر تقدیریں تبدیل کیں، تاریخیں لکھیں اور ستاروں پر کمندیں ڈالیں۔

ہم آپکو نورالدین زنگیؒ کی مثال دیتے ہیں۔ ایک مسلمان عسکری سپہ سالار، کہ جو اس وقت صلیبی جنگوں میں پوری مسلمان دنیا کی عزت و آبرو کی حفاظت کر رہا تھا، اسکا براہ راست روحانی تعلق حضور ﷺ کے ساتھ تھا۔ حضور ﷺ نے خواب میں آ کر، اس کو براہ راست حکم جاری فرمایا کہ مدینہ جاؤ کہ وہاں پر دو صلیبی ہمیں تنگ کر رہے ہیں۔ خواب میں ہی اسے نہ صرف ہدایات جاری کی گئیں، بلکہ ان دو صلیبیوں کی شکلیں بھی دکھائی گئیں۔ سلطان نورالدین زنگیؒ فوراً نیند سے بیدار ہوتے ہیں، ایک جنگی مہم ترتیب دیتے ہیں، اور بجلی کی سی تیزی سے مدینہ منورہ کی جانب سفر کرتے ہیں۔ ان دو صلیبیوں کو تلاش کیا جاتا ہے، کہ جو روضہء مبارک کی بے حرمتی کرنا چاہ رہے تھے، کہ جن کے ناپاک چہرے، خود رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی سلطان کو دکھا دیئے تھے۔ سلطان ان دونوں فسادیوں کو جہنم رسید کرتے ہیں، اور پھر روضہء پاک کے گرد گہری خندق کھدوا کر اس میں سیسہ بھروا دیتے ہیں، تا کہ قیامت تک کوئی اور گستاخ اس بے ادبی کی جرأت نہ کر سکے۔

یہ بات عقل میں آنے والی نہیں ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آج بھی اپنی امت کی اسی طرح خبر گیری فرما رہے ہیں، نگاہ رکھے ہوئے ہیں، ہدایات جاری فرما رہے ہیں، کہ جس طرح آپ ﷺ اپنی ظاہری حیات مبارکہ میں فرماتے تھے۔ یہ راز عقل سے نہیں، قوت عشق سے ہی کھلتا ہے۔

وہ تمام مسلمان کہ جنہوں نے امت مسلمہ کی تاریخ تبدیل کی، امت کی حفاظت کی، دین کا احیاء کیا اور کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرتے رہے، ان سب کا رسول اللہ ﷺ سے ایک خاص ذاتی روحانی تعلق تھا۔ یہ ایک ایسا رازدارنہ تعلق ہوتا ہے کہ جو بہت کم جگہوں پر ظاہر ہوا ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ اس تعلق کے بغیر بندۂ مومن کائنات کا احتساب کرنے کے قابل نہیں ہوتا، چاہے وہ خالد بن ولیدؓ ہوں، طارق بن زیادؒ ہوں، نورالدین زنگیؒ ہوں، صلاح الدین ایوبیؒ ہوں، سلطان محمد فاتحؒ ہوں، عمر مختارؒ ہوں یا امام شاملؒ۔ ہر مرد خود آگاہ و خدا مست کا یہی مسلک ہے۔

اور یہی بات اقبالؒ بتانا چاہ رہے ہیں، کہ اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اس کائنات کا مرکز ثقل حضور ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔ یہ پوری کائنات حضور ﷺ کے مبارک وجود کے گرد گھومتی ہے۔ اگر اپنے وجود کے مرکز سے تعلق قائم نہ کرو گے، تو پھر نہ تمہاری کوئی سمت ہوگی، نہ پیمانہ، نہ میزان، اور تم اپنی جڑ سے اکھڑ جاؤ گے۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

اقبالؒ کا کمال ہی یہی ہے کہ وہ قرآن کی آیتوں کو، اسکی حکمتوں کو، اس کے رازوں کو، اپنے اشعار میں اس طرح پروتے چلے جاتے ہیں کہ قاری کا وجود ہل کر رہ جاتا ہے۔ اس شعر میں بھی اقبالؒ اس حقیقت کو واضح کررہے ہیں کہ جس میں اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو فرمایا ہے: ''بے شک ہم نے آپ کیلئے آپکے ذکر کو بلند کردیا ہے''۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ قیامت تک انسان اس حقیقت کی گواہی دیکھے گا، کہ کائنات کے ذرے ذرے سے، اللہ تعالیٰ کی اپنے حبیب ﷺ سے محبت چھلک رہی ہے، کہ جن کی خاطر اس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔

اقبالؒ اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اگر اس روحانی جہت کو، محبّ اور محبوب کے اس تعلق کو، امتی اور رسول کی اس نسبت کو، نہ سمجھو گے تو اس فیض سے محروم ہو جاؤ گے کہ جو تمہارے نصیب میں ہے، کہ جس کی بنیاد پر تمہیں زمین میں خلافت دی گئی، کہ جس کی اساس پر اس کائنات کو تمہارے لیے تسخیر کیا گیا، اور جس کی دلیل پر تم نے اس زمین میں دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام کرنا ہے۔

اگر رسول ﷺ سے تعلق کو صرف اس بات تک محدود کردیا کہ وہ آئے اور ایک پیغام دے کر چلے گئے، اور اب ہمارا ان کے ساتھ مزید کوئی تعلق اور نسبت ممکن نہیں، تو ایک ہلاکت خیز غلطی کرو گے۔ اگر روح محمد ﷺ تمہارے وجود سے نکال دی گئی، تو دہر میں اسم محمد ﷺ سے کبھی اجالا نہ کر پاؤ گے۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اقبالؒ کی اس روحانی جہت کو کم ہی لوگوں نے سمجھا ہے، ان کا ایک ایک شعر اکثر علم و حکمت کی پوری پوری کتابوں پر بھاری ہوتا ہے۔ لاہور کے ایک درویش حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں کہ اقبالؒ کو سمجھنے کیلئے کم از کم قلندر کے مقام پر ہونا لازم ہے۔

مثال کے طور پر، سورۃ النجم شروع ہوتی ہے ''والنجم'' سے۔ دنیا کی تفاسیر میں یہی لکھا ہے کہ یہ ایک تارے کی قسم ہے، کہ جب وہ طلوع ہوا۔ مگر جو اللہ کے راز دار ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ محض ایک تارے کی قسم نہیں، اس کی ایک روحانی جہت بھی ہے، اس میں حکمت و دانائی کے گہرے راز چھپے ہیں۔ چنانچہ اس کو صرف ستارے کا حوالہ سمجھنے والوں کو اقبالؒ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں:

تو معنی ''والنجم'' نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

یعنی تم کو اگر ''والنجم'' کا مفہوم نہ سمجھ آیا، تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے، کیونکہ تمہارے وجود میں ابھی عشق و مستی، ادب رسول ﷺ کا وہ طوفان برپا نہیں ہے، کہ جو تم میں مومن کی فراست پیدا کرے۔ تمہارے پاس وہ مرشد نہیں ہے کہ جس کی نگاہ سے تمہاری تقدیر بدل جائے، نہ تمہاری خودی اتنی بلند ہے کہ تم خود تقدیر یزداں بن سکو۔

....

یہاں اقبالؒ اب ایک غیر معمولی روحانی جہت کی طرف آ رہے ہیں، کیونکہ اب انہیں امت کے مسائل کے حل بتانے ہیں۔ انہیں یہ بتانا ہے کہ اگر تمہیں دنیا میں کوئی تبدیلی لے کر آنی ہے، تو کیوں اور کیسے۔ شریعت سے شروع کرتے ہوئے اب وہ روحانی تعلق پر آ رہے ہیں۔ یہ سمجھا رہے ہیں کہ کس طرح روحانی قوتیں، اس مادّی دنیا کے نظام کو سنبھالے ہوئے ہیں اور اسکو چلا رہی ہیں۔ اب وہ اس مقام پر آ گئے ہیں کہ جو مومن کی معراج ہوتا ہے، کہ جہاں ایک بندہ ءمومن کا حضورﷺ سے ایک ذاتی تعلق ہوتا ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تقدیر کا ایک حصہ بن جاتا ہے، وہ اللہ کا راز دار ہوتا ہے۔ اس مقام پر آنے کے بعد ہی فطرت اس کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرتی ہے۔ ہمارے بزرگوں کی جو صفات اقبالؒ نے بیان کی ہیں، ان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ گویا وہ اس دنیا کے افراد ہی نہ تھے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ عرب کے صحرا سے کچھ خاک نشین نکلیں، فاقہ کش و مسکین، جسم پر چیتھڑے، ہتھیار بھی نامکمل اور پھر بھی آناً فاناً فارسی اور رومی سلطنتوں کو روندتے چلے جائیں!

دنیا کے تمام عسکری حکمت عملی ساز، دنگ ہیں قرون اولیٰ کے ان مجاہدین کے کارنامے دیکھ کر۔ ہم بار بار اس پر زور دے رہے ہیں کہ یہ معجزے، صرف عسکری حکمت عملی کی وجہ سے نہیں تھے۔ عسکری حکمت عملی کا دخل ضرور تھا، اور وہ یقیناً شاندار حکمت عملی بناتے تھے، لیکن اصل وجہ ان کے وہ غیر معمولی کردار تھے، وہ پراسرار وجود تھے کہ جس کے باعث انہوں نے پوری دنیا کی تاریخ اور تقدیر تبدیل کر کے رکھ دی۔ وہ ان کی قدوسی طاقت تھی، روحانی پہلو تھا، یہ ان کا خاص الخاص تعلق تھا حضورﷺ سے۔ وہ قہاری بھی تھے، قدوسی بھی اور جبروت بھی۔ وہ ہمسایہ ءجبرئیل امیں بھی تھے، اور زمین و آسمان و کرسی و عرش، سب ان کی خودی کی زد میں تھے۔

یہاں پر اقبالؒ کے دو بہت خوبصورت پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ عقل کی بات کرتے ہیں، اور دوسری جانب عشق کی۔ عقل اور عشق کی جہتوں کو سمجھنا، اب ہمارے لیے بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ عقل کا میدان جنگ اور ہے، عشق کا میدان عمل اور۔ عقل کی حدیں متعین ہیں، عشق کی سرحدیں لامحدود۔ عقل کے پر سدرۃ المنتہیٰ پر جلتے ہیں، عشق خودی کی خلوتوں اور جلوتوں کا راز دار ہے۔ اقبالؒ کے ایک ایک شعر میں اتنے گہرے راز چھپے ہیں کہ اگر وہ انسان کے وجود پر نازل ہو جائیں، تو قلب و نگاہ ہی کیا کائنات ہی بدل ڈالیں۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تیری
میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری
ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تیری

اللہ تعالیٰ نے عقل اور عشق کی دونوں قوتیں ایک انسان کے وجو میں رکھی ہیں، مگر ان کا دائرہ عمل جدا جدا ہے۔ نہ عشق کو عقل کی حدود میں

دخل دینا چاہیے، نہ عقل کو عشق کی دنیا میں۔

انسان جب اپنے دنیا کے معاملات طے کرتا ہے تو عقل کے ذریعے کرتا ہے۔ گھر کیسے بنانے ہیں، دفاعی نظام کیسے بنانا ہے، تعلیمی نظام کیسا ہو، معاشی نظام کیا ہو، عدالتی نظام کیا ہو، فقہ کے معاملات، یہ سب عقل کے معاملات ہیں۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ عقل تمہاری ڈھال ہے، کہ جو ہمیں دنیا کی مصیبتوں، پریشانیوں اور فتنوں سے بچاتی ہے اور ہماری زندگی کو منظّم کرتی ہے۔ مگر عقل ایک محدود شے ہے، اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی جہتیں بے انتہا ہیں۔ وہاں انسان عقل کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا، لیکن عشق کی ایک جست انسان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ جہاں انسان کا قلب جا سکتا ہے، وہاں عقل کی رسائی نہیں۔

یہ انسان کی روحانی اور مافوق الفطرت جہتیں ہیں۔ سفر معراج میں حضور ﷺ نے ایک خوبصورت واقعہ بیان کیا ہے کہ جبرائیل امینؑ سدرۃ المنتہیٰ پر رک جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ تو معرفت کی زبان میں، انسان کی عقل کی معراج سدرۃ المنتہیٰ تک ہی ہے۔ گو کہ عقل پوری کائنات میں پھر سکتی ہے، مگر سدرۃ المنتہیٰ کے پار عقل کی کوئی رسائی نہیں۔ یہاں سے عشق کی سرحدوں کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم فلسفہء خودی پہ آئیں گے، جہاں اسرار خودی، رموز بے خودی اور حقیقت انسانیہ کی بات کی جائے گی، تو اس وقت ہم عشق کی منزلوں پر بھی تفصیل سے بات کریں گے۔

وہ تمام معاملات کہ جن کا تعلق اللہ کی معرفت اور حضور ﷺ کی نسبت سے ہے، وہ عقل کے نہیں، قلب کے ہیں۔ جب انسان عقل کے ذریعے ان معالات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، تو صرف الجھ کر رہ جائے گا، کیونکہ یہ باتیں عقل میں آنے والی نہیں۔ عقل یہ کیسے سمجھے گی کہ شہید مرتے نہیں، زندہ ہوتے ہیں، اور انہیں ان کے رب کی طرف سے رزق دیا جاتا ہے۔ عقل اس کا احاطہ کیسے کرے گی، کہ آج بھی آپ ﷺ امت کی اسی طرح رہنمائی اور خبر گیری فرما رہے ہیں، اور فیض تقسیم فرما رہے ہیں کہ جیسا معاملہ صحابہ کرامؓ کے ساتھ تھا۔ یہ عقل کی باتیں نہیں، عشق اور قلب کے معاملات ہیں۔ گمراہی کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے کہ جب انسان عشق اور قلب کے معاملات کو اپنی محدود عقل سے طے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عقل اور عشق کی حدود کو جاننا ہی حکمت ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا جا رہا تھا، تو جبرائیل امینؑ نے آ کر ان سے پوچھا: ''کوئی حاجت؟''، آپؑ نے فرمایا: ''آپ سے کوئی نہیں!''۔ جبرائیل امینؑ نے پھر پوچھا: ''اللہ سے؟''، ابراہیمؑ نے جواب دیا: ''اس کو میرا حال معلوم ہے۔'' یہ ہے عشق، کہ جہاں عقل کی کوئی رسائی نہیں۔

میرے درویش خلافت ہے جہانگیر تیری

یہاں پہ مردِ مومن کو، مردِ مجاہد کو، اللہ کے بندے کو اقبالؒ نے درویش کہا ہے۔ درویش کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہتا تو ہے، لیکن اس دنیا سے آلودہ نہیں ہوتا۔ بطخ کی طرح پانی میں تیرتا تو ہے، لیکن گیلا نہیں ہوتا۔ وہ دنیا کو استعمال تو کرتا ہے، لیکن دنیا اسکے دل میں نہیں بستی۔ وہ علم اور عشق کی جہتوں کو بھی جانتا ہے، اور دونوں کا ایک خوبصورت متوازن امتزاج ہوتا ہے۔ ایسے فقیر کیلئے پوری کائنات دائرہ اختیار بھی ہوتی ہے اور دائرۂ عمل بھی۔ زمین و آسمان و کرسی و عرش، سب کچھ اس کی دسترس میں ہوتا ہے۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبالؒ کا یہ درویش اپنے اندر مصطفائی اور کبریائی صفات رکھتا ہے۔

ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تیری

اقبالؒ کے درویش کی خودی کا سرِ نہاں، اس کا کلمہ، اسکی تکبیر ہے۔ اس کا عشق ایک ایسی آگ ہے، کہ جو سوائے اللہ کے ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ لا الہ الا اللہ کا ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے''، مگر اقبالؒ کے درویش کی پرواز اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ اس کے نزدیک کوئی محبوب نہیں سوائے اللہ کے، کوئی مقصود نہیں سوائے اللہ کے، کوئی مطلوب نہیں سوائے اللہ کے، حتیٰ کہ کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے!

یہ عشق میں ڈوبے لوگ ہیں۔ ہر وہ چیز کہ جو آپ کے اور اللہ کے درمیان آ جائے، اللہ کے مقابلے میں محبوب بن جائے، مطلوب بن جائے، مقصود بن جائے، معبود بن جائے، تو اسے ہی شرک کہتے ہیں۔ اور جب ایک مسلمان انفس اور آفاق کے ہر طاغوت کا کفر کرتا ہے، اور اللہ پر ایمان لاتا ہے، تو اسکے بعد اسکا تعلق اللہ کے رسول ﷺ سے اس طرح قائم ہوتا ہے، وہ عروۃ الوثقیٰ ﷺ کو اس مضبوطی سے تھام لیتا ہے، کہ اب یہ رشتہ ٹوٹنے والا نہیں ہوتا۔ اس مقام پر بندۂ مومن کی خواہش اور تدبیر اسکی تقدیر بننا شروع ہو جاتی ہے۔

تو مسلماں ہے تو تقدیر ہے تدبیر تیری

یہ جوابِ شکوہ کی سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز جہت ہے، اور ہم اس پر آگے بھی تفصیل سے بات کریں گے کہ تقدیر ہے کیا چیز؟ اور اقبالؒ کے ہاں تقدیر کا کیا تصور ہے؟ وہ کونسا مقام ہے کہ جب اللہ کا ایک بندہ، اللہ پر کسی بات کی قسم کھا لیتا ہے، تو اللہ کی غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ اپنے بندے کی قسم کو توڑ دے؟ وہ کونسا مقام ہے، کہ جب ہر تقدیر سے پہلے، خدا بندے سے خود پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ وہ کونسا مقام ہے، کہ جب بندۂ مومن کی دعا، لکھی ہوئی تقدیر تبدیل کر دیتی ہے؟ وہ کونسا مقام ہے، کہ جب نگاہِ مردِ مومن، لوگوں کے نصیب بدل ڈالتی ہے؟

بندۂ مومن کے اس حیرت انگیز مقام کو، اقبالؒ اتنے ہی غیر معمولی انداز سے بیان کرتے ہیں:

کی محمدﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ ادب رسولﷺ، عشق رسولﷺ، اطاعت رسولﷺ اور اتباع رسولﷺ کے بغیر ہی اللہ سے کوئی تعلق قائم کرسکتا ہے، تو یہ اسکی شدید غلط فہمی ہے۔ اللہ سے براہ راست کوئی تعلق قابل قبول نہیں ہے، کہ اگر اس میں وفاداری ء رسولﷺ شامل نہ ہو۔ اللہ سے محبت کا دعویٰ بے معنی ہے، اگر کسی مومن کیلئے رسولﷺ کی ذات، اسکی اپنی جان، مال، عزت وآبرو اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیﷺ کو فرمایا ہے، کہ جسکا مفہوم ہے کہ، امت سے کہہ دیجیئے کہ اگر آپ اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، تو میری اتباع (محبت واطاعت وعشق) کریں، اللہ آپ سے محبت کرنے لگے گا۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جب وفاداری ء رسولﷺ کمال پر پہنچتی ہے، تو اس کے بعد بندۂ مومن اپنے رب کا اتنا محبوب بن جاتا ہے کہ پھر صرف حکومت ہی کیا، کائنات ہی کیا، لوح محفوظ اور قلم اعلیٰ بھی اس کی دسترس میں آجاتے ہیں۔ وہ تقدیر ساز بھی ہوتا ہے اور تاریخ ساز بھی۔ وہ تقدیر کا پابند نہیں رہتا، کہ وہ خود تقدیر یزداں بن چکا ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے اس تصور کے راسخ ہونے کے بعد ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی مسلمان مایوس ہوسکے، کوئی مسلمان ملت زوال پذیر ہوسکے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اس سے زیادہ متحرک تصور اور انقلابی عقیدہ، کسی اور مذہب یا فلسفے میں نہیں ہے، کہ انسان خود ہی تقدیر ساز ہے، خود ہی کار آفریں، خود ہی کارکشا ہے، اور خود ہی کارساز بھی۔ بندۂ مومن جو فیصلہ کرے گا، اس کا رب وہی اسکی تقدیر لکھ دے گا، اور بندے کو یہ اختیار ہوگا کہ اس تقدیر کو اپنی تدبیر سے نافذ کرے، اور جب چاہے دعا سے اسے تبدیل کروالے۔

اگر ہم محمدﷺ سے وفاداری کی شرط پر پورے اترتے ہیں، تو آج ہم بھی جو خواہش کریں گے، جو تقدیر چاہیں گے، وہ لکھ بھی سکتے ہیں، لکھوا بھی سکتے ہیں، بدلوا بھی سکتے ہیں، اور نافذ بھی کرسکتے ہیں۔ اگر آج ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمیں بھارت پر قبضہ کرنا ہے، غزوہ ء ہند میں شریک ہونا ہے اور ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے ہیں، تو یہ بندۂ مومن کیلئے کیوں ممکن نہیں؟ اگر آج ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں خلافت راشدہ کا نظام نافذ کریں گے، تو یہ کیوں ممکن نہیں؟ اگر آج ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مسلمان امت کو اکٹھا کر کے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو دوبارہ قائم کریں گے، تو کیوں ہمارا رب ہمیں یہ عطا نہیں کرے گا؟

اس تقدیر کو حاصل کرنے کیلئے ہمیں شرط وفاداری ء مصطفیٰﷺ بھی پوری کرنی ہے، کہ جو اصل ایماں ہے۔ تدبیر بھی کرنی ہے، عقل اور

عشق کا توازن بھی قائم کرنا ہے، مرد مومن کا یقین بھی پیدا کرنا ہے، اور اس ہوس سے بھی بچنا ہے کہ جو سینوں میں چھپ چھپ کر تصویریں بناتی ہے۔ بے شک سفر دشوار اور طویل ہے، مگر یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی تلواروں سے لیس، جہاد زندگانی کا یہ قافلہ اپنی منزل تک پہنچے گا، ان شاء اللہ۔

آج ہمیں قیادت کا فقدان بھی درپیش ہے، نظریے کا بھی اور یقین کا بھی۔ قوم اور اسکے حکمران یقین سے محروم، مغلوب گماں ہیں۔ نہ نرم دم گفتگو ہیں، نہ گرم دم جستجو، نہ پاک دل ہیں اور نہ ہی پاکباز۔ مگر جب اللہ کرم فرماتا ہے تو قوم کی تقدیر بدلنے والا، کوئی بھی آ سکتا ہے، کہ:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ہر مسلمان، ہر بندہء مومن تقدیر ساز ہوسکتا ہے، کہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا نہ ہو، کہ جو انتظار نہ کرے کہ کوئی اور آ کے ملت کی حالت تبدیل کرے گا۔ اسکا اپنے رب کے ساتھ ایک خاص تعلق ہو، اور اسکی ایک ضرب کرتی ہو کار سپاہ، اور اس کا اپنے مقصد پر یقین، اندھیری رات میں پورے قافلے کیلئے چراغ راہ ہو، اور اسکی اذان شبستان وجود کو بھی لرزائے، ایسے ہی مرد مومن کا یقین، پوری غلام قوم کی زنجیریں کاٹ ڈالتا ہے۔

جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی

۱۲

نکلی تو لب اقبال سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا

ہم اب اقبالؒ کے فلسفے کے جس مقام پر آ چکے ہیں، یہاں سے اب کلیتاً روحانی جہت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کتاب کو ہم نے ایک غیر معمولی عنوان دیا ہے، ''اقبال پراسرار''۔ بلاشبہ اقبالؒ ایک پراسرار وجود ہیں۔ اقبالؒ کی شخصیت میں اتنی جہتیں ہیں، کہ جب انسان ان کا احاطہ کرنا شروع کرتا ہے، تو دنگ رہ جاتا ہے۔ جغرافیائی سیاست کا تجزیہ کار، مفکر، ماہر عمرانیات، فلسفی، تاریخ دان، اللہ کا ولی، شاعر، ماہر لسانیات، یہ تمام جہتیں ایک وجود میں مجتمع تھیں۔ حقیقت بھی یہی ہے، کہ اقبالؒ نے جو باتیں بھی اپنے کلام میں کہی ہیں، وہ صرف علم، مشاہدے یا ایمان بالغیب کی بنیاد پر نہیں کہیں، وہ یقین کے درجے پر فائز تھے۔ ان کو علم الیقین بھی تھا، عین الیقین بھی اور حق الیقین بھی۔ وہ ان تمام روحانی کیفیات سے خود گزر چکے تھے۔ اقبالؒ کی شخصیت کی یہ جہتیں اتنی غیر معمولی، اتنی پراسرار ہیں، کہ ہم چاہیں گے کہ اقبالؒ کی ذاتی زندگی کے ان تمام پہلوؤں سے بھی پردہ اٹھایا جائے، کہ جن کے نتیجے میں سیالکوٹ میں پیدا ہونے والا ایک بچہ ''اقبالؒ'' بنا۔

ہمارے جس بزرگ نے بھی تاریخ رقم کی، غیر معمولی روحانی وجود تھے۔ ان کا حضورﷺ سے ایک ذاتی تعلق تھا۔ اقبالؒ کی تمام شاعری اور ان کی ذاتی زندگی میں، ہمیں یہ پہلو اس پر زور انداز میں نظر آتا ہے، کہ ہم چاہیں گے کہ اس پر کچھ مزید بات کریں۔ ہم کوئی بات بھی اپنی طرف سے ایجاد نہیں کریں گے، بلکہ کلام اقبال کی تشریح ہوگی۔ اقبالؒ کے بارے میں جن لوگوں نے لکھا ہے اور قابل اعتماد ذرائع سے لکھا ہے، ہم صرف ان کو بیان کریں گے۔ بلاشبہ یہ حساس باتیں ہیں، کیونکہ روحانی جہت عقل سے بالا ہوتی ہے۔ یہ عشق اور قلب کی

دنیا ہے۔ جب تک انسان خود معرفت کے اس سفر سے، طریقت کے ان مراحل اور روحانیت کے ان درجات سے نہ گزرے، تو محض عقل و دانش کی بنیاد پر ان کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اسی لیے اقبالؒ نے عقل اور عشق کی جہتوں کو الگ الگ بیان کیا ہے، اور انکی مختلف حدود کا تعین کیا ہے۔ اقبالؒ حضور ﷺ سے روحانی تعلق پر بار بار زور دیتے ہیں۔

کسی یکجائی سے اب عہد غلامی کرلو
ملت احمد مرسل ﷺ کو مقامی کرلو

پھر اقبالؒ کی وہ خوبصورت نعت، کہ جو عشق کی انتہا ہے، حضور ﷺ سے انکے گہرے روحانی تعلق کی دلیل ہے۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

....

حضور ﷺ سے اسی غیر معمولی ''عشق و مستی'' اور ادب کے تعلق کے نتیجے میں اقبالؒ معرفت کے اس مقام پر فائز ہوئے، کہ جہاں بڑے بڑے اولیاء کے پر جلتے ہیں۔ سیدی رسول ﷺ کا ایسا تعارف شاید ہی کبھی اردو شاعری میں کسی نے بیان کیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ شعر عقل سے نہیں الہام سے اقبالؒ پر نازل ہوا ہے۔ دور جدید کے کئی علماء اور دانشور، اس شعر کو حمد سمجھتے ہیں، مگر درحقیقت یہ سیدی رسول اللہ ﷺ کی شان میں ایک حیرت انگیز قصیدہ ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

....

یہ سیدی رسول اللہ ﷺ سے انکا ایک غیر معمولی روحانی تعلق ہے، کہ جس کو ہم ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر ہم کلیات اقبال اٹھائیں، تو اس میں اقبالؒ، جنگ یرموک کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ جنگ یرموک، حضرت عمرؓ کے دور میں، شام میں لڑی جانے والی وہ جنگ تھی، کہ جس میں بازنطینی سلطنت کے خلاف، مسلمانوں کی قیادت، سیدنا خالد بن ولیدؓ اور ابوعبیدہ بن جراحؓ کر رہے تھے۔ تاریخ اسلام کی یہ ایک ایسی فیصلہ کن جنگ تھی، کہ جس نے نہ صرف ملک شام کو مسلمانوں کی سلطنت میں شامل کیا، بلکہ مشرق وسطیٰ سے رومی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ جس طرح جنگ قادسیہ نے سلطنت فارس کی کمر توڑی تھی، اسی طرح جنگ یرموک

مسلمانوں کیلئے، عیسائیوں کے خلاف، ایک فیصلہ کن اور خونریز معرکہ تھا۔

صف بستہ تھے عرب کے جوانان تیغ بند
تھی منتظر حنا کی عروس سرزمین شام

اقبالؒ جنگ شروع ہونے سے پہلے کا منظر بڑے رومانوی اور جذباتی انداز میں بیان کرتے ہیں، کہ عرب کے مجاہدین صف آراء تھے، اوراب شام کی سرزمین کوان کے سرخ خون سے مہندی لگنے والی تھی، یعنی سرزمین شام شہداء کے خون کی منتظر تھی۔

اک نوجوان صورت سیماب مضطرب
آ کر ہوا امیر عساکر سے ہم کلام

ایک نوجوان کہ جو بہت بے چین تھا، پارے کی مانند اس کی طبیعت میں اضطراب تھا۔ وہ آ کر مسلمانوں کے سپہ سالار سے مخاطب ہوتا ہے۔

اے ابو عبیدہؓ رخصت پیکار دے مجھے
لبریز ہوگیا مرے صبر و سکوں کا جام

ابوعبیدہؓ! اب مجھے اجازت دے دیں، اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

بیتاب ہو رہا ہوں فراق رسول ﷺ میں
اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے حرام

میں حضور ﷺ سے ملنے کیلئے سخت بے چین ہوں، اوراب رسول اللہ ﷺ کی جدائی مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب شہادت پاؤں اور حضور ﷺ کے قدموں میں پہنچ جاؤں۔

جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں
لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہے کوئی پیام

وہ مجاہد حضرت ابوعبیدہؓ سے مزید کہتا ہے، کہ اب تو میں سیدی رسول اللہ ﷺ کے دربار میں جارہا ہوں، اگر آپ مجھے سیدی ﷺ کیلئے کوئی پیغام دینا چاہیں، تو میں بخوشی لے جاؤں گا۔

یہ ذوق و شوق دیکھ کر پرنم ہوئی وہ آنکھ
جس کی نگاہ تھی صفت تیغ بے نیام

اس نو جوان کے حضور ﷺ سے وصال کے ذوق وشوق کو دیکھ کر، ابو عبیدہؓ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں، وہ آنکھیں کہ جن کی صرف جلال کی ایک نگاہ ہی، کفار کیلئے کاٹ دار تلوار کی طرح تھی۔ اس جلالی نگاہ سے بھی آنسوؤں کے قطرے ٹپکنے لگے۔

بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں ہے تو
پیروں پہ تیرے عشق کا واجب ہے احترام

اس پر سپہ سالار ابو عبیدہؓ نے اس نو جوان سے کہا، کہ بڑے بڑوں پر تیرے عشق رسول ﷺ کا احترام واجب ہے۔ ہم پر واجب ہے کہ تمہارا ادب کریں، کہ تم سیدی رسول اللہ ﷺ سے اس قدر دیوانہ وار پیار کرتے ہو۔

پوری کرے خدائے محمد ﷺ تیری مراد
کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام!

پھر حضرت ابو عبیدہؓ اس نو جوان کو دعا دیتے ہیں، کہ رب محمد ﷺ تیری شہادت کی آرزو کو پورا کرے، اور تیری اس عشق و مستی کا مقام واقعی بہت بلند ہے۔

پہنچے جو بارگاہ رسول امیں ﷺ میں تو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از اسلام

پھر حضرت ابو عبیدہؓ اس نو جوان کو پیغام دیتے ہیں، کہ جب تم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچو، تو پہلے میرا اسلام پیش کرنا۔

ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے
پورے ہوئے جو وعدے کیے تھے حضور ﷺ نے

پھر یہ پیغام پہنچانا کہ ہم پر، ہمارے غیرت والے رب نے، بہت کرم فرمایا ہے، اور سیدی آپ ﷺ نے جو وعدے بھی ہم سے کیے تھے، وہ سب کے سب پورے ہو چکے ہیں، ہم اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے راضی ہیں۔

کسی بھی شاعری میں، عشق رسول ﷺ کی ایسی مثالیں ممکن نہیں ہیں۔ اقبالؒ نے یہاں حد کر دی ہے عشق اور محبت کی! یہ تعلق کہ جو وہ اس نو جوان سے منسوب کر کے بتا رہے ہیں، یہ دراصل اقبالؒ کا اپنا ذاتی تعلق ہے۔ حضور ﷺ کے فراق میں، حضور ﷺ سے ملنے کی تڑپ میں، خود اقبالؒ کا بھی وہی حال ہے، کہ جس کو وہ اس بیتاب نو جوان کی کیفیت میں بیان کر رہے ہیں۔

ایک اور موقع پر اقبالؒ بڑے جذباتی انداز میں فرماتے ہیں:

اے باد صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

اقبالؒ ہوا کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ حضورﷺ کے پاس جا کر میرا ایک پیغام دے دینا، کہ آپ ﷺ کی امت کے ہاتھ سے دین بھی گیا اور دنیا بھی، یعنی سیدی رسول اللہ ﷺ کو خبر دے دو، کہ آج آپکی امت کس نازک حال میں ہے۔ اقبالؒ یہاں پر تاریخ اسلام کے ایک اور انتہائی جذباتی واقعے کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہیں کہ جس میں بھی ایک صحابیؓ نے شہادت سے قبل، ہوا کو مخاطب کر کے سیدی رسول اللہ ﷺ تک اپنا آخری پیغام بھجوایا تھا، اس وقت کہ جب کفار جمع ہو کر ان کو شہید کر رہے تھے۔ جس طرح حضرت خبیبؓ نے ہوا کو مخاطب کر کے اپنی بے بسی کا پیغام، سیدی رسول اللہ ﷺ تک پہنچایا تھا، اسی سنت پر، اقبالؒ نے بھی ہوا کو مخاطب کر کے سیدی رسول اللہ ﷺ تک امت کی بے بسی کا پیغام پہنچایا۔

ایک اور مقام پر، اقبالؒ حضورﷺ سے اپنے روحانی تعلق کو بیان کرتے ہیں، کہ جسے وہ اپنے وجود میں محسوس کرتے تھے، اور جس کی انہوں نے خود اشاروں کنایوں میں باتیں کی ہیں، کہ میرے وجود سے جو بات نکلتی ہے، یہ صرف ایک بشر کی آواز نہیں، یہ نازل ہونے والی روحانی قوتیں ہیں۔

نکلی تو لب اقبال سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

یہاں اقبالؒ واضح طور پر اس حقیقت کا انکشاف کر رہے ہیں، کہ وہ خود نہیں بولتے، انکو بلوایا جاتا ہے، انکے وجود کو استعمال کیا جاتا ہے، کوئی انکی زبان بن جاتا ہے کہ جس سے وہ بات کرتے ہیں، کوئی انکا ہاتھ بن جاتا ہے، کہ جس سے وہ لکھتے ہیں، تا کہ اس امت مرحوم کے زخموں پر مرہم رکھا جا سکے، اس کو بیدار کیا جا سکے، اسکے دکھوں کا مداوا کیا جا سکے۔

اب یہاں ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ کیا اقبالؒ کی ذاتی زندگی میں، کہ جن کا انہوں نے اپنی شاعری میں ذکر نہیں کیا، کوئی ایسے واقعات ہوئے ہیں، کہ جن سے ان کا حضورﷺ سے ایک غیر معمولی تعلق نظر آتا ہو؟

اقبالؒ کی سوانح عمری ان کے بیٹے جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' کے نام سے لکھی ہے۔ بہت ہی خوبصورت کتاب ہے۔ اس میں کئی ایسے واقعات ہیں کہ جو بہت ہی غیر معمولی ہیں۔ زندہ رود سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جس میں اقبالؒ کا وہ روحانی تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ جو انکا حضورﷺ کے دربار سے تھا۔ اقبالؒ تو حضورﷺ سے عشق اور پیار کرتے ہی ہیں، سوال تو یہ ہے کہ حضورﷺ کا اقبالؒ کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اقبالؒ کا حضورﷺ کی نگاہ مبارک میں کیا مقام ہے؟ یہ بہت نازک اور اہم نکتہ ہے۔ ہر شخص ہی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے حضورﷺ سے پیار ہے، لیکن اصل سند تو یہ ہے کہ خود حضورﷺ فرمائیں کہ وہ اس امتی سے پیار کرتے ہیں، خود حضورﷺ کی جانب سے منظوری آئے کہ یہ ہمارا عاشق ہے۔

زندہ رود میں واقعہ درج ہے۔ اقبالؒ خود اپنے والد کو ایک خط لکھتے ہیں کہ جس میں انہوں نے یہ پورا واقعہ بیان کیا۔ کیونکہ ان کے والد ان کے مرشد بھی تھے، اور انکا اپنے والد سے ایک خاص قلبی تعلق بھی تھا، وہ اپنے والد سے تمام روحانی تجربات اور قلبی کیفیات بیان کیا کرتے۔ فرماتے ہیں، کہ پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کیلئے آیا۔ اسکی عمر تقریباً تیس پینتیس برس ہوگی۔ شکل سے شرافت کے آثار نمایاں تھے۔ گفتگو سے ہوشیار، سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس سے پیشتر کہ مجھ سے گفتگو کرے، مجھے دیکھ کر رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی مصیبت زدہ ہے، مجھ سے کوئی مدد مانگنے آیا ہے۔ میں نے استفسار حال کیا تو کہنے لگا کہ، مجھے مدد کی ضرورت نہیں، مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے، میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی اور میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں۔ رونے کی وجہ خوشی ہے، نہ کہ غم۔ مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا کہ ''نوگام'' میں، کہ جو میرا گاؤں ہے، سری نگر کے قریب، میں نے عالم کشف میں حضور ﷺ کا دربار دیکھا۔ صفیں نماز کیلئے کھڑی ہوئی تھیں اور حضور ﷺ امامت کیلئے تیار تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا محمد اقبال آ گیا ہے؟ معلوم ہوا کہ وہ محفل میں نہیں ہیں۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کو بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی، کہ جس کی داڑھی منڈھی ہوئی ہے، اور رنگ گورا ہے، ان بزرگ کے ساتھ صف نماز میں داخل ہوا اور حضور ﷺ کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ جماعت کا آغاز کرتے ہیں۔ پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں اس کی شکل سے واقف نہ تھا، نہ نام معلوم تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ نجم الدین صاحب ہیں، ان کے پاس جا کر میں نے سارا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی۔ وہ آپ کو آپ کی تحریروں کی وجہ سے جانتے تھے، گو کہ انہوں نے بھی آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ کو ملوں گا، تو آپ سے ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا، اور اب آپ کو دیکھ کر بے اختیار روتا ہوں، اس لیے کہ میرے کشف کی تصدیق ہوگئی۔ اقبالؒ یہ واقعہ سن کر، بے چین ہو کر، رونے لگتے ہیں۔ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دربار سے ان کیلئے اتنی بڑی بشارت! حضور ﷺ کے دربار میں اقبالؒ کا یہ مقام، کہ جماعت روک لی گئی، کہ جب تک اقبالؒ اس میں شامل نہ ہوں۔ یہ واقعہ زندہ رود میں خود ان کے بیٹے نے تحریر کیا ہے۔
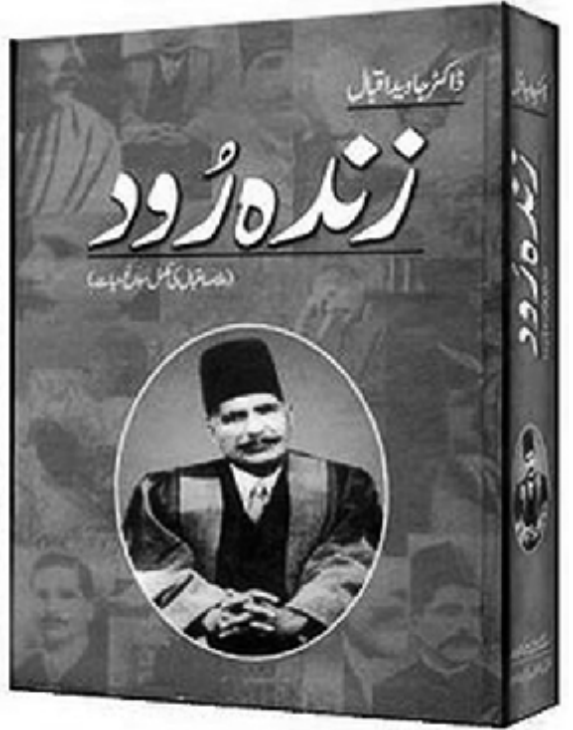
ایسے ایک نہیں، درجنوں واقعات ہیں۔ ظاہری طور پر اس وقت جو بزرگ حیات تھے، اور وہ اللہ کے ولی اور فقراء بھی کہ جو دنیا سے

جا چکے تھے، اکثر سے اقبالؒ کا روحانی تعلق تھا۔ اسی زندہ رود میں ایک اور بڑا خوبصورت واقعہ بیان ہوتا ہے۔

لاہور کے پاس ایک جگہ ہے، شرق پور شریف۔ جہاں حضرت شیر محمد شرقپوریؒ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ ایک مرتبہ اقبالؒ، حضرت شیر محمد شرقپوریؒ سے ملاقات کیلئے ان کی مسجد میں گئے۔ حضرت شیر محمد شرقپوریؒ صاحب شرع کے انتہائی پابند تھے۔ وہ کسی ایسے شخص سے نہیں ملتے تھے کہ جس کی داڑھی منڈھی ہو۔ علامہ اقبالؒ جب اس محفل میں گئے، تو ان سے کہا کہ میرے لیے دعا کیجیئے۔ حضرت شیر محمد شرقپوریؒ نے ان کو پہچانے بغیر ہی کہہ دیا کہ میں ایسے لوگوں کیلیئے دعا نہیں کرتا، کہ جو شریعت ترک کرتے ہوں۔ اقبالؒ اٹھ کر چلے گئے اور ابھی تانگہ سٹینڈ تک ہی پہنچے تھے، تو کسی نے حضرت شیر محمد شرقپوریؒ سے کہہ دیا کہ یہ اقبالؒ تھے۔ یہ سن کر حضرت شیر محمد شرقپوریؒ کی حالت عجیب ہوگئی۔ فوراً مسجد سے نکلے اور ننگے پاؤں ہی، عجلت میں، اقبالؒ کے پیچھے تانگے تک جا پہنچے۔ بے حد معذرت کی اور فرمایا کہ میں عام لوگوں کو تو داڑھی کی تاکید کرتا ہوں، لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص کیلیئے، کہ جس نے لاکھوں کروڑوں کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کر دی ہو، یہ پابندی شرط نہیں ہے۔ پھر علامہ اقبالؒ کو اپنے ساتھ لے گئے، اور ان کیلیئے بہت دعا کی۔ اس کے بعد، علامہ اقبالؒ اور حضرت شیر محمد شرقپوریؒ کا ایک گہرا قلبی تعلق قائم ہوگیا، اور جب تک دونوں حیات رہے، ان کا یہ تعلق قائم رہا۔ آج بھی جن بزرگوں نے یہ واقعات سنے اور دیکھے ہیں، وہ ان دونوں بزرگوں کے روحانی تعلق کی تصدیق کرتے ہیں۔

اسی طرح مولانا جلال الدین رومیؒ کیساتھ بھی اقبالؒ کا ایک خاص روحانی تعلق تھا۔ اقبالؒ ان کو ''پیر رومی'' اور اپنے آپ کو ''مرید ہندی''

کہتے تھے۔ اس تعلق کے حوالے سے بہت زیادہ شاعری کلیات اقبالؒ میں موجود ہے۔

جو شخص بھی اس دنیا میں امت اور ملت کے لیے عطا کی گئی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے، اسکا حضور ﷺ سے ایک ذاتی روحانی تعلق لازماً قائم ہوتا ہے۔ خواہ وہ نورالدین زنگیؒ ہوں کہ جن کو حضور ﷺ خواب میں آکر حکم دیں، یا پھر علامہ اقبالؒ ہوں، کہ جن کی حاضری حضور ﷺ کی محفلوں میں ہوتی ہو۔

ہم یہاں ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہیں گے۔ ایک کتاب ''زیارت النبی ﷺ بحالت بیداری'' کے نام سے ہے، محمد عبدالمجید صدیقی ایڈووکیٹ اس کے مصنف ہیں اور یہ فیروز سنز کی چھپی ہوئی ہے۔ انتہائی غیر معمولی کتاب ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کی تاریخ میں، اس موضوع پر کوئی کتاب اس طریقے سے نہیں لکھی گئی، کہ جس میں انہوں نے پوری چودہ سو سال کی مسلم تاریخ کی بڑی بڑی کتابوں کے حوالے سے، زیارت النبی ﷺ کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں اقبالؒ کے حوالے سے بھی ایک غیر معمولی واقعہ درج ہے۔ اقبالؒ نے ایک خط خان محمد نیاز الدین خان مرحوم کو ۱۹۲۲ء میں تحریر کیا۔ اب ذرا دل تھام کر یہ خط پڑھیے گا، کہ اقبالؒ کیا لکھ رہے ہیں:
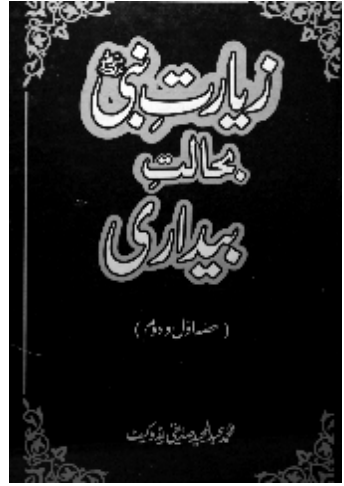
''حضور نبی کریم ﷺ کی زیارت مبارک ہو! اس زمانے میں یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ زندہ ہیں، اور اس زمانے کے لوگ بھی آپ ﷺ کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں کہ جس طرح صحابہ کرامؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں اس قسم کے اعتقاد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار گزرتا ہے، اس لیے خاموش رہتا ہوں۔''

یہ باتیں ہم اپنی طرف سے بیان نہیں کر رہے، بلکہ مستند کتابوں میں جو بیان شدہ واقعات ہیں، صرف ان کو رقم کر رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی نے اعتراض کرنا ہے، تو پیغام رساں پر نہ کرے بلکہ جا کر اقبالؒ سے بات کرے۔

کلام اقبالؒ مکمل نہیں ہوتا ہے کہ جب تک ہم اس حساس، نازک اور روحانی جہت کی بات نہ کریں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ مقام کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اقبالؒ نے کہا کہ حضور ﷺ سے تعلق قائم کرو۔ اقبالؒ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ سے آج بھی ویسا ہی روحانی تعلق قائم کیا جا سکتا ہے، کہ جیسا براہ راست صحابہ کرامؓ کا تھا۔ مگر یہ معاملہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کے لوازمات کیا ہیں؟

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

اقبالؒ اس مقام کو فقر کہتے ہیں، اور بندۂ مومن کو تاکید کرتے ہیں کہ اللہ سے فقیری طلب کرے۔ کہتے ہیں کہ بندہ ٔمومن کی امیری اسی

قونیہ (ترکی)، مولانا جلال الدین رومیؒ کا مقام

بات میں ہے، بندہ ءمومن، ہمسایہء جبرئیل امیں اسی بات سے بنتا ہے، کہ وہ اللہ سے فقیری مانگ لے۔ ہمارے معاشرے میں فقیر کا تصور ایک ایسے بندے کا ہے کہ جس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو، سڑکوں پر بھیک مانگنے والا ہو، کپڑے پھٹے ہوئے ہوں، کھانے پینے کو کچھ نہ ہو، فاقہ زدہ ہو۔لیکن اقبالؒ کی نظر میں فقیر وہ ہوتا ہے کہ جس کا دل فقیر ہو، جس کی نگاہ میں بادشاہی، سلطانی، قیصری، سکندری کی پر کاہ کے برابر بھی حیثیت نہ ہو، دنیا، جاہ وجلال، دولت، روپیہ پیسہ، عہدہ، صدارت، رتبے، گاڑیاں، جائیداد، اس کے جوتے کی ٹھوکر پہ ہوں، ایسا اللہ کا بندہ کہ جو اس قدر درویش ہو، اس قدر جلال اور جمال رکھتا ہو، اس قدر غنی ہو، کہ وقت کے ظالم و جابر حکمران تو کیا، کائنات اس کے آگے مسخر ہو۔

آگے فرماتے ہیں:

نہ مومن ہے، نہ مومن کی امیری
رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

امت کے زوال کی وجہ بھی وہ یہی بتاتے ہیں کہ جب بندۂ مومن کے ہاتھ سے اس کی فقیری گئی، تو ساتھ ہی اسکی امیری بھی گئی۔اب جو فقیر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ سیاہ کار بھی ہیں، بدعمل بھی، مردہ ضمیر بھی، نہ ان میں محبت ہے، نہ معرفت، نہ نگاہ۔

علامہ اقبالؒ فقر کی مزید تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

یہاں اقبالؒ ایک لطیف انداز میں فقیر اور بادشاہ کا فرق واضح کر رہے ہیں۔فرماتے ہیں، بادشاہ تو تلواروں کے ذریعے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں، قوت سے کرتے ہیں، طاقت سے کرتے ہیں۔مگر ایک فقیر صرف اپنی نگاہ سے، جلال سے، جمال سے، اور محبت سے لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔بادشاہوں کی حکومت جسموں پر اور فقراء کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔بادشاہ تلواروں سے ملک فتح کرتے ہیں، فقیر اپنی نگاہوں سے حکمرانی کرتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں اسکی بے شمار مثالیں ہیں۔شہاب الدین غوریؒ، کہ جو ایک افغان مجاہد اور بادشاہ تھے، کہ جنہوں نے ہندو بادشاہ پرتھوی راج کے ساتھ پانی پت کے میدان میں ایک خونریز جنگ لڑی تھی، اور دہلی پر پہلی اسلامی حکومت قائم کی۔اتنے بڑے ہندو بادشاہ کو ایک خوفناک جنگ میں شکست دینے کے بعد، شہاب الدین غوریؒ انتہائی ادب اور احترام کے ساتھ، حضرت معین الدین چشتیؒ کے پاس حاضر ہوتے ہیں، ہاتھ باندھ کر بیٹھتے ہیں، دعا کی درخواست کرتے ہیں اور مدد طلب کرتے ہیں۔یہی معین الدین چشتیؒ تھے، کہ جنہوں نے خواب میں آ کر شہاب الدین غوریؒ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت اور فتح کی خوشخبری دی تھی، اور اس سے پہلے، ہندو بادشاہ

پرتھوی راج کو بھی جلال میں آ کر، اس بات کی خبر دے دی تھی کہ اسکو زندہ گرفتار کر کے شہاب الدین غوریؒ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ جنگ کا نتیجہ وہی نکلا کہ جس کے بارے میں حضرت معین الدین چشتیؒ، پرتھوی راج اور شہاب الدین غوریؒ کو پہلے ہی خبر دے چکے تھے۔ پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ شہاب الدین غوریؒ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ جنگ کا فیصلہ اس کی تلوار نے نہیں، ایک فقیر کی نگاہ نے کیا ہے۔ تو بادشاہ کون ہوا، سپہ سالار یا فقیر؟

اسی طرح ایک انگریز نے بھی ملکہ کو خط لکھا تھا کہ ہندوستان پر اصل حکومت تو معین الدین چشتیؒ کی ہے۔

یاد رکھیے گا کہ جب اقبالؒ، بندہء مومن کی تعریف کرتے ہیں تو اسے بندہء مولا صفات کہتے ہیں، یعنی وہ اللہ کی صفات رکھتا ہے۔ بے نیازی اللہ کی صفت ہے، کہ جو وہ اپنے غیور بندوں کو تحفتاً عطا کرتا ہے۔ جب انسان اپنے رزق کے معاملے میں، اپنی جان کے معاملے میں، اپنی آبرو کے معاملے میں، اپنی دنیا کے معاملے میں، اپنی آخرت کے معاملے میں، اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، تو پھر اللہ اسے فقیری، درویشی اور بے نیازی عطا کرتا ہے۔ جب اللہ بے نیاز ہے، تو اس کے فقیر بندے بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

اقبالؒ کی نگاہ میں فقیر تو وہ ہوتا ہے کہ جو سکندر کی شان کو، قیصر کے جلال کو، کسریٰ کے زر و جواہر کو، اپنی ٹھوکروں پر رکھتا ہے۔ اس کا دل غنی و بے نیاز ہوتا ہے، چاہے خود فاقے کر رہا ہو۔ اس مقام سے پہلے اگر کسی انسان کو دنیا، مال دولت، حکومت اور اختیار دے دیا جائے، تو وہ تباہ ہو جائے گا۔ اقبالؒ کی نگاہ میں، حکمرانی کا حق بھی ایسے ہی فقیر کو ہے کہ جس کیلئے، تخت اور تختہ برابر ہوں۔ اسکی بے نیازی اس بات سے بے پرواہ ہو کہ وہ کسریٰ کے محلات رکھتا ہے یا بہلول کے گھروندے۔

جب حضرت عمرؓ کے دور میں مسلمانوں نے ایران کے بادشاہ کسریٰ کے محلات کو فتح کیا، تو اس قدر خزانے، ہیرے، جواہرات اور سونا نکلا، کہ جو کئی سو اونٹوں پر لادا جا سکتا تھا۔ یہ تمام خزانہ مدینہ منورہ میں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا گیا۔ خود حضرت عمرؓ اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے، اور فرمانے لگے کہ وہ فوج کتنی ایماندار ہے کہ جس نے ایک اشرفی کی خیانت کیے بغیر بھی، یہ خزانے بیت المال میں جمع کرا دیئے ہیں۔ ایک ہار تو اتنا قیمتی تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس سپاہی کو لایا جائے کہ جس نے اس ہار کو بیت المال میں جمع کرایا ہے۔ حضرت عمرؓ اسکی ایمانداری کی وجہ سے اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔ پھر تاریخ نے یہ منظر بھی دیکھا کہ وہ سپاہی، خلیفہء وقت سے اس حالت میں ملنے آیا کہ چہرے پر نقاب اوڑھ رکھا تھا اور خلیفہ سے کہتا ہے کہ آپؓ کے حکم کے مطابق حاضر ہو گیا ہوں، مگر اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا، کیونکہ میں نے یہ عمل صرف اللہ کی رضا کیلئے کیا ہے اور دنیا میں کوئی اجر اور انعام نہیں چاہتا۔ یہ ہے ایک مردِ مومن کی بے نیازی اور فقر۔

اسی طرح ایک اور خوبصورت واقعہ ہم یہاں تحریر کرنا چاہیں گے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو کسی نے اطلاع دی کہ آپکا

اجمیر شریف، حضرت معین الدینؒ چشتی کا مزار

بحری جہاز ڈوب گیا ہے۔تو آپ کہتے ہیں: ''الحمدللہ''۔کسی نے کچھ دن بعد پھر اطلاع کی کہ آپکا جہاز ڈوبا نہیں، بچ گیا ہے۔تو بھی کہتے ہیں: ''الحمدللہ''۔لوگوں نے اس پر کہا کہ یہ ''الحمدللہ'' تو سمجھ میں آ گیا، مگر پہلے والا ''الحمدللہ'' سمجھ میں نہیں آیا۔فرماتے ہیں کہ جب تم نے مجھے دنیا کے اتنے بڑے نقصان کی اطلاع دی، تو میں نے دل سے پوچھا: ''غم ہوا؟''، دل نے کہا: ''کوئی پرواہ نہیں۔'' میں نے کہا: ''الحمداللہ۔'' پھر جب دوبارہ مجھ سے کہا گیا، کہ آپکا جہاز بچ گیا ہے، تو میں نے دل سے پھر پوچھا: ''خوشی ہوئی؟''، دل نے کہا: ''کوئی پرواہ نہیں۔'' میں نے پھر کہا: ''الحمدللہ۔''

فقیر کے اسی جلال کو اقبالؒ آگے بیان کرتے ہیں کہ:

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

بڑے بڑے بادشاہوں کی جو شان و شوکت ہے، طاقت ہے، اختیار ہے، عسکری، معاشی اور سیاسی قوت ہے، وہ ایک فقیر کے سامنے دھیلے کی حیثیت نہیں رکھتی۔ جو جلال ایک فقیر کے دربار میں ہوتا ہے، بڑے بڑے بادشاہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

حضور ﷺ کے دربار کا حال بیان کرتے ہوئے بھی کفار نے یہی بات کہی تھی کہ ہم نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں، قیصر و کسریٰ کا جلال دیکھا ہے، لیکن جس طرح کا جلال و جمال ہم نے دربارِ رسالت میں دیکھا ہے، اسکی مثال ناممکن ہے۔

یہی بارگاہِ قلندر ہوتی ہے، یہی ایک درویش کے دربار کی شان ہے، چونکہ وہ خوددار ہوتا ہے، غیر تمند ہوتا ہے۔اقبالؒ نے اس سارے سفر کے آغاز کی بنیادی شرط ہی فقر، درویشی، غیرت اور خودداری بتائی ہے۔اسی فقر کے نتیجے میں حضور ﷺ سے ایک تعلق قائم ہونا شروع ہوتا ہے۔شان بے نیازی، اسی فقر سے پیدا ہوتی ہے، یعنی اس رزق سے موت اچھی، کہ جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی۔

اقبالؒ کھلا چیلنج دیتے ہیں کہ اگر ہمت ہے تو جاؤ، یہ مقام حاصل کرو۔ کیونکہ یہ دین بزدلوں، بے غیرتوں اور بے شرموں کا نہیں ہے، یہ دین خودداروں، غیرتمندوں اور شاہین ہائے شہہ لولاک ﷺ کا ہے۔اقبالؒ اسی بات پہ بار بار زور دیتے ہیں کہ اگر تم یہ مقام حاصل نہیں کر سکتے، تو پھر اپنی بدنصیبی کا رونا مت رو، کیونکہ تم خود اپنے زوال کے ذمہ دار ہو۔اللہ سے شکوے شکایت نہ کرو، تمہیں راستہ بتا دیا گیا ہے۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

کیونکہ ایک قلندر ساری دنیا کا ہی نہیں، ساری کائنات کا احتساب کرتا ہے۔اس کی پرواز فرش سے عرش تک ہوتی ہے، سدرۃ المنتہیٰ صرف اس کیلئے ایک نشان منزل ہوتی ہے، وہ ہمسایہء جبرئیل امیں ہوتا ہے، زمین و آسمان و کرسی و عرش، اسکی زد میں ہوتے ہیں، وہ تقدیر کا پابند نہیں ہوتا، وہ زمانے کے پیچھے نہیں چلتا، زمانے کو اپنے پیچھے چلاتا ہے۔

صوفی برکت علی صاحبؒ
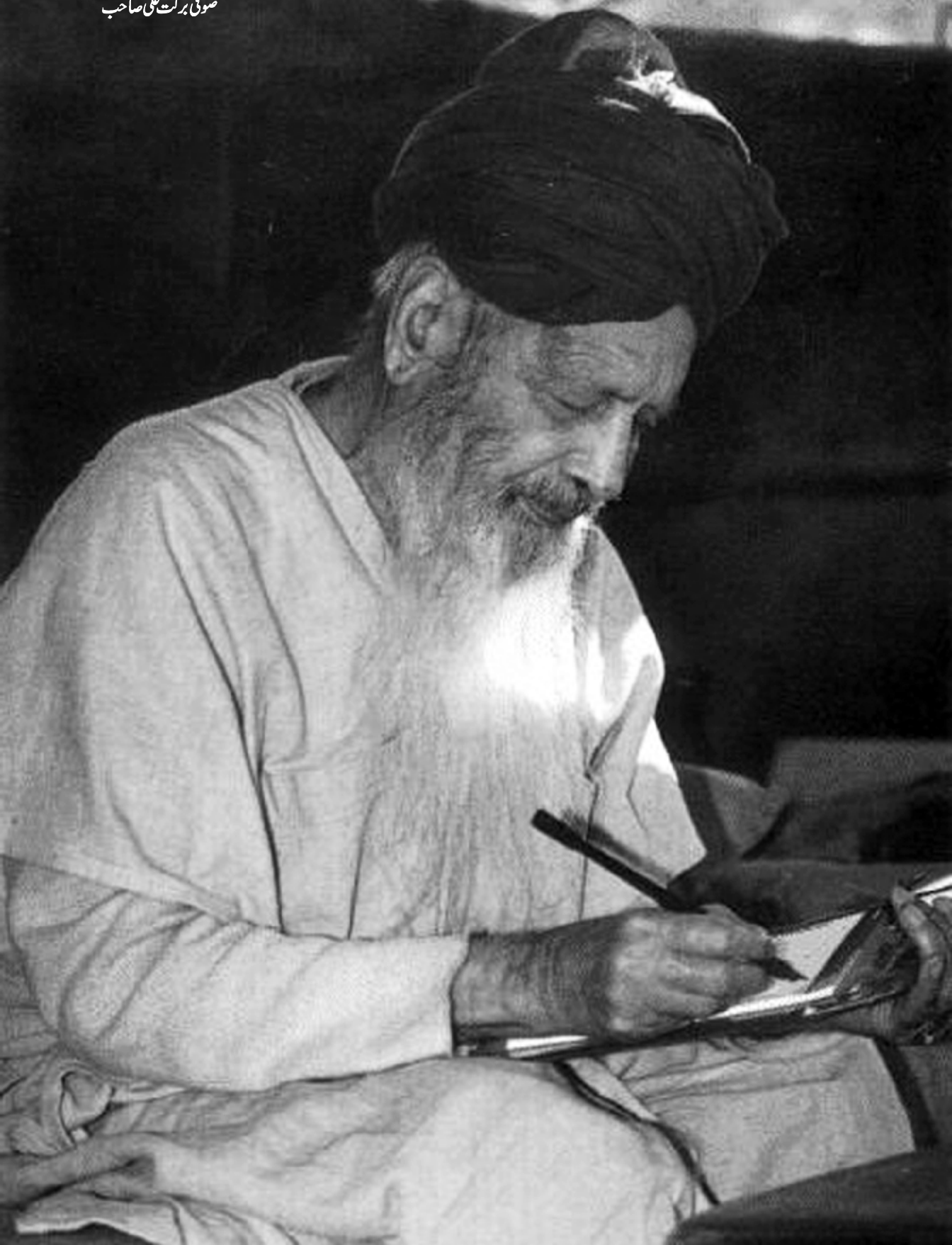
پھر آگے بات کو بالکل ہی واضح کر دیتے ہیں کہ:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

اقبالؒ نے یہاں اس حقیقت کا راز اٹھا دیا ہے، کہ اصل میں فقراء اور انکی روحانی دنیا ہی ہے کہ جو اس ظاہری دنیا کے نظام کو چلاتی ہے۔ روحانی طاقتیں اور قوتیں ہی اس دنیا کی ظاہری سیاست، حکومت اور اقتدار کے فیصلے کرتی ہیں اور ان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

حضور ﷺ نے سراقہؓ کو ہجرت کے وقت ہی یہ بشارت دے دی تھی کہ قیصر و کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے، یعنی چند ہی سالوں میں مسلمان رومی اور ایرانی سلطنتوں کو روندتے ہوئے نکل جائیں گے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ اپنے تکوینی اور روحانی اختیار سے ہی ہندوستان فتح کروا دیتے ہیں، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، صرف روحانی طاقتوں سے ہی سلطان تغلق کا تختہ الٹ دیتے ہیں، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہی، طاقتور عباسی خلیفہ کی موجودگی کے باوجود، بغداد کے اصل حکمران تھے۔

آج پاکستان کے حالات پر نگاہ ڈالیے۔ ہمارے حکمران، کہ جن کے پاس اختیار، مال و دولت، طاقت سب کچھ ہے، لیکن ہر لمحے رسوا ہوتے ہیں۔ قوم بھی انکو گالیاں دیتی ہے اور وہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے بھی دشمن ہیں۔ دنیا میں بھی خجالت، آخرت میں بھی رسوائی۔

اس کے برعکس آج بھی، اللہ کے کتنے بندے اور فقیر ہیں، کہ جو ظاہراً ایک چھوٹی سی کٹیا میں، غربت وافلاس میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر فقر کی دولت رکھتے ہیں، قناعت سے مالا مال ہیں، عطا کرنے والے ہیں، فیض تقسیم کرنے والے ہیں۔ اگر وہ اللہ پر کسی بات کی قسم کھا لیں، تو اللہ کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ انکی قسم کو توڑ دے۔ آج بھی بڑے بڑے بادشاہ اور حکمران ان کے پاس آ کر جوتیاں سیدھی کرتے ہیں، دعائیں کرواتے ہیں، اور ان کے جلال سے کانپتے ہیں۔

آئندہ ابواب میں ہم بندۂ مومن کی صفات پر بات کریں گے، کیونکہ جب کوئی شخص فقر کا راستہ اختیار کرتا ہے، تو پھر بندۂ مومن میں کیا صفات پیدا ہوتی ہیں، اس پر بھی اقبالؒ نے تفصیل سے بات کی ہے۔ اور اس جہت کو سمجھنے کے بعد ہم فلسفۂ خودی کی طرف جائیں گے کہ جو حقیقت انسانیہ کے حوالے سے، انسان کو اسکی معراج کی طرف لیکر جاتا ہے۔ فلسفۂ خودی ہی، اقبالؒ کی سوچ کا نقطۂ پرکار ہے۔ ہم یہ ساری تیاری ''خودی'' کی وضاحت کیلئے ہی کروا رہے ہیں۔

سپین، اقبالؒ مسجد قرطبہ میں

۱۳
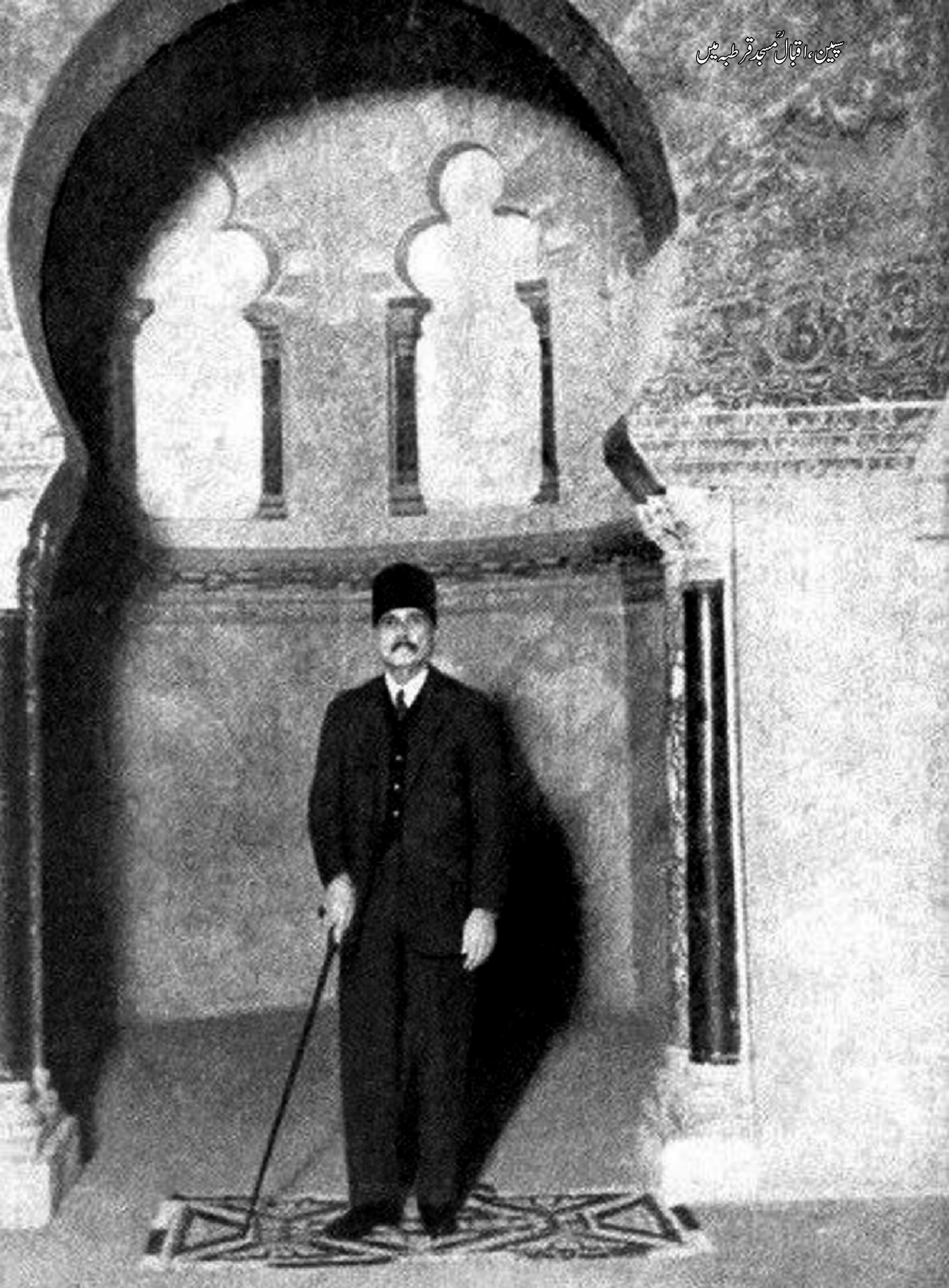
وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل!

اقبالؒ جو بندہ ءمومن کی صفات بتاتے ہیں، وہ اتنی غیر معمولی ہیں، کہ اگر ان سب کے مجموعے کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو جرمن فلسفی نطشے کی اصطلاح "Super Man" یا عبدالکریم الجیلی کی اصطلاح ''انسان کامل'' سے ہی ممکن ہوگا، یعنی ایک ایسا پراسرار وجود، کہ جس میں ایسی غیر معمولی ظاہری و باطنی قوتیں پوشیدہ ہوں، کہ وہ ایک ہستی ءفوق الادراک محسوس ہو۔ گو کہ اقبالؒ نے بھی ''انسان کامل'' کی اصطلاح استعمال کی ہے، لیکن ایسے پراسرار وجود کیلئے اقبالؒ، بندۂ مومن، مردِ آزاد، مردِ قلندر، درویش خدا مست، شاہین، مرد خودآگاہ، فقرِ غیور......جیسی اصطلاحیں بھی استعمال کرتے ہیں۔

سیدنا خالد بن ولیدؓ معمولی سی فوج کے ساتھ ایرانی اور رومی سلطنتوں کو اڑا کے رکھ دیتے ہیں، طارق بن زیادؒ صرف بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ، اپنی کشتیاں جلانے کے بعد، دوسرے براعظم کا ایک ملک فتح کر لیتے ہیں، صلاح الدین ایوبیؒ برسوں تک بے سروسامانی کے عالم میں، پورے یورپ کے عظیم الشان لشکروں کو روک کر بھی رکھتے ہیں، اور شکست بھی دیتے ہیں، سلطان محمد فاتحؒ صرف ایک رات میں، خشکی پر چھ میل تک، بحری جہاز گھسیٹتے ہوئے لے جاتے ہیں، اور قسطنطنیہ کا شہر فتح کر لیتے ہیں۔ تو یقیناً یہ ایسے مولا صفات وجود ہیں کہ جو حقیقی معنوں میں اقبالؒ کے بندۂ مومن کی زندہ مثالیں ہیں، کہ جو ہمیں اسلامی تاریخ میں جا بجا ملتی ہیں۔

اقبالؒ کی ایک بڑی خوبصورت نظم ہے، ''مردمسلمان''، کہ جس میں اقبالؒ اللہ کے سچے بندے کی تعریف بیان کرتے ہیں، کہ اس کی صفات کیا ہیں؟ مسلمان کہتے کس کو ہیں؟ آج بھی تو ہم دنیا میں مسلمان دیکھ رہے ہیں، لیکن وہ ذلیل ورسوا کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ کیا وجہ ہے کہ مسلمان اس قدر منتشر ہیں، کہ ان کا نہ اپنے رب سے تعلق ہے، نہ اپنے رسول ﷺ سے، اور نہ ہی اپنی روحانی میراث سے، کہ جس سے وہ دنیا میں کوئی تبدیلی لاسکیں؟

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایہ جبرئیل امینؑ بندہء خاکی
ہے اسکا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن
بنتے ہیں میری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبالؒ یہاں بندہ ءمومن کی غیر معمولی صفات بتا رہے ہیں، گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان، یعنی اس بندے کو دیکھ کر انسان قسم کھا کر کہہ سکتا ہے، کہ اللہ وجود رکھتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ سچے ہیں اور اگر کسی انسان کا یہ کردار ہوسکتا ہے، تو پھر میں بھی مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ بندۂ مومن کا اخلاق اور کردار ہی، توحید اور رسالت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

ہمارے بزرگوں نے اسلام اسی طرح اپنے کردار سے پھیلایا تھا۔ انڈونیشیا میں تو مسلمانوں کی کوئی فوج نہیں گئی، مگر آج انڈونیشیا

مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے۔ وہاں صرف مسلمان تاجر گئے تھے، کہ جنہوں نے اپنے کردار اور اخلاق سے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ لاکھوں مسلمان ہو گئے۔ مسلمان کے وجود کو دیکھ کر، اگر کوئی شخص اللہ پر گواہی نہ دے، تو اسکا مطلب ہے کہ اس مسلمان کے ایمان میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ اس نے وہ کردار حاصل ہی نہیں کیا کہ جس کے باعث:

همسایهٔ جبرئیل امینؑ بندهٔ خاکی

ایک بندۂ خاکی کو اقبالؒ، جبرائیل امینؑ کا ہمسایہ کہہ رہے ہیں۔ ایک بندۂ مومن کا مقام اور اسکی پرواز اس قدر بلند ہے کہ جبرئیل امینؑ بھی اس کا ہم رکاب ہونے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ جبرئیل امینؑ تو پھر سدرۃ المنتہیٰ پر رک جاتے ہیں، مگر یہ بندۂ خاکی یہ اختیار بھی رکھتا ہے کہ اس سرحد کو بھی پار کر جائے۔

ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

قرآن میں اللہ اپنے نور کی مثال اس طرح دیتا ہے کہ وہ نا شرقی ہے، نہ غربی۔ اسی طرح اللہ کا بندہ بھی نہ مشرق کا ہوتا ہے، نہ مغرب کا، وہ صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ وہ خاکی ہوتے ہوئے بھی، قدوسی ہوتا ہے، خاک سے آزاد ہوتا ہے۔ یہاں اشارہ، اسکی روحانی پرواز کے ساتھ ساتھ، اسکی ظاہری قومیت کی طرف بھی ہے، کہ بندۂ مومن انفس اور آفاق میں، کسی ایک مقام کا پابند نہیں ہوتا۔

تو ابھی راہ گزر میں ہے، قید مقام سے گزر

مصر و حجاز سے گزر، فارس و شام سے گزر

بندۂ مومن کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ تیری روحانی منزلیں اس وقت تک طے نہ ہو سکیں گی، تیری پرواز اس وقت تک بلند نہ ہو سکے گی، کہ جب تک کہ تُو تعصّبات، قومیت اور مقام کی قید میں ہے۔

خود اقبالؒ کی اپنی قبر پر جو کتبہ لگا ہے، وہ ان کے اس آفاقی تصور کی نمائندگی کرتا ہے کہ بندۂ مومن نہ انفس میں قید ہو سکتا ہے، نہ آفاق میں، اور اسکی پرواز خاک سے لیکر ثریا تک، زمین سے لیکر عرش تک، زمان و مکان سے آزاد ہے۔

نه افغانیم و نی ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
که ما پروردهٔ یک نو بهاریم

میں نہ افغان ہوں، نہ ترک، نہ تاتار۔ میں اس چمن (امت رسول ﷺ) کی پیداوار ہوں، اور اس کی ایک شاخ ہوں۔ مجھ پر رنگ و نسل

مسلمان تاجر، دین کے سب سے بڑے مبلغ

کا امتیاز حرام ہے، کہ میں ایک بہارِ تازہ کی علامت ہوں۔

....

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہاں اقبالؒ حکمت قرآن کا بہت بڑا راز، اپنے اس حیرت انگیز شعر میں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ان کا اشارہ سورۃ الرحمٰن کی اولین آیات کی طرف ہے۔سورہ رحمٰن شروع ہوتی ہے،''**الرحمن . علم القرآن. خلق الانسان. اللھم البیان** ۔''ان آیتوں کی ترتیب دیکھیئے۔''رحمٰن وہ ہے کہ جس نے انسان کو قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اسکو بولنا سکھایا''۔یعنی انسان کو قرآن پہلے سکھایا گیا، پھراس کو پیدا کیا گیا، پھراس کو بولنا سکھایا گیا۔

اقبالؒ واضح کرتے ہیں کہ انسان کو تخلیق کرنے سے پہلے، اسکے جوہر میں، اسکے وجود میں کہ جب اللہ نے کہا کہ:''**نفخت فیه من روحی**''، ''میں نے اس میں اپنی روح سے پھونکا''، اسی وقت انسان کو قرآن کا نور بھی دے دیا گیا تھا۔جس کو اقبالؒ کہتے ہیں کہ ظاہر میں زبان سے تو وہ قرآن کی تلاوت کرر ہا ہے،لیکن اس کے قلب میں قرآن کا جوہر موجود ہے۔ ہر انسان اپنے اندر قرآن کا نور رکھتا ہے۔ جو ہم ظاہر میں قرآن پڑھتے ہیں، یہ عکسی قرآن ہوتا ہے۔جو اصلی قرآن ہے، وہ تو ہمارے قلب میں ہے، ہمارے جوہر میں ہے۔ اقبالؒ بار بار اس کا حوالہ دیتے ہیں کہ:

آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمٰن

بندہء مومن اپنی صفت میں سورۃ رحمٰن کی طرح ہے۔اقبالؒ زور دے رہے ہیں کہ سورۃ رحمٰن کو دیکھو،تمہاری حقیقت کا راز تمہیں وہیں ملے گا۔

....

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے

دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

بندۂ مومن جب کوئی ارادہ کرتا ہے،تو درحقیقت یہ وہ خدا کا فیصلہ ہوتا ہے، کہ جواب ظاہر ہونے والا ہوتا ہے۔ بندۂ مومن کا وجود ہی معیار ہے یہ جانچنے کا کہ حق کس کی جانب ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اقبالؒ یہاں بھی اسی غیر معمولی پہلو کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں کہ:

کہتا ہے زمانے سے یہ درویش جواں مرد

جاتا ہے جدھر بندۂ حق، تو بھی ادھر جا!

یہ بات اچھی طرح جان لیں، کہ اگر اللہ کا ایک بندہ، پورے حق الیقین کے ساتھ، یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس نے دنیا تبدیل کرنی ہے، تو سمجھ جائیں کہ یہ فیصلہ اس اللہ کے بندے کا نہیں، خود اس کے رب کا ہوتا ہے، کہ صرف جس کا اظہار، اس مرد درویش کی زبان سے ہوتا ہے۔ اللہ اپنے محبوب بندوں کو وہ اختیار بھی دیتا ہے، کہ جو وہ فیصلہ کریں، جو ارادہ کر لیں، اللہ اسی پر منظوری کی مہر لگا دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب ایک بندہءمومن اللہ پر کسی بات پر قسم کھا لیتا ہے، تو پھر اللہ کی غیرت بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس فقیر کی بات رد کی جائے۔

یہاں اقبالؒ اس بہت بڑی حقیقت سے بھی پردہ اٹھا رہے ہیں کہ اللہ کے ایسے بندوں کی مخالفت حقیقت میں تقدیرِ الٰہی کی مخالفت ہے، اور ایسے فقراء کا اتباع، حقیقت میں اللہ کی رضا کا اتباع ہے۔ فتنوں کے دور میں، جب انسان کو راستہ سجھائی نہ دے رہا ہو، منزل واضح نہ ہو، راہ بھٹک چکی ہو، تو ایسے میں ایک بندۂ حق کی اطاعت، حقیقت میں رب کی اطاعت ہے۔ قرآن نے بھی سیدی رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے، اس حقیقت کو بہت کھول کر واضح کیا ہے کہ ''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی، تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

اقبالؒ اس بات کی سختی سے مخالفت کرتے ہیں، کہ ایک مردِ غلام کی اتباع کی جائے، اور غلام کے اجتہاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ، غلاموں کے اجتہاد سے بہتر ہے کہ ماضی کے مردِ آزاد کی تقلید کر لی جائے۔ اقبالؒ اجتہاد کیلئے شرط ہی یہ لگاتے ہیں کہ اجتہاد کرنے والا فقرِ غیور کا حامل مردِ آزاد ہو، ورنہ ہلاکت ہے۔

....

بنتے ہیں میری کارگہ فکر میں انجم

لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان

اقبالؒ کو اپنے وجود سے جاری ہونے والے فیض پر کوئی شک نہیں تھا۔ بڑے اعتماد سے یہاں فرماتے ہیں کہ امت کے نصیب اور تقدیر کو تبدیل کرنے کے راز اللہ نے ان پر ہی القاء کیے ہیں۔ اب یہ امت کا نصیب ہے کہ ان سے کس قدر فیض لیتے ہیں۔ امت کے مقدر کے ستارے، فطرت نے فکرِ اقبالؒ میں ہی رکھے ہیں۔

....

بندۂ مومن کی صفات، اقبالؒ کے پورے کلام میں، ہیرے موتیوں کی طرح، جڑی ہوئی ہیں۔ اب ہم یہاں پر مختلف اشعار لیکر اقبالؒ کے

بندۂ مومن کو مختصراً آشکار کرتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

یہ بظاہر تو تضاد نظر آتا ہے، لیکن فی الحقیقت ایک خوبصورت توازن ہے۔ قرآن نے جو بندۂ مومن کی صفت بتائی ہے، اقبالؒ کا یہ شعر اسی کی تشریح ہے: ''مومن آپس میں انتہائی رحیم، اور کفار پر شدید ہوتے ہیں''۔

....

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشا کش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

ایک بندۂ مومن ظاہری طور پر تو صرف ایک بشر نظر آتا ہے، مگر ''وجود حضرت انساں، نہ روح ہے نہ بدن''۔ مومن کا مقام، مقام معراج ہے، کہ جہاں تک پہنچنے کیلیئے وہ، ''زمین وآسماں وکرسی وعرش'' کی وسعتوں کو پار کرتا ہے۔

....

جچتے نہیں کنجشک و حمام اسکی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

ایک بندۂ مومن، کبوتروں اور پرندوں کا نہیں، جبرئیل وملائک کا شکاری ہوتا ہے، انکو اپنا ہم راز بناتا ہے، ہم خیال بناتا ہے۔ اقبالؒ تو اس کے مقام کے بارے میں یہاں تک فرماتے ہیں:

دردشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یعنی میرے جنون کے سامنے تو جبرئیلؑ بھی ایک چھوٹا شکار ہے، مرد کی ہمت اور طاقت تو اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ خود خدا پر کمند ڈالے، خدا کا راز دار ہو، ''ذات را بے پردہ دیدن......'' سے کم پر راضی نہ ہو۔

....

دیکھیں، مومن کی قوت کے بارے میں علامہؒ کیا فرماتے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہء مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز

یہ اس حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بندۂ مومن کا ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جب اللہ اس کا ہاتھ بن جاتا ہے، کہ جس سے وہ کام کرتا ہے، زبان بن جاتا ہے، کہ جس سے وہ بولتا ہے، کان بن جاتا ہے، کہ جس سے وہ سنتا ہے، غرضیکہ بندۂ مومن کا پورا وجود، رب الذوالجلال کی قدرت کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ اس کی ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کے جلال میں، اللہ کا جلال ہوتا ہے، اس کے جمال میں، اللہ کا جمال ہوتا ہے، اس کے ہاتھ پر بیعت، اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی ہے، اس کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔

....

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

....

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتہء لولاک

اقبالؒ یہاں پڑھنے والے کا وجود ہلا دیتے ہیں۔ صاف صاف فرماتے ہیں کہ کائنات کی حکمرانی کا حق صرف اس مومن جانباز کیلئے ہے، اس شیر اور دلیر کیلئے ہے، اس اسد اللہ و اسد الرسول ﷺ کیلئے ہے، اس سیف اللہ کیلئے ہے، کہ جس کا براہ راست رابطہ، تعلق، وصل، اور فیض سیدی رسول اللہ ﷺ سے ہو۔ اقبالؒ یہ دلیل دیتے ہیں کہ چونکہ یہ پوری کائنات سیدی رسول اللہ ﷺ کیلئے بنائی گئی ہے، اسی لیے یہ پوری کائنات ایک بندۂ مومن کا میدان عمل ہے، اس کی میراث ہے۔ بندۂ مومن کے مقام کی اتنی حیرت انگیز تفسیر اقبالؒ سے پہلے کوئی مسلمان فلسفی یا شاعر نہیں کر سکا۔

اقبالؒ اس شخص کو مومن مانتے ہی نہیں کہ جس کی روحانی نسبت سیدی رسول اللہ ﷺ سے نہ ہو۔ سیدی رسول اللہ ﷺ تک نہ پہنچنے کو ''بولہبی'' کہتے ہیں۔

بہ مصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

....

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

اقبالؒ یہاں اس ازلی ابدی حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ مومن کی طاقت کا راز اس کے ہتھیاروں میں نہیں، اسکے توکل میں ہے، اللہ پر بھروسے میں ہے، اسکے یقین میں ہے، اسکے ایمان میں ہے، اور اسکے اپنے رب سے اس تعلق میں ہے، کہ جب خود خدا اس سے پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے۔

تاریخ اسلام اٹھا کر دیکھ لیجیئے، آپ کو اقبالؒ کے اس شعر کی دلیلیں جا بجا بکھری ہوئی ملیں گی۔ شاید ہی کوئی موقع تاریخ میں ایسا آیا ہو، کہ جب مسلمانوں نے عددی برتری، عسکری قوت، یا وسائل کی کثرت کے باعث، دشمن پر غلبہ پایا ہو۔ ہمیشہ ہی مسلمانوں کی تعداد قلیل رہی ہے، وسائل محدود رہے ہیں، مال و زر کی کمی رہی ہے، ہتھیار کم تر رہے ہیں، مگر پھر بھی اپنے سے کئی گنا بڑی طاقتوں کو روندتے ہوئے نکل گئے۔ کفار کی تقدیروں کے فیصلے مسلمان کیا کرتے تھے، اور مسلمانوں کی تقدیروں کے فیصلے، خود ان کی وہ رضا تھی کہ جس پر ان کا رب مہر تصدیق ثبت کرتا تھا۔

ان ناقابل یقین فتوحات کی وجہ بھی، اقبالؒ ایک اور مقام پر بتاتے ہیں:

تو مرد میداں، تو میر لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی

بندۂ مومن کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب وہ میدان جنگ میں اترتا ہے، اور لشکر کی قیادت سنبھالتا ہے، تو صرف انسان ہی نہیں، کائنات کی تمام قوتیں اور فوجیں اس کے ہمراہ ہوتی ہیں، اسکے حکم کی تابع ہوتی ہیں۔ بندۂ مومن کا اختیار صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ ملائک و جنات و جمادات و نباتات، سب اس کے آگے مسخر ہوتے ہیں۔

خود قرآن پاک اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جنات حضور ﷺ کے پاس آکر قرآن سیکھا کرتے تھے۔ غزوۂ بدر میں ہزاروں ملائکہ نے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر کفار کا مقابلہ کیا۔ حضرت سلیمانؑ، ہوا، جنات اور جانوروں پر حکومت کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کے ایک درباری اتنا اختیار رکھتے تھے، کہ ملکہ صباء کا تخت پلک جھپکنے میں ہزاروں میل دور سے اٹھا لاتے ہیں، حالانکہ وہاں موجود ایک طاقتور جن بھی یہ کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اللہ ابابیلوں سے ابراہہ کے لشکر کو تباہ کروا دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ دریائے نیل کو خط لکھتے ہیں اور وہ ان کے حکم سے چلنے لگتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بپھرے ہوئے دریا کو حکم دے کر اپنی فوجیں دریا میں اتار دیتے ہیں، اور

دریاان کا بال بھی بیکا نہیں کرتا۔ سلطان محمد فاتحؒ خشکی پر چھ میل تک بحری جہاز گھسیٹے ہوئے لے جاتے ہیں اور قسطنطنیہ فتح کر لیتے ہیں۔ امام مالکؒ اپنی کتاب موطا امام مالک کو پانی میں ڈبو دیتے ہیں، مگر پانی ایک حرف کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ شمس تبریزؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ کی تمام کتابوں کو دریا میں ڈال دیتے ہیں، اور پھر اسی طرح خشک باہر نکال لیتے ہیں، اور جب ایک حیرت زدہ رومیؒ ان سے اسکا راز پوچھتے ہیں، تو شمس تبریزؒ بڑی بے نیازی سے ان کو ٹالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ایں علم تو نہ دانی''، یعنی یہ وہ علم ہے، یہ وہ راز ہے کہ جو آپ نہیں جانتے۔

یہ محض ماضی کی تاریخ کے واقعات نہیں ہیں، ہر دور کی زندہ و جاوید حقیقتیں ہیں۔ ہر دور کے مرد مومن جب بھی کائنات کی تسخیر کرتے ہیں، تو اللہ کی ساری مخلوق، چاہے نوری ہو کہ ناری، ان کی خدمت کیلئے حاضر ہوتی ہے۔ روحانی طاقتوں کے بغیر، صرف ظاہری وسائل کی بنیاد پر، مسلمانوں نے کبھی دنیا کی تسخیر نہیں کی۔

....

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

اقبالؒ یہاں بندۂ مومن کی ایک حیرت انگیز خصوصیت بیان فرما رہے ہیں۔ اللہ کا بندہ نہ تو کبھی مایوس ہوتا ہے، اور نہ ہی ریا کار، چاہے حالات کتنے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوں۔ وہ ''لاتقنطو من رحمت اللہ'' کی زندہ و جاوید تصویر ہوتا ہے، اور اپنی سچائی اور توکل کی بناء پر، حق بات کہنے میں، اس قدر جری اور بیباک ہوتا ہے کہ بڑے بڑے سے ظالم اور جابر بادشاہ کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ تاریخ اسلام ایسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب اللہ کے بندوں نے جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کیا، اس بات کے باوجود کہ وہ قتل کیے گئے، جلا وطن کیے گئے، آروں سے چیرے گئے، آگ میں جلائے گئے، کوئلوں میں گھسیٹے گئے، اور ان کو جان و مال و اولاد کے نقصانات اٹھانے پڑے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مرد مومن بے غیرت ہو، بے شرم ہو، سمجھوتہ کر جائے، اپنی عزت و آبرو بیچ دے، دین بیچ دے، ملک بیچ دے۔

....

جس کا ہے عمل بے غرض، اسکی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

اقبالؒ کی فکر کی بنیاد ہی عشق رسول ﷺ پر ہے۔ حضور ﷺ سے تعلق اس لیے قائم کرو کہ حضور ﷺ بذات خود اس قابل ہیں کہ ان پر جان و مال، عزت و آبرو کو قربان کیا جائے۔ **فداک ابی و امی یا رسول اللہ** ﷺ۔ صحابہ کرامؓ وارفتگی میں بار بار آپ ﷺ

سلطان محمد فاتحؒ، خشکی پر بحری جہاز گھسیٹتے ہوئے

سے مل کر فرماتے ہیں: ''یا رسول اللہ ﷺ آپ پر ہمارے ماں باپ قربان۔'' یہ وارفتگی اور ادب، اجر و ثواب اور جنت کیلئے نہیں تھا، یہ بے لوث عشق تھا۔

اصحاب الیمین جب عمل کرتے ہیں، تو جنت کی لالچ میں کرتے ہیں، اجر و ثواب کیلئے کرتے ہیں۔ لیکن جب ایک عاشق عمل کرتا ہے، تو اس کا مقصود صرف محبوب سے وصل ہوتا ہے، حضور ﷺ کا قرب و زیارت و دیدار ہوتا ہے۔ اسی لیے مقربون کا مقام اصحاب الیمین سے کہیں بلند ہے، اس بات کے باوجود، کہ دونوں جنتی ہیں۔ ایک نے جنت کیلئے عمل کیا، اور دوسرے نے جنت والے ﷺ کیلئے۔ یقیناً جو ہو عمل بے غرض، اسکی جزا اور ہے!

بندۂ مومن تو عشق رسول ﷺ میں اتنا ڈوبا ہوتا ہے، کہ جنت میں بھی، نہ فرشتوں کی پرواہ کرتا ہے، نہ حوروں کی:

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

رابعہ بصریؒ سے منسوب ایک واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ ہاتھوں میں آگ اور پانی لیکر جا رہی تھیں۔ جب لوگوں نے پوچھا کہ کہاں جاتی ہیں، تو فرمانے لگیں، کہ اس آگ سے اس جنت کو جلاؤں گی، کہ جس کی لالچ میں لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور اس پانی سے اس جہنم کو بجھاؤں گی، کہ جس کے خوف سے لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کے بندو! اللہ کی عبادت خوف اور لالچ کی وجہ سے نہیں، صرف اسکی محبت میں کرو۔

....

اقبالؒ کی نگاہ کو آپ اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے، کہ جب تک آپ مومن کی صفات اور خصوصیات کو نہ سمجھیں۔ بندۂ مومن کے مقام پر فائز ہوئے بغیر، یاد رکھیئے، کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی، تب بھی دین کو نافذ اور قائم نہیں کر سکتا۔ وہ اس قابل ہی نہیں ہوگا کہ اس ذمہ داری کو پورا کر سکے، نتیجتاً زمین میں فساد پھیلائے گا۔

اگر خلافت کا قیام کرنا ہے، امت مسلمہ کا احیاء کرنا ہے، مسلمانوں کو از سر نو عزت بخشنی ہے، مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے، مسلمانوں کا سیاسی، معاشی اور عسکری نظام قائم کرنا ہے، حکومت قائم کرنی ہے، جنگیں کرنی ہیں، امن قائم کرنا ہے، تو سب سے پہلی شرط، ایسی قیادت اور ایسی جماعت پیدا کرنا ہے کہ جو اقبالؒ کے مرد مومن ہوں۔ ورنہ وہی حال ہوگا کہ جو آج امت رسول ﷺ کا، اسکی سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور قیادتوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے، سیاسی و مذہبی فرقوں میں تقسیم، فتنہ گر، باہم دست و گریباں، کم فہم و کم عقل و جاہل لوگ۔

ایک غیر معمولی حدیث ہے، **الفقر فخری**، یعنی میرا فقر، میرا فخر ہے۔ سیدی رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی شان پر فخر نہیں فرمایا، سوائے فقر

کے۔سیدی رسول اللہ ﷺ کی اسی حدیث مبارکہ کو، اقبالؒ اپنے اس مصرعے میں استعمال فرماتے ہوئے کہتے ہیں، کہ بندۂ مومن کی بادشاہت میں بھی، سیدی رسول اللہ ﷺ کے فقر کی جھلک ہونی چاہیے۔

امارت کارہاشان 'الفقر فخری' سماں میں

فقر بندۂ مومن کا یہ احساس ہے، کہ وہ خود کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ اللہ ہی ہے، اللہ کا ہے، اللہ کی ہی عطا ہے، اسی کا دیا رزق ہے، اسی کے واسطے ہے، اور ہر شے نے اسی کی طرف واپس لوٹ کے جانا ہے۔اس احساس کے بعد کائنات کی کوئی شے نہ اس فقیر کو خوفزدہ کر سکتی ہے، نہ لالچ دے سکتی ہے، نہ ورغلا سکتی ہے۔پھر کائنات کا کوئی بھی ظاہری عہدہ اور اختیار، ایسے بندۂ مومن کو دنیا کے فتنے میں مبتلا نہیں کرتا۔اس مقام پر وہ اس قابل ہوتا ہے، کہ اللہ فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے، اس کا انتخاب کرے۔

گدائی میں بھی تھے وہ اللہ والے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

....

بندہءمومن کیلئے پہلی بنیادی شرط حضور ﷺ سے تعلق ہے۔اس تعلق کے نتیجے میں ہی وہ صفات پیدا ہونگی، اور پھر خود بخود راستے نکلیں گے۔قرآن کی حکمت ہے کہ''جو اللہ سے تقویٰ اور محبت کا راستہ اختیار کرتا ہے، اللہ اس کیلئے راستے نکالتا ہے، اور اسکو ایسی ایسی جگہوں سے رزق دیتا ہے کہ جس کا اس کو گمان بھی نہیں ہوتا''۔رزق صرف کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہوتیں، اللہ کا فضل بھی رزق ہے، علم و حکمت بھی رزق ہے، نور بصیرت بھی رزق ہے، ظاہری و باطنی روحانی طاقتیں بھی رزق ہیں، دعائیں بھی رزق ہیں، قبولیت بھی رزق ہے، اور قرب رسول ﷺ بھی رزق ہے۔اس روحانی رزق کی برکت سے ہی وہ میر کارواں پیدا ہوتا ہے، کہ جو نگاہ بلند بھی ہو، سخن دلنواز بھی اور جاں پرسوز بھی۔پھر اسکی ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے ہوتے ہیں، قوموں کی تقدیریں بدلتی ہیں، تاریخ لکھی جاتی ہیں، ستاروں پر کمندیں ڈالی جاتی ہیں، اور فرش سے عرش تک کا سفر کیا جاتا ہے۔

ایسے اللہ کے بندے اور فقیر حکمران، فطرت صرف تحفے میں امتوں کو عطا کرتی ہے، کہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

۱۴

خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

اب ہم علامہ اقبالؒ کے فلسفہءخودی پر آ چکے ہیں۔ اقبالؒ نے جو تصور، سوچ اور فکر، مسلم امت کو دی ہے، اسکا جوہر، اسکی روح، اسکی معراج، اس کا نچوڑ، فلسفہءخودی ہے۔ ایک بات ہم واضح کر دیں، کہ یہ ایک نازک اور حساس معاملہ ہے، اور اسکو سمجھنے کیلئے عقل نہیں، قلب چاہیے۔ علامہ اقبالؒ نے جو لفظ ''خودی'' استعمال کیا ہے، چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں، یہ اصطلاح اس سے پہلے اس طرح کبھی استعمال نہیں ہوئی۔ اقبالؒ پہلے مفکر، دانشور، فلسفی، صاحب بصیرت اور اللہ کے ولی ہیں کہ جنہوں نے خودی کی اصطلاح ان معنوں میں استعمال کی ہے، لہذا اس تصور کو سمجھنے کیلئے، آپکو ماضی میں کوئی تشریح نہیں ملے گی۔ اقبالؒ نے جس طرح اسکو بتایا ہے، ہمیں اسکو اسی طرح اقبالؒ ہی کے کلام سے سمجھنا ہوگا۔ ہم اقبالؒ کے کلام سے حوالے دیں گے، اسکی تشریح کرینگے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے، کہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں تصور خودی کی جو بات کی ہے، اسکی جہتیں کیا ہیں؟ اس کی معراج کیا ہے؟

اقبالؒ نے سب سے پہلے فارسی میں ''اسرار خودی'' اور اسکے بعد ''رموز بے خودی''، لکھی۔ یہ دونوں مثنویاں فلسفہءخودی کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی، اپنے تمام کلام میں، چاہے وہ اردو ہو یا فارسی، انہوں نے فلسفہءخودی کو کثرت سے بیان کیا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اقبالؒ کے فلسفہءخودی کو سمجھے بغیر ہم اقبالؒ کے کلام کی روح کو سمجھ سکیں۔

اسرار خودی میں تو انہوں نے اپنا پورا فلسفہ ہی مرتب کر دیا ہے۔ انہوں نے نئی نسل کیلئے، ایک ایسی راہ متعین کر دی ہے، ایک ایسی منزل کا نشان دیا ہے، کہ جس کو حاصل کیے بغیر، قوموں کا عروج ممکن نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ''خودی'' ہے کیا؟ اقبالؒ کے نزدیک خودی، انسان کے وجود میں، ایک ایسی غیر معمولی، مافوق الفطرت قدوسی طاقت ہے، کہ جو اگر بیدار ہو جائے ،تو:

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یعنی پوری کائنات انسان کے سامنے مسخر ہو جاتی ہے۔ اس غیر معمولی روحانی طاقت کی وجہ سے، کہ جو ہر بندہء مومن، ہر مسلمان کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے، انسان وہ مقام حاصل کرتا ہے کہ جو خلیفۃ اللہ فی الارض کا ہے۔ یہ وہ طاقت ہے کہ جس کی وجہ سے قہاری وغفاری وقدوسی وجبروت ،جیسی صفات الٰہیہ بندہء مومن میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ انسان کو نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز بنا دیتی ہے، اور انسان کے وجود میں ایسی قوت پیدا کرتی ہے کہ پھر ''نگاہ مردمومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''۔

بڑے بڑے دانشوروں اور فلسفیوں نے خودی کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ناکام رہے۔ جیسے کہ بات کہی گئی ہے کہ فلسفہء خودی کا تعلق، عقل سے نہیں، قلب سے ہے، علم سے نہیں، عشق سے ہے، اور یہ بات اقبالؒ بار بار واضح کر چکے ہیں کہ جو عشق کے معاملات ہوں، ان میں عقل سے دخل دینا ہلاکت ہے، جہالت ہے، ''عقل گو آستاں سے دور نہیں......اس کی تقدیر میں حضور نہیں!''

خودی کا ترجمہ صرف عزت نفس، یعنی "self respect" نہیں ہے۔ "ego" یعنی اناء بھی نہیں ہے، نہ تو یہ ''انائے محدود'' ہے، اور نہ ہی ''انائے مطلق''، جیسا کہ کئی دانشوروں نے عقل سے اس کی توجیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ خودی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے، کہ جس کا ترجمہ اگر صرف اناء یا عزت نفس کیا جائے ،تو پھر خودی کی زد میں ساری خدائی کیسے ہوگی؟ زمین وآسمان وکرسی وعرش، اسکے قابو میں کیسے آئیں گے؟ خودی کی جلوتیں مصطفائی اور اسکی خلوتیں کبریائی کیسے ہونگی؟

انسان اپنے جسمانی نظام اور ساخت کو تو تھوڑا بہت جانتا ہے۔ سائنسدانوں اور ڈاکٹروں نے اس جسمانی نظام پر ہی اتنی موٹی موٹی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ لیکن انسان کے روحانی وجود کی حقیقت کیا ہے؟ اسکی ساخت و ماہیت کیا ہے؟ یہ قلب منیب، قلب سلیم اور قلب شہید کیا ہوتے ہیں؟ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ کیا ہیں؟ روح کیا ہے؟ یہ وہ عشق ومعرفت کے مقام ہیں کہ جو عقل اور علم کی حدود سے ماوراء ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے علمائے دین بھی صرف یہاں تک پہنچے ہیں کہ انسان کے وجود میں یا جسم ہے یا روح، وہ کسی تیسری حقیقت سے واقف ہی نہیں۔ اقبالؒ وہ واحد وجود ہیں کہ جنہوں نے اس راز سے بھی پردہ اٹھایا ہے، اور چونکہ یہ نقطہ بہت نازک ہے اور بہت سوں کو الجھن ہو سکتی ہے، لہذا اقبالؒ نے پہلے ہی اس بات کو واضح کر دیا:

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجود حضرت انساں، نہ روح ہے نہ بدن!

روح ایک مختلف اصطلاح ہے۔ اقبالؒ نے بھی حقیقت انسانیہ کو روح سے الگ قرار دیا ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ جسم اور روح کے علاوہ انسان کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے۔ کیونکہ زمین و آسمان و کرسی و عرش، روح کی زد میں نہیں ہیں۔ یہ انسان کے نفس، خودی اور حقیقت انسانیہ کی زد میں ہیں۔ یہ خالصتاً سو فیصد قرآنی تصور ہے۔ اقبالؒ تو قرآن سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ وہ وجود، وہ اللہ کا ولی کہ جو حضور ﷺ کو مخاطب کر کے یہ بات کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں نے اپنے کلام میں آپ ﷺ کے دین، سنت اور شریعت کے علاوہ کوئی بات کی ہو تو مجھے قیامت کے روز اپنی زیارت سے محروم کر دیجیئے گا، وہ وجود قرآن و سنت سے باہر کیسے جا سکتا ہے؟

آپ جب ان تمام جہتوں، ان تمام تصورات کو سمجھتے ہیں، ان کیفیات سے گزرتے ہیں اور ان طاقتوں کو محسوس کرتے ہیں کہ جو قلب منیب، قلب سلیم اور قلب شہید اور نفس مطمئنہ کی وجہ سے بندۂ مومن کو حاصل ہوتی ہیں، تب آپ خودی کے جوہر تک پہنچتے ہیں۔ خودی ایک ایسی، قہاری، غفاری، قدوسی و جبروتی طاقت ہے، کہ جس کا دوسرا نام ''حقیقت انسانیہ'' ہے۔

فکرِ اقبالؒ کی بنیاد اور اسکی معراج، یہی فلسفۂ خودی ہے۔ وہ شروع بھی اسی سے کرتے ہیں، اور ختم بھی اسی پر کرتے ہیں، کہ اگر تم نے اپنی خودی بیدار نہیں کی، اپنے وجود میں ان طاقتوں کو متحرک نہیں کیا، اپنی خودی کی معرفت حاصل نہ کی، اپنی روحانی صلاحیتوں کو استعمال نہ کیا، کہ جو تمہارے وجود میں ہیں، تو پھر تم دنیا میں کوئی بھی تبدیلی نہیں لا سکتے۔

ہر انسان میں یہ طاقتیں موجود ہیں۔ قلب منیب، قلم سلیم، قلب شہید، نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی یہ قوتیں تو ہر شخص میں موجود ہیں۔ روح بھی ہر انسان میں ہے، گو کہ حقیقت انسانیہ روح سے مختلف ہے۔

ہم نے بار بار روحانی جہت کی بات کی ہے۔ روحانی طاقتیں بھی اسی وجود میں بیدار ہوتی ہیں کہ جس کی خودی بیدار ہو۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے، اور اس پر استقامت اختیار کی، (بقول اقبالؒ اپنی خودی مستحکم کی)، تو ان پر فرشتے نازل ہونے لگتے ہیں۔ ملائکہ کا نزول حقیقت ہے، اور وہ انسان کے وجود میں ان روحانی طاقتوں کو بھڑکا دیتا ہے کہ جن کو مستحکم کرنے کی اقبالؒ بات کرتے ہیں۔ اقبالؒ کا مرد مومن وہی ہے کہ جس پر ملائکہ کا نزول ہو، جبرئیل امینؑ اس کے ہمسائے ہوں، اور زمین سے لیکر عرش تک، پوری خدائی اس کی زد میں ہو۔ انہی روحانی طاقتوں کے مجموعے کو اقبالؒ ''خودی'' کہتے ہیں۔

یہ بات سمجھ لیجیئے کہ ''خودی'' کا ترجمہ ایک لفظ، یا چند جملوں میں کرنا ناممکن ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز اور منفرد روحانی حقیقت ہے، انتہائی غیر معمولی، نازک اور حساس۔ بڑے بڑے دانشور اس مقام پر آ کر یا تو خاموش ہو گئے، یا ٹھوکر کھا بیٹھے، کیونکہ یہ باتیں علم کلام یا بحث کی نہیں ہیں۔ ان تجربات سے گزرنا پڑتا ہے، اور جو حق الیقین کے درجے پر فائز نہ ہو، اس کیلئے ناممکن ہے کہ خودی کے سفر کو بیان کر سکے۔ اس معاملے پر بات کرنے کیلئے، اور اسے سمجھانے کیلئے، اقبالؒ ہی کی سطح، انہی کے مقام کا کوئی شخص ہوگا۔ حضرت واصف علی واصفؒ نے اسی لیئے فرمایا تھا کہ اقبالؒ کے کلام کو سمجھانے کیلئے کم از کم روحانی مقام ایک قلندر کا ہونا ضروری ہے۔

یہ تصورات چونکہ دقیق، نازک اور مشکل ہیں، ہر ایک کی سمجھ میں آنے والے نہیں، تو اقبالؒ یہاں متنبہ بھی کرتے ہیں کہ:

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

اگر تمہاری نگاہ پاک نہیں ہے، تم میں فراست نہیں ہے، تم فکر اور تدبر کی صلاحیت نہیں رکھتے، عشق کے سفر کا سلیقہ نہیں جانتے، تو پھر میری محفل میں داخل نہ ہونا، کہ خودی کے جو راز میں بیان کر رہا ہوں، وہ تمہیں کاٹ کر رکھ دیں گے، گمراہ کر دینگے، شک میں مبتلا کر دینگے۔ یہ جہتیں اتنی دقیق، اتنی باریک، اتنی نازک ہیں کہ ان کیلئے کسی ایسے استاد کو تلاش کرو، کہ جس کی خودی بیدار ہو۔ اقبالؒ بار بار مرشد کامل کی بات کرتے ہیں، مرد کامل کی بات کرتے ہیں، نگاہ مرد مومن کی بات کرتے ہیں، ''ترا علاج نظر کے سوا کچھ بھی نہیں''۔

....

اقبالؒ کی نگاہ میں، حقیقت انسانیہ کا جوہر وہی ہے کہ جو حقیقت محمدیہ ﷺ کا ہے، اور حقیقت محمدیہ ﷺ کا جوہر وہی ہے کہ جو حقیقت الٰہیہ کا ہے۔ اس نور کو بھی آپ خودی سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہی خودی جب ظاہر ہوتی ہے، تو نور مصطفیٰ ﷺ کی شکل میں، جب باطن میں ہوتی ہے، تو نور کبریاء کہلاتی ہے۔ اور یہی خودی جب ایک انسان کے وجود میں بیدار ہوتی ہے، تو پھر وہ زمین پر خلیفۃ اللہ فی الارض ہوتا ہے، کہ جس کا دائرہ اختیار فرش سے عرش تک پھیلا ہوا ہوتا ہے، وہ زمانے کا راکب ہوتا ہے، جبرئیل کا ہمسایہ ہوتا ہے، اور وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل دیتا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یہ حقیقت انسانیہ، حقیقت محمدیہ ﷺ اور اللہ سبحان وتعالیٰ اور ان کے آپس کے تعلق کے حوالے سے اتنا بڑا راز ہے کہ جسے اقبالؒ نے چند سطور میں سمو دیا ہے۔ کسی زبان، کسی شاعری اور کلام میں ہمیں اس سے زیادہ جامع شعر نہیں ملتا کہ جو حقیقت انسانیہ، حقیقت محمدیہ ﷺ اور اللہ سبحان وتعالیٰ کے آپس کے تعلق کو بیان کرے۔ اقبالؒ جس مقام پر تھے، ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ خودی کی معراج تھی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ یہ شعر، یہ کلام کسی عام بشر، عام عالم یا عام دانشور کی زبان سے ادا ہو۔

....

فقراء میں ایک مقولہ مشہور ہے، ''کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا''۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ اللہ انسان کی

شہہ رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہے۔ اقبالؒ خود فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فلسفۂ خودی، قرآن کی اس آیت سے اخذ کیا ہے کہ جسکا مفہوم ہے کہ، ''ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا کہ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے انکو یہ بھلا دیا کہ انکے انفس کی حقیقتیں کیا ہیں''۔ اسی لیے اقبالؒ بار بار بندۂ مومن کو تاکید کرتے ہیں کہ، ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی''، زندگی کی حقیقتوں کا سراغ انسان کو اپنے وجود میں ہی ملے گا، اپنی خودی میں ہی ملے گا۔

تو راز کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پہ عیاں ہوجا
خودی کا راز داں ہوجا، خدا کا ترجماں ہوجا

اللہ نے پوری کائنات ''کن فیکون'' سے بنائی ہے، مگر انسان کا مقام اس سے بھی بلند ہے۔ قرآن سے ہمیں اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ انسان کی تخلیق کن فیکون سے نہیں، بلکہ خود اللہ کے اپنے ہاتھوں سے ہوئی۔ یہاں اقبالؒ بندۂ مومن کو مخاطب کر کے، اسکا اصل مقام اسکو بتا رہے ہیں کہ اس حقیقت کو پہچانو کہ تم کن فیکون سے تخلیق نہیں ہوئے۔ جب انسان کائنات کے اتنے بڑے راز کا راز دار ہوجاتا ہے، اس پر اپنی حقیقت آشکار ہوجاتی ہے، وہ اپنے نفس کو جان جاتا ہے، تو پھر وہ خدا کو بھی پہچاننے لگتا ہے، خدا کا ترجمان ہوجاتا ہے۔

میرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تُو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

اقبالؒ بندۂ مومن کو کن فیکون کا راز کہتے ہیں۔ انسان کی حقیقت کے حوالے سے، کم و بیش یہی بات بابا بلھے شاہؒ نے بھی کہی تھی:

کن فیکون ہالے کل دی گل اے
اسی پہلے پینگاں لائیاں

یعنی کن فیکون تو ابھی کل کی بات ہے، ہم انسان تو اس سے بھی پہلے موجود تھے۔

قرآن میں سورۃ اعراف میں عہدِ الست کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ''کن فیکون'' سے بہت پہلے کی بات ہے۔ تمام انسانوں کی حقیقتوں، یعنی حقیقت انسانیہ، کو جمع کر کے اللہ نے ان سے ایک عہد لیا کہ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' اور تمام انسانوں نے جواب دیا، ''جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں''۔ جس وقت یہ عہد لیا گیا، نہ اس وقت کائنات وجود رکھتی تھی، نہ زمین و آسمان، نہ دن و رات۔ خود آدمؑ کا بھی وجود نہ تھا۔ یہی وہ مقام ہے کہ جس کے بارے میں بابا بلھے شاہؒ نے اشارہ کیا ہے، اور اقبالؒ مردِ مومن کو کن فیکون کا راز کہتے ہیں۔

اسی طرح قرآن میں ایک اور مقام پر ''عہدِ امانت'' کی بات ہوتی ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین کو، آسمانوں کو، پہاڑوں کو امانت پیش کی اور وہ سب گھبرا گئے، مگر وہ امانت انسان نے اٹھالی۔ وہ امانت اتنی بڑی طاقت، اتنی بڑی روحانی قوت ہے کہ پوری کائنات اسکو اٹھاتے ہوئے کانپ گئی، اور وہ امانت انسان کو دے دی گئی۔ اسی امانت کا حامل ہونے کی وجہ سے انسان اشرف

المخلوقات ہے۔ یہ امانت نہ انسان کا جسم ہے، نہ اسکی روح، بلکہ یہ امانت ہی حقیقت انسانیہ ہے، کہ جسے اقبالؒ خودی کہتے ہیں۔اسی خودی کو پہچاننا ہی رب کو پہچاننا ہے۔ یہی خودی جب اپنے عروج پر پہنچتی ہے، تو اللہ اس بندے کا ہاتھ بن جاتا ہے، زبان بن جاتا ہے، پاؤں بن جاتا ہے۔ یہی زندگی کا راز ہے، یہی حقیقت انسانیہ کی پہچان ہے۔

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سر زندگانی ہے

یعنی اس خودی کی پہچان ہی تمہیں اپنی حقیقت کا راز اور سراغ دے گی۔ یہی تمہاری حقیقت ازل سے ہے، اور ابد تک رہے گی۔موت تمہارے جسم کو آئے گی، تمہاری حقیقت ہمیشہ رہنے والی ہے۔قرآن میں اللہ شہداء کے بارے میں فرماتا ہے کہ ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، انکو رزق ملتا ہے، لیکن عام انسانوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔ جب شہداء کا یہ مقام ہے، تو ان سے بلند روحانی مقام والے، یعنی انبیاءؑ اور صدیقین کا کیا مقام ہوگا! اس بات پر تو امت کے ہر مسلک کا اجماع ہے، کہ حضور ﷺ اپنے روضہء پاک میں حیات ہیں، درود و سلام آپ ﷺ تک پہنچتا ہے، اور آپ ﷺ اس کا جواب بھی عطا فرماتے ہیں۔حضور ﷺ کے صدقے آپ کی امت کے اولیاء، صدیقین اور شہداء کو بھی اللہ حیات بعد الممات کا مقام دیتا ہے۔

ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

بابا بلھے شاہؒ بھی یہی فرماتے نظر آتے ہیں کہ،''وے بلھیا اساں مرناں ناہیں، گور پیا کوئی ہور''۔اگر غور کریں تو ہر فقیر نے حقیقت انسانیہ، یعنی خودی کا تعارف کرایا ہے۔

اقبالؒ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ خودی کے یہ نازک نکات انہوں نے سیدنا علیؓ سے سیکھے ہیں۔

یہ نقطہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

....

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مجھے تہجد کی نماز میں یہ راز عطا ہوا، کہ جو فقیر اپنی حقیقت کے عارف ہوتے ہیں، اپنی خودی پہچانتے ہیں، کن فیکون کا راز جان لیتے ہیں، وہی اصل بادشاہ اور حکمران ہیں اس کائنات کے۔

حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت بابا فریدؒ، حضرت قطب الدین بختیار کا کیؒ، ظاہراً فقراء اور درویش ہیں، لیکن حقیقتاً زمانے پر حکمرانی انہی کی ہے۔بڑے بڑے بادشاہ ان کے سامنے خوف سے تھر تھر کانپا کرتے تھے، اور آج بھی پوری دنیا میں آپ کا ڈنکہ بجتا ہے۔

سیدنا خالد بن ولیدؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عمرو بن العاصؓ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، نورالدین زنگیؒ، یہ سب خودی کے عارف تھے، کہ جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہری و باطنی حکومتیں عطا کی گئیں۔خودی کے عارفوں کو جو بھی ذمہ داری سونپی جائے، پوری کرتے ہیں۔کہیں سپاہی بن جاتے ہیں، کہیں فقیر بن جاتے ہیں، کہیں درویش بن جاتے ہیں، کہیں وہ عالم کی شکل میں سامنے آتے ہیں، کہیں بادشاہ ءوقت ہوتے ہیں۔یہ مالک کی مرضی ہے، لیکن جس نے بھی دنیا میں کوئی غیر معمولی کام انجام دیا ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی ڈیوٹی کی ہے، وہ خودی کا راز دار بھی تھا، اور خدا کا ترجمان بھی۔

....

دنیا میں قوت اور اختیار کیلئے، ظاہری وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ایک مسلمان ملت کا انحصار ان روحانی قوتوں پر ہوتا ہے، کہ جو اپنی حقیقت کو جاننے کے انعام کے طور پر عطا ہوتی ہیں، اپنی خودی کو بیدار کرنے پر ملتی ہیں۔ مسلمانوں نے تاریخ اسلام میں جب بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں، فتوحات کی ہیں، ایجادات کی ہیں، تہذیبیں قائم کی ہیں، تو ظاہری وسائل کی بنیاد پر نہیں، اپنی روحانی اور اخلاق قوت کی بنیاد پر انکو حاصل کیا ہے۔ جنگ بدر کے حوالے سے قرآن پورا واقعہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح روحانی قوتوں اور ملائکہ نے مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو کر کفار سے مقابلہ کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ فیض، صرف جنگ بدر تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ صدیوں میں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

مرد مومن خود بھی پراسرار ہوتا ہے، اور اسکی تائید اور حمایت بھی اللہ کی پراسرار روحانی مخلوقیں کرتی ہیں۔

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے

....

خودی کی تربیت کے حوالے سے اقبالؒ یہ واضح کرتے ہیں کہ اس کا راستہ، فقر ہے۔ خودی کی تربیت فقر سے ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک فقیر اس مقام پر آ جاتا ہے کہ اللہ، اس ایک وجود سے، بڑی بڑی فوجوں کا کام لیتا ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں، کہ جب ایک مجاہد یا فقیر نے، صدیوں تک آنے والی امت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا، اور وقت کی تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف اکیلا ہی کھڑا ہو گیا۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

....

اگر کوئی شخص اپنی خودی کی تربیت کرنا چاہتا ہے، تو اب اقبالؒ اس کو نصیحت کرتے ہوئے ایک راز کی بات بتا رہے ہیں۔ اس دنیا کی آلائشوں سے بچنا، اس کی چمک دمک سے متاثر نہ ہونا، رزق حرام سے بچنا، یقیناً ایک مشکل کام ہے، لیکن یہ کام مشکل تر اس وقت ہو جاتا ہے، کہ جب انسان خود مجبور اور بے کس ہو، مالی مشکلات میں ہو، رزق کی تنگی ہو، جان و مال کا خوف ہو۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ یہ بات واضح فرماتا ہے کہ، وہ یقیناً انسان کو جان و مال، عزت و آبرو اور اولاد کی آزمائشوں سے گزارے گا۔ اپنی خودی کی نگہبانی ایسی آزمائشوں کے دوران زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

انسان بھوکا ہو، اور سوال نہ کرے، ضرورت مند ہو، اور کسی سے اپنی حاجت بیان نہ کرے، عہدہ اور اختیار اس کے سامنے آئے، اور وہ حرام کے خوف سے اس کو رد کر دے، چاہے خود ضرورت مند ہو۔ خودی کی تربیت کا آغاز ایسے ہی ہوتا ہے۔ جہاں انسان نے سمجھوتہ کر لیا، وہیں سے اسکی خودی کا زوال شروع ہوتا ہے۔ اقبالؒ ایک بندۂ مومن کو نصیحت کرتے ہیں کہ ایسی ذلت و رسوائی سے بہتر ہے کہ وہ موت قبول کر لے۔

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مزید واضح کرتے ہیں، کہ اپنی دنیا، جائیداد، گاڑیاں، عزت و آبرو، جھنڈے، گارڈز، کیریئر، روپیہ پیسہ کی خاطر اپنی عزت و آبرو نہ بیچ دینا، کیونکہ اگر تم اپنا مقام چاہتے ہو، تو جان لو کہ اس کا طریقہ فقیری میں ہے، دنیا داری میں نہیں۔ اپنی عزت و آبرو پر سمجھوتہ نہ کر لینا۔ خودی نہ بیچ ڈالنا!

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

اسلامی تاریخ میں جب بھی یہ امت رسوا ہوئی ہیں، ذلیل وخوار اور تباہ ہوئی ہیں تو اس کی وجہ کیا تھی؟ لوگ اسکی وجہ ان امور میں تلاش کرتے ہیں کہ انتظام ٹھیک نہیں تھا، حکومت ٹھیک نہیں تھی، معیشت کمزور تھی، فوجیں طاقتور نہ تھیں، مگر اقبالؒ اس کی وجہ کچھ اور ہی بتاتے ہیں:

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

مسلمان امت اس وقت رسوا ہوتی ہے، کہ جب اس کا ادب، تہذیب وتمدن اور دین، خودی سے بیگانہ ہو جائے، کہ جب وہ خودی کی حفاظت ترک کر دے، کہ جو اصل سرِ زندگانی، یعنی زندگی کا راز ہے۔ مسلمان قوم کا عروج وزوال، مادّی اسباب اور دنیا کے وسائل کی کمی بیشی سے نہیں، بلکہ اسکی روحانی اساس، یعنی خودی کے عروج وزوال سے ہے۔

امت کی تباہی کی وجہ اقبالؒ علماء کا زوال بھی بتاتے ہیں کہ جب انکی خودی کی موت واقع ہوئی، تو علمائے سُو نے امت کی عزت وآبرو بیچ ڈالی۔ جب تک ہمارے پاس ایسے علماء تھے، کہ جو ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے بھی کلمۂ حق کہنے سے نہ ڈرتے، تو اس وقت تک امت کا عروج اور شان قائم رہی۔ جب ایسے علماء کی کثرت ہوگئی، کہ جن کے وجود دنیا کی آلائشوں اور غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے تھے، تو ایسے علماء نے ہی امت کی آبرو کو نیلام کیا۔

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام!

ایسے بدکردار علماء پر تو اقبالؒ کو سخت جلال تھا:

پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز، گفتار واہی

....

اقبالؒ اب ایک انتہائی غیر معمولی تصور دیتے ہیں۔ مسلمانوں میں امام مہدیؑ اور آخر الزمانؑ کا تصور موجود ہے۔ اقبالؒ اسکی، فلسفۂ خودی کے حوالے سے، ایک حیرت انگیز وضاحت کرتے ہیں۔

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی، وہی آخر زمانی

اقبالؒ کا یہ تصور ہے کہ جو فقیر پہلے اپنی خودی کی معراج پا گیا، خودی کی حفاظت کر پایا، اور جس میں اسکی خودی کی قوتیں پہلے جلوہ گر ہوئیں، اللہ اسی فقیر سے امت کو بیدار کرنے کا کام لے گا، وہی وقت کا ''مہدی'' ہوگا، وہی ''آخرالزماں'' ہوگا۔

اگر کوئی فلسفہء اقبالؒ کو سمجھتا ہے، تو وہ یہ جانتا ہے کہ اقبالؒ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہنے پر، سخت جلال میں آتے تھے۔ ہر انسان کو معلوم ہے کہ قیامت آنی ہے، مگر ایک انسان کیلئے قیامت اسی وقت شروع ہوجاتی ہے کہ جب اسکی موت واقع ہوجائے۔ جب ایک شخص کی دنیا میں زندگی ختم ہوجائے، تو اس کے بعد اسکو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قیامت کب آئے گی۔

اقبالؒ ہر مسلمان کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ مہدیؑ کا انتظار کرنے کے بجائے، وقت کا ''مہدی'' بنے، وقت کا مجدد بنے، وقت کا مجاہد بنے، وقت کا امام بنے۔

صدیوں سے مسلمان امام مہدیؑ کا انتظار کررہے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک وقت کا ''مہدی'' وہی ہوگا کہ جو امت کو ذلت و رسوائی سے نکال کر، عظمت رفتہ کی بلندیوں تک پہنچادے۔ اقبالؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر مردمومن کو اپنی خودی کو اتنا بلند کرنا چاہیے، کہ خود خدا اسکو وقت کا ''مہدی'' بنادے۔ اقبالؒ کے نزدیک جو بھی مردآزاد، فقرغیور کا حامل، شاہین شہہ لولاک ﷺ، بیداریِ امت کی ذمہ داری ادا کرے گا، وہی وقت کا ''مہدی''، ''آخرالزمانی'' ہوگا۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کے رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

۱۵
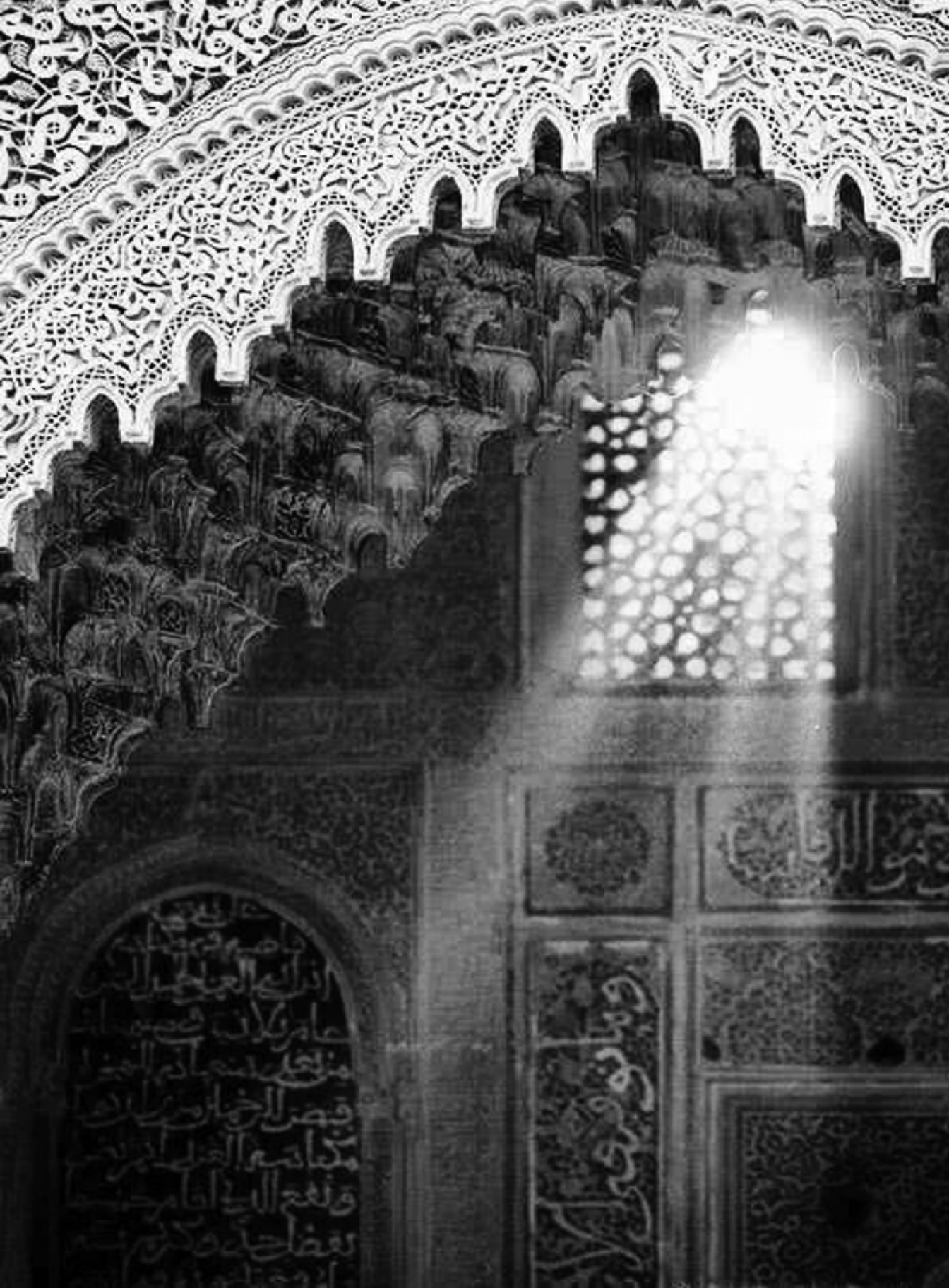
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اب ہم اپنی گفتگو کے سلسلے کے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکے ہیں۔اقبالؒ کا کلام ایک بحر بیکراں کی مانند ہے،اتنا گہرا سمندر کہ یہ ممکن ہی نہیں، کہ آپ اسکی تہہ تک پہنچ سکیں۔لیکن ان محدود صفحات میں،جس حد تک ممکن ہوا،ہم نے اقبالؒ کے تمام تر فلسفے کا نچوڑ پیش کرنے کی کوشش کی،لیکن یہ نچوڑ اس وقت تک ممکن نہیں، کہ جب تک اقبالؒ کی زبان سے،آنے والے دور کی تصویر ہم آپ کو نہ دکھلا دیں۔یہ ممکن ہی نہیں، کہ ہم اقبالؒ کا کلام ختم کرلیں،اور آپ کو وہ خوشخبریاں نہ سنائیں، وہ آنے والا دور نہ دکھائیں، کہ جس کی بشارت اقبالؒ نے دی ہے۔آج کے پاکستانیوں کو اقبالؒ سے فیض لیکر پاکستان کو اسکے مقصد حیات، اسکے عروج تک پہنچانا ہے۔یہ تقدیر لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہے،اب ہمیں اپنے جرأت کردار سے،فقر غیور سے اور بلند نگاہی سے اس کو حاصل کرنا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبالؒ نے ایک بہت ہی رومانوی مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے،مگر اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ امت مسلمہ کی تلخ صورتحال سے نابلد تھے۔وہ اس حقیقت کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، کہ آج ملت اسلامیہ تباہی کے دھانے پر کھڑی ہے،اور اپنی مرکزیت کے بغیر، زمانے کے تیز وتند بگولوں میں،تھپیڑے کھا رہی ہے۔اس کے باوجود،اقبالؒ کی امید اور مستقبل کی بشارتیں انسان کو ششدر کر دیتی ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز

تم مجھے ترک وعرب کی داستان کیا سناتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ ملک وملت کے ساتھ ہورہا ہے۔ مجھ سے کچھ چھپا ہوانہیں ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد، مغربی طاقتوں نے معاہدہ بالفور کے تحت خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کردیا، اور پوری مسلمان ملت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہیں کہ امت مسلمہ کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے، وہ مغربی اور صیہونی سازشیں ہیں۔

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کردیتا ہے گاز

جس طرح تسبیح کے دانے بکھر جاتے ہیں، بالکل اسی طرح مغرب کی سازشوں نے امت مسلمہ کو توڑ کر بکھیر دیا ہے۔

ہوگیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

یہاں اقبالؒ اس حقیقت کوتسلیم کرتے ہیں کہ اس دور میں مسلمان کا خون پانی کی طرح سستا ہوگیا ہے۔ مگر ساتھ ہی حکمت ودانائی کا ایک انتہائی گہرا نقطہ بھی بیان کرتے ہوئے، مسلمان ملت سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں، کہ تمہارا دل اس لیے بے چین ہے، کہ تم اللہ کے رازوں سے واقف نہیں۔ اگر تم خدا کے راز دار ہوتے، تو پھر شاید اتنا پریشان نہ ہوتے، اور اس شاندار مستقبل کو دیکھ سکتے، کہ جو اس تخریب کے بعد، مسلمانوں کے نصیب میں ہے۔

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کہ آباداں کنند
می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اقبالؒ، جلال الدین رومیؒ کو "پیر رومی" کہتے تھے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں، کہ رومیؒ کہتے تھے کہ جب بھی کسی پرانی عمارت کی جگہ کوئی نئی عمارت کھڑی کی جاتی ہے، تو اس سے پہلے پرانی بنیاد کو کھودا جاتا ہے، تباہ کیا جاتا ہے۔ پرانی بنیادوں پر نئی پختہ عمارت تعمیر نہیں ہوتی، کیونکہ پرانی بنیادیں، نئی عمارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔

اس وقت تم جو امت وملت کی تباہی دیکھ رہے ہو، یہ پرانی بنیادیں ہیں، کہ جو اکھیڑی جارہی ہیں۔ تین سو سال سے مسلمان ذلت اور غفلت میں مبتلا تھے، کفر اور ظلم کے نظام رائج تھے، گمراہی اور ضلالت عام تھی، اس لیے ایک نئی ملت کی تعمیر کیلئے، ان تمام پرانی بنیادوں کو، مشیّت ایزدی کے تحت اکھاڑا جارہا ہے، کہ اب مسلماں کو مسلماں کردے گا یہ طوفان مغرب، اور جب ملک ہاتھ سے جائے گا، تو

پہلی جنگ عظیم میں ترک فوج، خلافت کے دفاع کیلئے لڑتے ہوئے

ملت کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دور کے بعد مسلمانوں کے زوال کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اقبالؒ اب اس دور میں ہیں کہ جس کے بعد مسلمانوں کا عروج آنا ہے، لیکن اس سے قبل دورِ زوال کی تمام بوسیدہ عمارتوں کو اکھاڑ اجا رہا ہے۔

سرزمین ایشیاء میں امت مسلمہ کا کیا کردار ہے، اس حوالے سے اقبالؒ ایک بہت گہری نصیحت کرتے ہیں۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

کہتے ہیں ایشیائی تہذیب، چاہے اس میں ہندوستانی ہوں، چینی ہوں، روسی ہوں، جاپانی ہوں، ان سب کی بقاء، اسی میں ہے کہ امت مسلمہ بیدار ہو جائے۔ اگر آپ دیکھیئے تو مشرق اور مغرب کے درمیان پل کا کردار مشرق وسطیٰ ادا کر رہا ہے۔ پاکستان، ہند اور خراسان کا تمام علاقہ، کہ جہاں مسلمان بستے ہیں، اگر مسلمان یہاں کمزور ہیں، یہاں مغرب کی یلغار ہے، انتشار اور فساد ہے تو اس سے پورے ایشیا میں فساد ہے۔ مسلمان ملت کی قوت اور طاقت ہی ایشیاء کو سنبھال سکتی ہے۔

افغانستان، امریکی قابض افواج کے زیرِ تسلط

اسی حوالے سے، افغانستان اور ایشیاء کے کردار کے بارے میں اقبالؒ مزید وضاحت کرتے ہیں:

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں در آں پیکر دل است
از فساد او فساد آسیا
در کشاد او کشاد آسیا

یعنی ایشیا پانی اور مٹی کا ایک وجود ہے اور اس میں افغانستان کو دل کی حیثیت حاصل ہے۔ افغانستان میں فساد ہوگا تو پورے ایشیا میں فساد ہوگا۔ افغانستان میں امن ہوگا تو پورے ایشیا میں امن ہوگا۔ آج کے دور میں ہم اس شعر کی زندہ مثال دیکھ رہے ہیں کہ جب افغانستان میں ہونیوالی جنگوں کی وجہ سے پاکستان سمیت پورا مغربی ایشیاء فساد کا شکار ہے۔

....

اب اقبالؒ امت کو عروج کی طرف لے جانے کیلئے نصیحتیں کرر ہے ہیں۔ بہت عرصے سے مسلمان، مغرب کی تقلید میں، مغربی سیاسی نظاموں پر چل کر اپنی فلاح تلاش کرر ہے تھے۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و ملت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

یعنی تم جو جمہوری سیاست کرر ہے ہو، آمریت میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہے ہو، سڑکوں پر جلوس نکال رہے ہو، ٹائر جلا رہے ہو، جلسے اور دھرنے دے رہے ہو، لانگ مارچ کرر ہے ہو، حکومتوں کے تختے الٹ رہے ہو، ان سب سے کوئی خیر برآمد نہیں ہوگی، جب تک کہ تم اپنی سیاست کو دین کے تابع نہ کردو۔ جب مسلمان قرآن وسنت کو نافذ کرتا ہے تو اس کی برکت سے اللہ اسکو ملک وملت اور دنیا کی قیادت دیتا ہے۔ ماضی میں، جو ملک و دولت، اختیار اور طاقت مسلمانوں کو نصیب تھی، وہ صرف اس لیے تھی، کہ مسلمان اپنے دین، قرآن اور حرم کے محافظ تھے۔ آج اگر مسلمان دنیا میں رسوا ہیں، تو صرف اس لیے کہ انہوں نے اپنا دین ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے، عزت بھی گئی، ملک بھی گئے، ملت بھی گئی۔

اقبالؒ پوری امت اور خاص طور پر آج کے پاکستانیوں کو سخت تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خر گاہی ہو یا اعرابی والا گہر

مسلمان ملت میں جو بھی رنگ وخون کا امتیاز کرے گا، یہ کہے گا کہ میں عرب ہوں، میں ترک ہوں، میں پاکستانی ہوں، میں بلوچ ہوں، میں پٹھان ہوں، میں اردو بولنے والا ہوں، میں پنجابی ہوں، میں کشمیری ہوں، میں سندھی ہوں......غرضیکہ جس نے بھی عصبیت، رنگ، خون، اور زبان کے نام پر امت میں تفریق ڈالی، تو اللہ تعالیٰ اسے مٹا کے رکھ دے گا، اسکا وجود ختم کر دے گا۔ کیونکہ اللہ اب فیصلہ کر چکا ہے، کہ اسے اس امت کو عروج دینا ہے۔ اب جو اس عروج کی راہ میں رکاوٹ بنے گا، روند دیا جائے گا۔

تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیئے، حضور ﷺ کے تشریف لانے کے بعد، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا، کہ اب اسلام کو پوری دنیا میں پھیلنا ہے، چنانچہ جو بھی اس کی راہ میں رکاوٹ بنا، روند دیا گیا۔ ابوجہل اور ابولہب بدنصیب تھے، کہ وہ یہ بات سمجھ ہی نہ سکے اور تاریخ کی غلط سمت میں جا کھڑے ہوئے، نتیجتاً ایک نئی فکر اور ایک نیا انقلابی نظریہ ان کو روندتا ہوا گزر گیا۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ، سیدنا عمرؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا علیؓ اور باقی صحابہ کرامؓ کہ جنہوں نے حضور ﷺ کا ساتھ دیا، وہ اس نئے انقلابی نظریے کے حامی اور حمایتی بن گئے، اور دو جہانوں میں نوازے گئے۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر

آج پوری مسلم دنیا میں نسلی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر جنگیں برپا کی جارہی ہیں۔ افغانستان، پاکستان، عراق، شام، یمن، بحرین...... غرضیکہ درجنوں مسلمان خطوں میں فرقہ وارانہ اور قومیت کی بنیادوں پر مسلمانوں کو تقسیم کر کے ملکوں کو تباہ کیا جارہا ہے۔ اقبالؒ ان فتنوں کو اسی وقت بھانپ چکے تھے۔

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

....

امت مسلمہ کی اس قدر تقسیم اور تخریب کے باوجود، اقبالؒ اس ہدف کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، کہ بالآخر امت کو ایک مرتبہ پھر متحد کر کے خلافت کا قیام وجود میں لانا، امت کے احیاء کی لازمی شرط ہے۔ اقبالؒ خلافت کا قیام چاہتے ہیں، مگر ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہیں، کہ آج کے زوال پذیر دور کے پسماندہ اور شکست خوردہ مسلمان، اس بھاری ذمہ داری کے ابھی قابل نہیں ہیں، لہذا وہ امت کی تربیت پر انتہائی زور دیتے ہیں۔ آج مسلمان تحریکوں اور ممالک کی شکست کی وجہ ہی یہی ہے، کہ امت کے پاس تربیت یافتہ اور نگاہ بلند افراد موجود نہیں۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

....

مسلمانوں کی تباہ شدہ حالت کو دیکھ کر، امت کی پستی اور زوال کے دردناک مناظر اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے، اور کفر کی اس قدر ہلاکت خیز طاقت کی موجودگی میں، عام مسلمان تو کیا، بڑے بڑے دانشور اور قائدین بھی، اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ وہ مسلمانوں کے عروج کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں اقبالؒ جیسے مردِ قلندر کی اذان، بہت سوں کو صرف ایک رومانوی داستان ہی لگتی تھی۔ کسی کو بھی یہ یقین نہ تھا، کہ مسلمان اب دوبارہ اپنا عروج حاصل کر پائیں گے۔ مگر اقبالؒ پورے حق الیقین کے ساتھ، اپنی بات پر ڈٹے رہے، اور امت کو حوصلہ دلاتے رہے کہ اب ان کے عروج کا فیصلہ، تقدیرِ الٰہی میں کر دیا گیا ہے، اور اب انہیں آگے بڑھ کر اس رزق کو اپنے نصیب میں کرنا ہے۔ جو پھر بھی شک کرتے رہے، انہیں اقبالؒ نصیحت کرتے ہیں کہ اب انتظار کرو اور اس فقیر کی زبان سے ادا ہونیوالی تقدیرِ الٰہی کے کھلنے کا نظارہ دیکھو۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ!

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

یہ ناقابل یقین بشارتیں ہیں، مگر حقیقت یہ ہے، کہ یہ امت مسلمہ کی وہ تقدیر ہے، کہ جس کے ظہور کا آغاز پاکستان کے قیام سے شروع ہو چکا ہے۔ دشمنوں کی تمام تر فتنہ گیریوں، سازشوں اور قتل و غارت کے باوجود، اقبالؒ اور قائداعظمؒ جیسے درویشوں کی حکمت سے، اللہ نے دشمن کی تمام تدبیروں کو غارت کر دیا۔ اور اب ان شاء اللہ یہی پاکستان، وہ مرکز بنے گا، کہ جہاں سے اقبالؒ کی زبان سے ادا ہونیوالی دیگر تمام خوشخبریوں کی تکمیل، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

ان تمام مسلمانوں کو، کہ جو ابھی بھی اس تقدیر کے حوالے سے شک میں مبتلا ہیں، اقبالؒ بڑی سختی سے تاکید کرتے ہیں کہ قرآن کی اس آیت پر نگاہ رکھو کہ اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اسکا وعدہ محکم ہے۔ اللہ مسلمانوں سے وعدہ کر چکا ہے کہ اگر وہ ایمان اور عمل صالح کا راستہ اختیار کریں گے، تو اللہ انکو زمین میں خلافت عطا کرے گا۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر 'لا یخلف المیعادٗ' دار

اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے جو بھی وعدے فرمائے ہیں، جو بھی خوشخبریاں عطا فرمائی ہیں، ان پر شک کرنا حرام ہے۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے وعدے سچے ہیں۔ اس امت نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنا ہے، غزوۂ ہند لڑنا ہے، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ نے دوبارہ قائم ہونا ہے، اس امت نے نیل کے ساحل سے لیکر کاشغر کی خاک تک، ایک مرتبہ پھر متحد ہونا ہے، اب اس پاکستانی قوم سے اللہ نے دنیا کی امامت کا کام لینا ہے۔ وہ خوش نصیب وجود ہونگے کہ جو ان بشارتوں پر شک نہ کریں اور اس تقدیر کا حصہ بنیں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

....

اقبالؒ کے پورے کلام میں جا بجا یہ خوشخبریاں بکھری ہوئی ہیں۔ یہاں ہم مختصراً ان میں سے چند پیش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام خوشخبریاں وہ ایک ایسے دور میں دے رہے ہیں کہ جب پوری امت مسلمہ پر مایوسی کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہی اقبالؒ کا کمال ہے، یہی ان کا فیض ہے، کہ جس کی وجہ سے آنے والی صدیوں تک امت پر اقبالؒ کا احسان رہے گا۔

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابی

مسلمانوں کی غفلت کا دور ختم ہو چکا ہے، ایک نیا سورج طلوع ہو چکا ہے، اور یہ ایک نئے دور کے آغاز کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

عروق مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

قوموں کے عروج و زوال کے یہ وہ راز ہیں کہ جو بڑے بڑے دانشور، چاہے وہ حکیم بو علی سینا ہوں یا الفارابی، بھی نہیں سمجھ سکتے، کہ ان کا تعلق مادّی اسباب سے نہیں بلکہ تقدیر الٰہی سے ہے۔ مشرق جو کہ مکمل طور پر مردہ ہو چکا تھا اب اس میں زندگی کا ایک نیا خون دوڑنا شروع ہو گیا ہے اور یہ معجزہ کسی کی تدبیر سے نہیں، صرف حکم الٰہی سے ہے۔ اس کو سمجھنے کیلئے، فلسفے اور عقل کی نہیں، عشق اور قلب کی ضرورت ہے۔
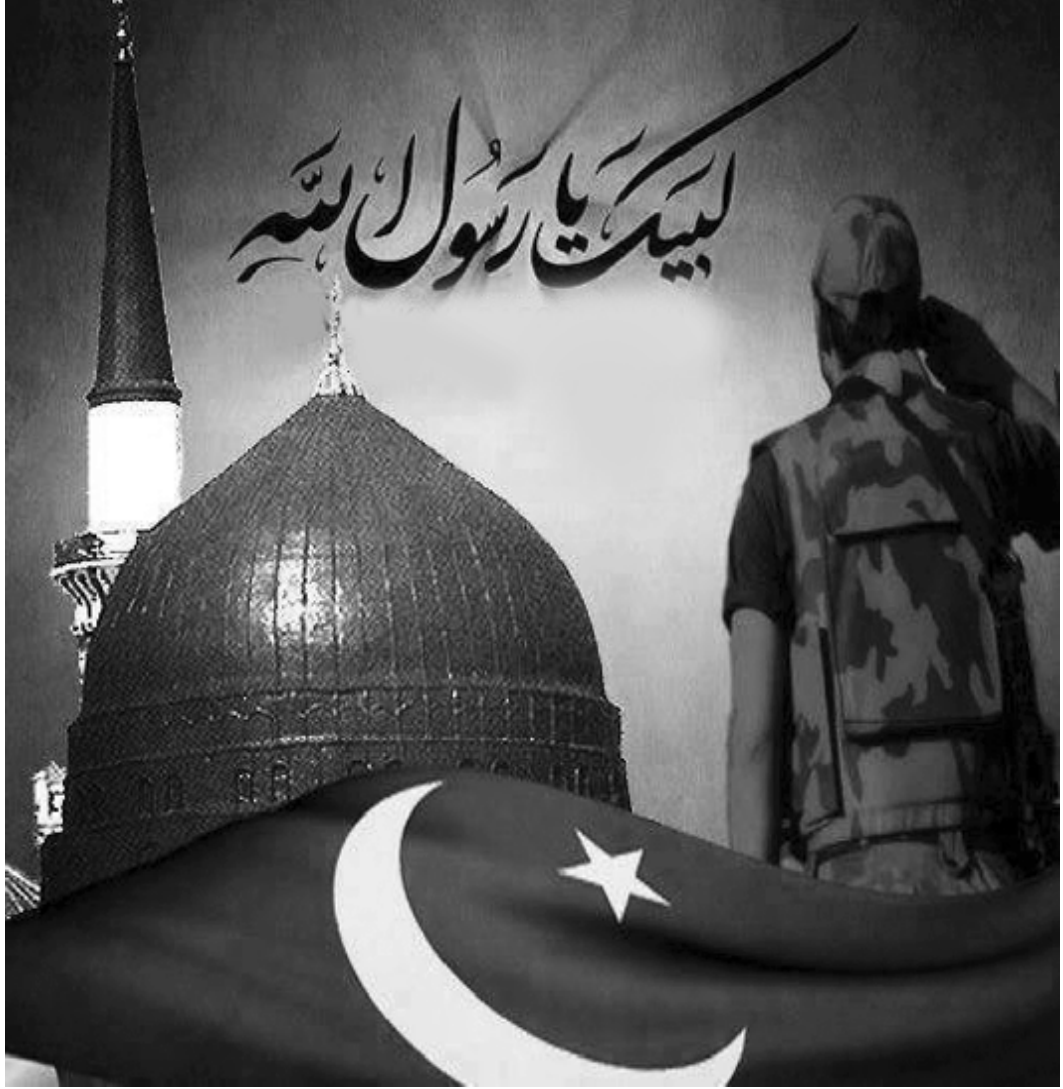
عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اب چودہ سو سال کی اسلامی میراث، پاکستان کے مسلمانوں کو عطا ہونیوالی ہے۔ ہر مسلمان تہذیب میں جو بھی خیر ہے، اللہ اس کو جمع کر کے، پاکستان کے مسلمانوں کے ذریعے، امت کو عروج دلوائے گا، چاہے وہ عثمانی خلافت کا جلال ہو، یا ہند کے مسلمانوں کی عقل و دانش، یا عربی تہذیب کی فصاحت و بلاغت۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اس امت کی دوبارہ شیرازہ بندی کی جا رہی ہے، دوبارہ اس کتاب کی جلد بندی ہو رہی ہے، کہ جو ورق ورق بکھر گئی تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خلافت عثمانیہ کی تقسیم کے بعد جس طرح امت کو پارہ پارہ کر دیا گیا تھا، اب اللہ اپنے کرم سے دوبارہ اس امت کو متحد کر کے، عروج کی طرف لے جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یہ خوشخبریاں اقبالؒ اس وقت دے رہے تھے کہ جب کوئی ایک بھی آزاد مسلمان ملک موجود نہیں تھا، مگر یہ مستقبل کی وہ تصویریں ہیں کہ جن کا فیصلہ تقدیر الٰہی میں کر دیا گیا ہے۔

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اقبالؒ کواس بات کا بہت احساس اور دکھ تھا کہ امت مسلمہ کی قیادت اور نوجوان انتہائی مایوسی کا شکار ہیں، شک اور وسوسوں میں پڑے ہوئے ہیں، بے یقینی کی حالت میں ڈولتے ہوئے، زمانوں کی لہروں کے ساتھ بہے چلے جارہے ہیں۔اقبالؒ ان غافل نوجوانوں کو بڑی سختی سے یقین پیدا کرنے کی تاکید کرتے ہیں، ان کوان کا مقام یاددلاتے ہیں کہ اگر دنیا میں اللہ نے کوئی تبدیلی لانی ہے، تو اس کیلئے اسکا دست و بازو مسلمان ملت کے جوان ہی ہونگے۔ اللہ یہ کام ملائکہ سے بھی کرواسکتا تھا، لیکن یہ اسکی سنت ہے کہ امت رسول ﷺ میں سے ہی شیروں اور دلیروں کو چنتا ہے۔اقبالؒ یہ چاہتے ہیں کہ اس امت کے نوجوان غفلت اور بے یقینی سے نکل کر جہد مسلسل کے ذریعے اپنی تقدیر خود بنائیں۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اقبالؒ نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں، کہ آگے بڑھو اور تمہارے سامنے جوشاندار ترین مستقبل ہے، اسے حاصل کرو، کہ اگر تم یہ فرض ادانہیں کرو گے، تو اللہ تمہیں تبدیل کر کے، کسی اور کو لے آئے گا۔تم خوش نصیب ہوگے، کہ اگر تم اس مشن کا حصہ بنو گے۔ یہ تم پر اللہ کا احسان ہوگا کہ وہ تمہیں اس مشن کے لیے قبول کرلے۔ یاد رکھیے گا کہ اقبالؒ اردو میں بات کررہے ہیں۔ ان کا خطاب پاکستانی نوجوانوں سے ہے، پاکستانی قوم سے ہے۔اقبالؒ نصیحت کرتے ہیں، کہ مسلمان کی فطرت اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔کائنات میں اللہ نے جوصلاحیتیں چھپائی ہوئی ہیں، وہ ایک بندۂ مومن کا امتحان ہے، وہ ان سے بھرپور استفادہ کرتا ہے۔

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

....

پھر نوجوانوں کوان کا روحانی مقام بتاتے ہیں، کہ اگر اس کا ادراک ہوجائے تو پھر ہر مسلمان اس قابل ہو کہ ستاروں پر کمند ڈال سکے۔

جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے

یہ کمال کا شعر ہے۔اس میں اقبالؒ حضور ﷺ کے واقعہ معراج کا حوالہ دے کر بندۂ مومن سے مخاطب ہیں۔فرماتے ہیں کہ اس فانی دنیا سے، سدرۃ المنتہیٰ کے پار کی، ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کیلئے، نبوت جس راز کو اپنے ساتھ لیکر گئی تھی، وہ تم ہو۔اپنی حقیقت اور مقام کو پہچانو۔ یہ شعر حضور ﷺ کی اس حدیث مبارکہ کی بھی تشریح ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ نماز مومن کی معراج ہے۔ اقبالؒ

فرما رہے ہیں کہ سفرِ معراج کے بعد حضور ﷺ نے یہ مقام اپنی پوری امت کو تحفے کے طور پر عطا کر دیا ہے۔ اب یہ تمہاری ہمت ہے کہ اس مقام کو حاصل کرتے ہو یا نہیں۔

فکرِ اقبالؒ کے حوالے سے اس بات کو بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اقبالؒ حق الیقین کے درجے پر فائز ہو کر، خود مشاہدہ کر کے، یہ خوشخبریاں دے رہے ہیں۔ بہت سارے راز ایسے ہیں کہ جو انہوں نے بیان کر دیئے ہیں، مگر بہت سارے ایسے بھی ہیں کہ جن کو بیان کرنے سے وہ خود بھی ہچکچا گئے، کہ شاید ان کی قوم ان باتوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ جو کچھ اقبالؒ جانتے ہیں، اگر وہ راز کھول دیتے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، کہ دنیا میں ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ اقبالؒ اس حقیقت کا اعتراف خود کرتے ہیں:

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

یہی اقبالؒ کا وہ حیرت انگیز پہلو ہے کہ جو انکو ایک ناقابلِ بیان مردِ پر اسرار بناتا ہے۔

۱۶

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اب تک ہم نے کلام اقبالؒ پر ایک طویل بحث کی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے تمام تر فلسفے کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے، ہماری خواہش یہی تھی کہ اقبالؒ نے جو آنے والے وقت کیلئے، خوشخبریاں دی ہیں، ہم ان بشارتوں پر اسکا اختتام کریں۔

اقبالؒ کی نظم ''طلوع اسلام'' اس حوالے سے ایک غیر معمولی نظم ہے۔ اس میں نہ صرف بشارتیں ہیں، بلکہ نصیحتیں اور تنبیہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آنے والے دور کی اتنی خوبصورت تصویر کھینچی گئی ہے، کہ انسان آبدیدہ و مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے، کہ اب نشاۃ ثانیہ کا، اسلام کے دوبارہ عروج کا جو دور شروع ہونے والا ہے، اللہ کے فضل سے اسکا آغاز، اسی پاک سرزمین، اسی پاکستان سے ہوگا۔ پاکستان کو ایک عشق نے، ایک جنون نے بنایا تھا۔ کوئی تو وجہ تھی کہ مسلمانوں نے دیوانہ وار، پروانوں کی طرح، اپنی جانیں قربان کیں، کوئی تو وجہ تھی کہ اللہ نے اقبالؒ کو ہمارے پاس بھیجا، کوئی تو وجہ تھی کہ:

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ان رازوں کو سمجھنا ہوگا، کچھ ہونے والا ہے، کچھ بہت بڑا ہونے والا ہے! ایک نئی تاریخ، نئی تہذیب جنم لے چکی ہے! لے نہیں رہی، لے

چکی ہے! اب صرف ان رازوں کا کھلنا باقی رہ گیا ہے۔ پاکستان بھی اللہ کے رازوں میں سے ایک بہت بڑا راز ہے۔ اللہ نے اسے چھپا رکھا تھا، مگر اقبالؒ نے اس کا راز فاش کیا۔ ابھی بھی اس پاکستان کے بہت سے پہلو راز میں ہیں، اور بابا اقبالؒ نے وہ راز بھی اپنے کلام میں کھولے ہیں۔ ان میں بصیرت رکھنے والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں۔

اقبالؒ ایک بشارت، خوشخبری اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے طور پر سامنے آئے، اور آنے والے دور میں بھی اقبالؒ کا ایک شجر سایہ دار کی طرح اس ملت پر چھاؤں کرتے رہیں گے۔ اقبالؒ نے جس طرح نوجوانوں کو آنے والے دور کے متعلق خوشخبریاں دیں، نصیحتیں کیں، وہ اس قابل ہیں کہ انہیں بار بار دہرایا جائے۔ ہم انہی امور کے متعلق، کہ جن کی آنے والے دور میں، ہماری نوجوان نسل، ہماری قوم کو ضرورت پڑے گی، بات کریں گے۔ اس کیلئے ہم انکی خوبصورت نظم ''طلوع اسلام'' کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اب پوری دنیا میں جس طرح کے حالات ہیں، قدرتی بات ہے کہ لوگ مایوس ہوتے ہیں۔ شک پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان رہے گا یا نہیں، دہلی فتح کریں گے یا نہیں، ایک ہوں گے مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے یا نہیں، خلافت دوبارہ قائم ہوگی یا نہیں۔ اس بے یقینی، شک اور وسوسوں کے دور میں اقبالؒ فرماتے ہیں کہ ایک مردمومن کا یقین، گھپ اندھیری رات میں پورے قافلے کیلئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک فرد اپنے یقین کی طاقت سے، پوری مایوس قوم کو اٹھا کر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں تبدیل کرسکتا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اللہ اپنا کام ایسے ہی کسی مرد مجاہد سے لے گا کہ جس کا اپنے مقصد پر یقین چٹان کی طرح مضبوط ہو۔

گمان آباد ہستی میں یقین مرد مسلماں کا
بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

اپنے دور میں ''قندیل رہبانی'' خود اقبالؒ تھے۔ اس پورے تاریک بیابان میں، جو روشنی کی ایک چمک، کرن بلکہ بجلی کی کڑک تھی، وہ اقبالؒ ہی تھے۔ نوجوانوں کو مخاطب کر کے اقبالؒ کہتے ہیں، کہ تم میں سے ہر شخص یہ یقین پیدا کرلے، کہ چاہے پوری دنیا کہتی رہے کہ یہ پاکستان ٹوٹے گا، تم کہو کہ نہیں ٹوٹے گا! اور پھر اللہ کی قسم، یہ نہیں ٹوٹے گا! کیونکہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں، کہ جب وہ اللہ تعالیٰ پر کسی بات کی قسم کھا لیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ انکی قسم کو توڑ دے۔ تو اپنے رب کے ساتھ ایسا یقین پیدا کرو، اتنا مضبوط تعلق قائم کرو، کہ تم کو اس پر مان ہو کہ تمہارے منہ سے جو بات بھی نکلے گی، تمہارا رب اسکی لاج رکھے گا۔

جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

جب اس مٹی کے پتلے میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے، کہ میرا رب مجھے کبھی رسوا نہیں کرے گا، جب یہ یقیں پیدا ہوتا ہے، کہ میں سیف اللہ ہوں، تو پھر وہ ساٹھ مجاہدین کے ساتھ بھی، ساٹھ ہزار کے لشکر سے جا ٹکراتا ہے۔ جب اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ نے مجھے

بشارت دی ہے کہ قسطنطنیہ میرا ہے، تو پھر وہ خشکی پر بھی بحری جہاز گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے اور قسطنطنیہ فتح کر لیتا ہے۔ جب اسکو حضور ﷺ کی طرف سے یہ بشارت ہوتی ہے کہ اندلس تمہارا ہے، تو پھر وہ بارہ ہزار کے لشکر کے ساتھ جاتا ہے، کشتیوں کو جلا دیتا ہے، اور پھر ایک دوسرے براعظم کا ایک ملک فتح کر لیتا ہے۔ جب اس انگارہء خاکی میں یہ یقین پیدا ہو جائے گا، کہ غزوۂ ہند کی بشارت اسکے نصیب میں ہے، تو پھر بھارت بھی فتح ہو کر رہے گا اور ''ریڈیو پاکستان دہلی'' کی آواز بھی آ کر رہے گی۔ ایک مردِ مومن کیلئے، کہ جو اس درجے کا یقین رکھتا ہو، کائنات کی کوئی شے، کوئی مہم، ناممکن نہیں رہتی۔

تو شرط یہ ہے کہ پہلے یقین پیدا کرو، تو پھر تمہارے وجود میں وہ قوتیں پیدا ہو جائیں گی کہ جو جبرئیل امینؑ کی ہیں، روح الامینؑ کی ہیں، ملائکہ کا نزول بھی ہوگا، اور ایک عام بندہ، بندۂ پراسرار کا مقام پالے گا۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتہ ایماں کی تفسیریں

....

مگر اقبالؒ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس ابراہیمیؑ کردار کا یقین پیدا کرنا آسان نہیں، کہ شیطان کی چالیں سخت ہیں، دنیا کی ہوس شدید ہے، اور انسان وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ شیطان تمہارے دلوں میں وسوسے ڈالے گا، تمہیں شک میں ڈالے گا، تا کہ تمہیں بزدل اور بے غیرت بنا سکے، تمہیں رزق حلال سے دور رکھ سکے، تمہیں جان و مال و اولاد کے فتنوں میں ڈالے۔ اس شک میں ڈالے گا کہ ہم امریکہ سے کیسے لڑ سکتے ہیں، اس شک میں ڈالے گا کہ ہم سود اور رباء کے بغیر اپنی معیشت کیسے چلا سکتے ہیں، اس شک میں ڈالے گا کہ آج شریعت کا نظام کیسے نافذ ہوگا، اس شک میں ڈالے گا کہ آج خلافت کا قیام کیسے ممکن ہوگا۔ جو اس شک میں پڑ گیا، اپنے یقین سے محروم ہو گیا، وہ ہلاک ہو گیا۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

....

ہمارا نرم رو قاصد پیام زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

یہاں اقبالؒ اپنا تعارف خود کرا رہے ہیں، ایک نرم رو قاصد کہ جو امت کیلئے ایک نئی زندگی کا الہامی پیغام لایا، وہ راز کہ جن سے جدید دور کی تہذیب، اپنے تمام تر علوم فنون و صنعتی کمالات کے باوجود، غافل ہے۔

آج پورے پاکستان میں مایوسی پھیلی ہوئی ہے۔ ہر طرف لوگوں کو فتنہ وفساد نظر آتا ہے، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ اس قوم کے حکمران ہوش میں آئیں۔ اللہ نے اس پاکستان کی جو تقدیر لکھ دی ہے، وہ اتنی شاندار ہے کہ اس کی راہ میں جو رکاوٹ ڈالے گا، روند دیا جائے گا۔ اب وقت ہے کہ ہم نے اللہ سے جو وعدے کیے تھے، ان کو پورا کریں۔ ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے ہمیں ایک خطہء زمین دیا تو ہم یہاں پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے طرز پر نظام قائم کریں گے، اسکو امت مسلمہ کا مرکز بنائیں گے، امت رسول ﷺ کی عزت و آبرو کے محافظ بنیں گے۔

مگر اس کے برعکس، آج ہمارے حکمران، دانشور، ذرائع ابلاغ اور سیاستدان، غفلت کا جو راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ تباہی کا وہی راستہ ہے، کہ جس پر چل کر ہم سے پہلے کی قومیں تباہ ہوئیں۔ یاد رکھیے گا کہ فطرت کی تعزیریں بہت سخت ہوتی ہیں۔ قوموں کی اجتماعی غلطیوں کی سزا شدید ہوتی ہے، اور سزا نسلوں میں کاٹنی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدے کو اگر پورا نہیں کریں گے، جو تقدیر لکھ دی گئی ہے، اس کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے، تو خود ہلاک ہونگے۔ جس کسی نے بھی پاکستان کو نقصان پہنچایا، چاہے وہ اندرا گاندھی ہو یا شیخ مجیب، داخلی دشمن ہوں یا خارجی، سیاستدان ہوں یا دانشور، صحافی ہو یا جج، اسکا دنیا اور آخرت میں بدترین انجام مقدر ہے۔ آج ہر وہ فرد کہ جو پاکستان کے خلاف جنگ کر رہا ہے، وہ درحقیقت اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے خلاف جنگ کر رہا ہے۔ آج پاکستان دنیا میں ایمان کی دلیل، حجت اور فرقان ہے۔

اس پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک راز کے طور پر رکھا ہے اور امت کے عروج کا مرکز، زینہ اور ذریعہ بنایا ہے۔ پاکستانی قوم کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جو خراب حالات آپکو نظر آ رہے ہیں، جو فتنہ و فساد پھیل رہا ہے، یہ سب گواہی ہے، ان لوگوں کے خلاف کہ جن کے ہاتھ میں آج پاکستان کا اختیار ہے۔ یہ ان کے خلاف ایک قطعی حجت پوری کی جا رہی ہے۔ آنے والے دور میں، اسی پاک سرزمین میں، ایک اسلامی فلاحی ریاست کا وجود عمل میں لایا جائے گا۔ وہ تمام لوگ کہ جو آج اس پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، کل ان کی جڑیں کاٹی جائیں گی، ان شاء اللہ۔

علامہ اقبالؒ کا کلام آنے والے دور میں، ہمارے جلال و جمال کی ایک تصویر ہے۔ اب پاکستانی قوم، اس کے نوجوانوں اور ملت پر فرض ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔ یہ صدیوں اور نسلوں کا بوجھ ہے، کہ جواب اس نسل کو اپنے کندھوں پر اٹھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جو عزت لکھی ہے، وہ اتنی شاندار ہے کہ اقبالؒ نے بھی صرف اسکی ایک دھندلی سی تصویر ہی دکھائی ہے، کہ لیا جائیگا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

ان شاء اللہ، جلد ہی، پاکستان کی ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے ہونے جا رہے ہیں۔ پاک فوج، غزوہ ہند میں شریک ہو کر ہندوستان پر قبضہ کرے گی۔ پاکستان امت مسلمہ کا مرکز بنے گا۔ یہاں ایک ہوں گے مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے۔

اپنے آپکواس تقدیر کا حصہ بنالیجیئے۔ اللہ ان تمام لوگوں کا حامی و ناصر ہو، کہ جو اس پاکستان، اسکی عزت و آبرو اور سرحدوں کی حفاظت کیلئے اپنے آپکو قربان کر رہے ہیں۔ اور اللہ ان دشمنوں کا بیڑہ غرق کرے، تباہ و برباد کرے، کہ جو اس پاکستان کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں، اس کو توڑنے کی کوشش کرر رہے ہیں یا اس ملت کو، قومیت، لسانیت، عصبیت اور صوبائیت میں تقسیم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا و آخرت میں ذلیل و رسوا ہوں گے۔

ہمارا پیغام پاکستانی ملت اور امت مسلمہ کیلئے جلال و جمال کا پیغام ہے۔ ہم جاتے جاتے اس قوم کو خوشخبری دیتے ہیں، کہ فکر نہ کریں، ایک شاندار سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ، اب دنیا بھی دیکھ لے گی۔ اللہ اس پاکستان کی حفاظت کرے۔ اس میں رہنے والوں کی حفاظت کرے اور اقبالؒ کا جو خواب اس امت کیلئے تھا، اسکی تکمیل ہماری زندگیوں میں، ہمارے ہی ہاتھوں ممکن ہو، آمین۔

یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہوگی کہ ہم اس عروج کا حصہ بن جائیں۔ ورنہ اللہ پھر ایسے لوگوں سے کام لے گا کہ جو اللہ سے پیار کرتے ہوں گے، اور اللہ ان سے پیار کرے گا، جو اللہ سے راضی ہونگے اور اللہ ان سے راضی ہوگا۔ اگر یہ سعادت ہمارے نصیب میں آئے، تو ہم خوش نصیب ہونگے۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں ان خوش نصیبوں میں شامل فرمائے، آمین۔

عشق کو فریاد لازم تھی، سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

....

لبیک یا رسول اللہ ﷺ!

لبیک غزوۂ ہند!

نایاب تصاویر، نقشوں، تاریخ کے نوادرات اور اقبالؒ کی زندگی کے چھپے گوشوں سے مزین، اقبالؒ کے کلام اور ان کے کام پر ہمارے تجزیے پر مشتمل ٹی وی سلسلے ''اقبال پر اسرار'' کی کتابی شکل پیش خدمت ہے۔

یہ کتاب ایک ایسے پراسرار وجود کے بارے میں ہے کہ جو ''صاحب زماں'' تھا، ''صاحب استقبال'' تھا، اور ''جو اپنے دور کے خلاف نبرد آزما تھا۔'' کہ جس کی مٹھی میں امت کی آنے والی نسلیں تھیں۔ کہ جس کے آنے کے بعد تین سو سال سے ہند کے بند میخانوں میں پھر سے فیض عام ہوا۔ یہ کتاب اسی فیض کا ایک نتیجہ ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اقبالؒ کی یہ پیش گوئی پوری ہوتی نظر آتی ہے کہ

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

یہ کتاب اقبالؒ کی اس دعا کی تاثیر کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے:

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہوچکی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

یہ کتاب اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ آج بھی اگر امت مسلمہ کی نئی نسل کو کوئی راہنمائی فراہم کرسکتا ہے تو وہ یہ مرد درویش ''اقبال'' ہے۔

یہ کتاب اقبالؒ کے فکری معجزے اور ان کی زندگی پر ہونیوالے کام کے وسیع ذخیرے میں، اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے۔ ہم اللہ کے فضل سے یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ فکر اقبالؒ پر ہونیوالے کام میں اس نوعیت کا کام کبھی نہیں ہوا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری میں جوش جنوں کی وہ آگ نہ بھڑک اٹھے کہ جو اقبالؒ اس قوم میں لگانا چاہتے تھے۔

یہ کتاب ایک مسلمان کو اپنے حقیقی مقام سے یوں آشنا کرتی ہے کہ وہ اپنی خودی کے امکانات کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھتا ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں سیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ہم امید کرتے ہیں کہ یہ کتاب ہمارے بچوں اور آنے والی نسلوں کیلئے ایک نادر اور قیمتی تحفہ ثابت ہوگی۔ ان شاءاللہ۔
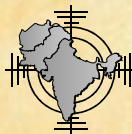
House # 683-A, Street # 4
Chaklala Scheme 3, Rawalpindi, Pakistan.
Land line: +92-51-5598046 -7
Website: www.zaidhamid.pk
E-mail: syedzaidzamanhamid@gmail.com

Rs: 1,000/-